بیاد حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد اول۔ [illegible]

۱۹۴۳ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام [illegible]
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم [illegible]

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول [illegible] تاریخ ملت
حصہ سوم۔ خلافت بنی امیہ۔

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کامل
۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم
جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو
۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں
صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔
حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت جلد چہارم خلافت ہسپانیہ۔ تاریخ ملت حصہ پنجم۔
خلافت عباسیہ اول

۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم، خلافت عباسیہ، دوم و بطنائد

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ، تدوین قرآن، اسلام کا نظام مساجد۔
اشاعت اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم۔ خلافت عثمانیہ۔
جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات
جلد اول (جس کو از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔
۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ ملت جلد نہم تاریخ صقلیہ

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام۔ تاریخ ادبیات ایران۔ تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم۔
سلاطین ہند اول۔ تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی۔

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد سوم۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات۔

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم۔ صدیق اکبرؓ۔ تاریخ ملت حصہ یازدہم۔ سلاطین ہند دوم۔
انقلاب روس۔ اور روس انقلاب کے بعد۔

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ تاریخ گجرات۔ جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔
مصائب سرور کونین ﷺ

سرپرست

حکیم عبدالحمید

مجلسِ ادارت

بُرہان

جلد ۱۰۹ | جنوری و فروری ۱۹۹۲ء مطابق رجب و شعبان ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۱ و ۲

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

سوویت یونین ٹوٹ گیا

افراد انسانی کی زندگی حباب کی مانند ہے۔ یہی حال قوموں کی زندگی کا بھی ہے۔ تاریخ انسانی میں کیسے کیسے طاقتور حکمراں ابھرے لیکن کچھ ہی مدت کے بعد ان کا کوئی نام لیوا بھی نہ رہا۔ کتنی ہی عظیم الشان سلطنتیں وجود میں آئیں لیکن آج انکی جگہ کھنڈرات کھڑے ہیں۔ اور ان کے ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار (ترجمہ) پس اے اہل نظر عبرت پکڑو۔

سوویت یونین کی داستان عبرت انگیز بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں وجود میں آنے کے بعد سے دسمبر ۱۹۹۱ء تک کمیونزم اپنے دعووں کے ساتھ سوویت یونین کا طرز زندگی بنا رہا۔ اقتصادیات اور انسانی فلاح و بہبود میں کمیونزم کے بلند بانگ دعووں نے وہ سماں باندھا کہ الاماں والحفیظ۔ بس اسی کو انسانوں کی فلاح و بہبود کا آخری نظام سمجھ لیا گیا۔ سوویت یونین میں ایک کے بعد ایک ڈکٹیٹر آتے رہے۔ وہاں کے اندرونی احوال کو چھپاتے رہے ان پر آہنی پردہ ڈالتے رہے۔ ستر برس تک ایک جھوٹ کو نبھاتے رہے۔ لیکن وقت آگیا۔ اس جھوٹ کا تانا بانا تار تار ہوگیا۔ اور حقیقت سامنے آگئی۔ خدا کو منظور تھا کہ یہ کام مسٹر گورباچیف کے ہاتھوں مکمل ہو۔ پہلے اگست ۱۹۹۱ء میں گورباچیف کے خلاف بغاوت ہوئی یہ بغاوت ناکام ہوئی۔ اس کے بعد روسی فیڈریشن کے صدر اور ان کے دوست یلسن ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے سوویت بساط سیاست پر چھا گئے۔ گورباچیف چاہتے تھے کہ ذرا سی تبدیلی کے ساتھ سوویت یونین جو کہ سولہ جمہوریتوں کی ایک فیڈریشن تھی۔ برقرار رہے۔ لیکن وقت آچکا تھا یہ فیڈریشن

...ایسے شخص تھے جو زیادہ عمل اور حقیقت پسند کہے تھے۔ انہوں نے پہلے ... سال
... کا نقشہ پیش کیا۔ منسک میں تمام جمہوریتوں کی کانفرنس بلائی گئی۔ وہاں چار جمہوریتوں کو
... سوویت جمہوریتوں نے کامن ویلتھ پر اتفاق کیا۔ یہ کامن ویلتھ آزاد ملکوں کی ایک تنظیم ہوگی
... آگیا۔ جب گھر کرسمس میں مصروف گورباچوف باقاعدہ صدارت سے مستعفی ہوگئے۔
سوویت سلطنت کے آٹھویں اور آخری لیڈر تھے۔ ٹی وی پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا وہ کمیونسٹ
... کے جواب ٹوٹ چکے ہیں۔ لہٰذا صدارت سے مستعفی ہو رہے ہیں۔ آج سے پانچ برس قبل اگر
... شخص یہ کہہ دیتا کہ سوویت یونین ٹوٹ جائے گا۔ اور اس کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا تو کہنے والے
... کو پاگل اور دیوانہ سمجھتے۔ تاریخ کا ایک عمل ہے۔ جو پورا ہو رہا ہے سوویت یونین کافی مدت سے
... رہے تھے ابھی اس زوال کے تمام اسباب کھل کر سامنے نہیں آئے۔ لیکن اصل میں افغانستان سوویت
... کو لے ڈوبا۔ نہ سوویت افواج افغانستان میں داخل ہوتیں، اور نہ یہ جنگ یا کشمکش بارہ برس تک
... تقریباً بیس ہزار سوویت فوجی افغانستان میں ہلاک ہوئے۔ سوویت لیڈر شپ نے ناکام ہو کر
فوج واپس بلالی۔ لیکن افغانستان میں طویل مدت تک رہنے کے بعد اس فوج کے خیالات بھی تبدیل
... لگے تھے۔ آزادی اور جمہوریت کا مطلب ان فوجیوں نے پہلی بار افغانستان میں سمجھا۔

اب جبکہ سوویت یونین میں شامل ریاستیں الگ ہوگئی ہیں۔ وسط ایشیا میں چھ جمہوریتیں ایسی
ہیں جو مسلم اکثریت کی ہیں۔ ان میں جمہوریہ ازبکستان سب سے بڑی ہے۔ جس کا دارالسلطنت تاشقند
اس کی آبادی دو کروڑ ہے۔ یہ سب جمہوریتیں اب آزاد ملک کی حیثیت سے عمل کریں گی۔ اور
... سفارت خانے ہر ملک میں کھولے جائیں گے۔

... پنگ کا دورہ

چینی وزیراعظم مسٹر لی پنگ کا دورہ اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ تیس سال بعد کوئی چینی لیڈر
... ستان آیا ۱۹۶۲ء کی جنگ کے بعد سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی چلی آ رہی
... جاتا ہے کہ اس کشیدگی کو دور کرنے کی کوششیں وقتاً فوقتاً جاری رہیں۔ ایک سال قبل ان
... میں اس وقت تیزی پیدا ہوئی۔ جب آنجہانی وزیراعظم راجیو گاندھی چین کے دورہ پر گئے تھے۔

اور وہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ مسٹر لی پنگ نے اپنے دورۂ ہند کے دوران میں کہا تھا کہ متنازعہ کو بالائے طاق رکھ کر باہمی تعلقات کو دوستانہ بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسی اسپرٹ کے تحت دونوں ملکوں میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں تعاون اور تبادلہ کے کئی معاہدے طے پائے۔ تبت کے متعلق انہوں نے کہا یہ چین کا اٹوٹ حصہ ہے۔ ہندوستان نے اس موقعہ پر اپنے اس موقف کا اعادہ کیا کہ تبت پر اگرچہ چین کا غلبہ ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ ایک نیم خود مختار خطہ رہا ہے۔ اس موقعہ پر چین کے رویہ میں ایک خاص تبدیلی یہ دیکھنے میں آئی کہ اس نے پہلی بار تبتی لیڈر دلائی لامہ کو بات چیت کی پیش کش کی۔ یہ ایک خوش آئند علامت ہے۔ شاید سوویت یونین میں ہونے والی تبدیلیاں چین کے رویہ میں تبدیلی کا باعث بنی ہوں۔ عالمی صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔ کوئی وقت جارہا ہے جب سوویت یونین کی آزادی کی لہر چین میں پہونچے گی۔ یہ مرحلہ چین کے لئے آزمائش کا مرحلہ ہوگا دیکھئے ایشیا کے اس خطہ میں کیا کچھ سیاسی تبدیلیاں ہوں گی۔ سوویت یونین ختم ہو چکا اب دنیا میں صرف ایک ہی بڑی طاقت ہے جس کا نام امریکہ ہے۔ لیکن ایشیا کے اس خطہ میں ایک اور طاقت بھی ابھر رہی ہے اس کا نام جاپان ہے۔ جاپان کی بڑھتی ہوئی صنعتی طاقت سے امریکہ بھی پریشان ہے۔ جب سیاسی مبصر جاپان کو دیکھتے ہیں تو چین کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اس خطہ میں چین بھی ایک بڑی طاقت ہے اسے نہ بھولنا چاہیئے۔

چین سائنسی علوم و فنون میں کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے پیچھے نہیں ہے۔ یہ ابھی تک دنیا کی نمبر ایک طاقت بن جاتا۔ لیکن اس کی کثیر آبادی نے اسے ایک طاقتور ترین ملک بننے سے روک دیا۔ چین میں بھی ہندوستان کی طرح آبادی کی شرح میں کمی لانے کی تدبیریں ابھی تک ناکام ہیں۔

مسلمانوں میں جمود

زمانہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ لیکن مسلمانوں پر جمود طاری ہے سیاست ہو، یا تجارت، صنعت ہو یا تعلیم، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے۔ جس میں جمود طاری نہ ہو۔ ان کے اندر اس وقت کوئی ایسی قیادت موجود نہیں ہے جو موجودہ جمود و پسماندگی کا احساس انہیں دلا سکے۔ بے حسی کا یہ عالم ہے کہ مرض تک پتہ نہیں۔ علاج کیا خاک ہوگا۔ اس وقت مسلم قیادت جن ہاتھوں میں ہے کیا دیانتداری کے

معلوم ہوتا ہے کہ اس قیادت کو دورِ حاضر کے مسائل بالخاص طور پر ملّی مسائل کا علم ہے۔
دوسرے مسلمانوں میں ایک تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ لیکن اس طبقہ کا حال یہ ہے کہ اس کو صرف اپنے مفادات سے، زندگی کی عشرتوں اور آسائشوں سے دلچسپی ہے۔ اس طبقہ کا شاید ہی کوئی فرد ملّت کے تئیں اپنا فرض ادا کر رہا ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر تعلیمی اور تجارتی و صنعتی زندگی میں مسلمان زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ کتنے ہی تاجر ایسے ہیں جن کے پاس سرمایہ ہے لیکن وہ اپنے سرمایہ کو کاروبار میں نہیں لگا رہے ہیں۔ کتنے ہی گریجویٹ اور سائنسداں ایسے ہیں، جن کے دماغوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ پلان موجود ہیں لیکن وہ سرمایہ نہ ہونے کے باعث اپنے اس پلان کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے مسلم سرمایہ داروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کے ساتھ ان پلانوں کو عملی جامہ پہنانے میں مدد کریں۔ اس طرح امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ مسلمانوں کو کئی تجارتی اور صنعتی پلان دیئے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ملّی تحریک چلائی جائے۔ کیا مسلم دانشور ہماری اس تجویز پر غور کریں گے

اٹھو وگرنہ حشر نہ ہووے گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ماہنامہ برہان کا نومبر و دسمبر ۱۹۹۱ء میں جو مختصر نمبر شائع ہوا ہے اس میں یہ مضامین بھی شامل ہونے تھے کسی مجبوری کے تحت ایسا نہ ہو سکا لہٰذا اب شائع کئے جا رہے ہیں۔ معذرت کے ساتھ۔ منیجر

سیاسی، [illegible]

کی پہلو دا [illegible]

سے شروع [illegible] [illegible]

انتہائی صا [illegible] کے باوجود تہہ دا [illegible]

آسان نہیں ہے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں مفتی صاحبؒ کی شخصیت کے بارے میں [illegible]

اس میں شک نہیں کہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کے عقیدت مندوں میں ہوں۔ اور [illegible]

تھی کہ میں بھی اس قابل احترام شخصیت کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کروں۔ لیکن [illegible]

صلاحیتوں کے پیشِ نظر یہ کام کافی مشکل نظر آرہا ہے۔ ان کی عالمانہ شخصیت کے بارے میں میرا کچھ کہنا، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔

بہر حال مفتی صاحبؒ کو خراج عقیدت پیش کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں اور حق بھی، اسی لئے یہ جسارت کر رہی ہوں۔

مفتی صاحب ایک عظیم انسان تھے۔ انسانیت کی آبرو۔ جنہوں نے زندگی بھر انسانی قدروں کی پاس داری کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔

...صدی کے پر آشوب دور میں مفتی صاحبؒ جیسے لوگوں کے دم سے
...رنگی اور رہے گی۔ ایسے عظیم لوگوں کو پوری انسان برادری خراج

...بڑے انسان تھے، اتنے ہی بڑے مدبر، مفکر، عالم دین، سیاسی
...مذہبی ہوں، سماجی ہوں یا سیاسی، مفتی صاحبؒ کی رائے معتبر
...کے مخالفین بھی ان کی رائے اور ان فیصلوں کا احترام کرتے تھے۔
...نیک نیتی، خلوص اور دیانتداری تھی۔ وہ سیاست میں رہ کر بھی سیاست
...سے بہت دور رہے۔

...ایک بار مل کر بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے اور جن سے
...مفتی صاحب کی تھی۔ ان سے ملاقات
...ہوتے۔ ہر بار ان سے مل کر میں نے ایک نئی خوشی

...بہت چھوٹی تھی، مراد آباد میں مولانا حکیم انصار احمد
...ہستیوں میں سے تھے۔ وہ بڑے عالم، عامل اور
...مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن،
...شاستری، اور دیگر حضرات کے جنگ آزادی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اور یہ
...حضرات اکثر چچا میاں، یعنی مولانا حکیم انصار احمد صاحب کے گھر تشریف لاتے تھے۔ اور
سیاست پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ اگرچہ ہم بچوں کو مردانے میں جانے کا موقع کم
ہی ملتا تھا۔ لیکن کبھی پان وغیرہ ہمارے ہاتھ بھجوا دیا جاتا تھا، یا کبھی والد صاحب کے ساتھ
چلے جاتے تھے۔ ان کی باتیں سمجھ میں تو نہیں آتی تھیں، لیکن چونکہ یہ سب حضرات ہمیں پیار کرتے تھے
اس لئے وہاں جانا اچھا لگتا تھا۔

انسانیت کے سفیر

شمیم جہاں صاحبہ

ہندوستان میں کم لوگ ایسے ہوں گے جو مفتی صاحب قبلہ کی قد آور شخصیت اور ان کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی ادبی اور مذہبی سرگرمیوں اور کارناموں سے واقف نہ ہوں۔ ان کی پہلو دار شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان پر کچھ لکھنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ اور ان کی شخصیت کے کس پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ اس لئے کہ ان کی شخصیت انتہائی صاف ستھری اور سادہ ہونے کے باوجود تہہ دار تھی۔ ایسی شخصیت پر قلم اٹھانا بظاہر آسان نہیں ہے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں مفتی صاحبؒ کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کروں۔ اس میں شک نہیں کہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کے عقیدت مندوں میں ہوں۔ اور یہ میری دلی خواہش تھی کہ میں بھی اس قابل احترام شخصیت کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کروں۔ لیکن مجھے اپنی محدود صلاحیتوں کے پیشِ نظر یہ کام کافی مشکل نظر آرہا ہے۔ ان کی عالمانہ شخصیت کے بارے میں میرا کچھ کہنا، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔

بہرحال مفتی صاحبؒ کو خراج عقیدت پیش کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں اور حق بھی، اسی لئے یہ جسارت کر رہی ہوں۔

مفتی صاحب ایک عظیم انسان تھے۔ انسانیت کی آبرو جنھوں نے زندگی بھر انسانی قدروں کی پاس داری کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔

اور شاید بیسویں صدی کے پُر آشوب دور میں مفتی صاحبؒ جیسے لوگوں کے دم سے ہی انسانیت زندہ و درخشاں اور رہے گی۔ ایسے عظیم لوگوں کو پوری انسانی برادری خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔

مفتی صاحبؒ جتنے بڑے انسان تھے، اتنے ہی بڑے مدبر، مفکر، عالمِ دین، سیاسی اور مذہبی رہنما بھی۔ معاملات مذہبی ہوں، سماجی ہوں یا سیاسی، مفتی صاحبؒ کی رائے معتبر اور صائب سمجھی جاتی تھی۔ ان کے مخالفین بھی ان کی رائے اور ان فیصلوں کا احترام کرتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی نیک نیتی، خلوص اور دیانت داری تھی۔ وہ سیاست میں رہ کر بھی سیاست کی مکروہ چالوں اور ہتھکنڈوں سے بہت دور رہے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے ایک بار مل کر بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے اور جن سے بات کرکے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ ایسی ہی شخصیت جناب مفتی صاحب کی تھی۔ ان سے ملاقات کے خوشگوار لمحے میری زندگی میں بھی بار ہا آئے۔ ہر بار ان سے مل کر میں نے ایک نئی خوشی محسوس کی۔

غالباً سنہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے جب میں بہت چھوٹی تھی، مراد آباد میں مولانا حکیم انصار احمد (جو وہ میرے چچا ہوتے تھے) مراد آباد کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ وہ بڑے عالم، عامل اور عابد انسان تھے۔ چچا میاں۔ مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن، لال بہادر شاستری، اور دیگر حضرات کے جنگ آزادی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اور یہ بزرگ حضرات اکثر (چچا میاں) یعنی مولانا حکیم انصار احمد صاحب کے گھر تشریف لاتے تھے۔ اور سیاست پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ اگرچہ ہم بچوں کو مردانے میں جانے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ لیکن کبھی پان وغیرہ ہمارے ہاتھ بھجوا دیا جاتا تھا، یا کبھی والد صاحب کے ساتھ چلے جاتے تھے۔ ان کی باتیں سمجھ میں تو نہیں آتی تھیں، لیکن چونکہ یہ سب حضرات ہمیں پیار کرتے تھے اس لئے وہاں جانا اچھا لگتا تھا۔

[illegible] پہلی بار میں نے مفتی صاحب کو دیکھا۔ چچا میاں ان کو "قبلہ مفتی صاحب" کہہ کر [illegible] کرتے تھے۔ اگرچہ اس وقت مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ یہ کون حضرات ہیں۔ لیکن ایک بڑا سا نقش ان [illegible] کا ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ اس کے بعد کئی بار ممانی جان اور والدہ صاحبہ مرحومہ کے ساتھ مفتی صاحب کے دولت خانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں جب ہم بلی ماران سے علاقہ جامع مسجد منتقل ہوئے تو حسن اتفاق سے مکان کمرہ نظام الملک میں ہی ملا۔ اب گھریلو تعلقات مزید بڑھ گئے۔ اکثر مفتی صاحب کی بہو اور ان کی صاحبزادی ہمارے گھر تشریف لاتیں اور ہم لوگ بھی جاتے رہتے تھے۔

اگرچہ خواہش کے باوجود مجھے قبلہ مفتی صاحب سے بے تکلف گفتگو کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ تاہم مفتی صاحب کی مشفق شخصیت اور ان کا نام نامی میرے ذہن کے کسی گوشے میں بچپن سے محفوظ تھا۔ اور ان کے نام سے ایک تعلق سا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ عصر یا مغرب کی نماز کو جاتے ہوئے، مفتی صاحب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں انھیں دیکھتی تو سر جھکا کر ادب سے سلام کرتے ہوئے چلی جاتی اور وہ مسکرا کر سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے۔ میرا دل ہمیشہ چاہتا تھا کہ میں ان سے باتیں کروں کیونکہ ان کی مشفق سی شخصیت میں مجھے اپنے والد صاحب کی شبیہ نظر آتی تھی۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) ایک ایسا تاریخی اور باوقار ادارہ ہے جس سے ممتاز ادیب و شاعر اور دانشور منسلک رہے ہیں۔ مفتی صاحب قبلہ بھی انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مجلس عام کے رکن تھے۔ اور یہ میں اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں کہ کسی نہ کسی طور میں اس ادارے سے وابستہ ہوں۔ جہاں آج بھی بڑے بڑے علماء و دانشور تشریف لاتے ہیں اور ہم ان کی صحبتوں سے فیض اُٹھاتے ہیں۔ مفتی صاحب بھی انجمن کے جلسوں میں تشریف لاتے تھے۔ مختصر ہی سہی لیکن وہاں ان سے گفتگو کا موقع ملا، مفتی صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ہم اتنے بڑے عالم سے مخاطب ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے مخاطب کی سطح پر آ کر گفتگو کرتے، لہجے

[illegible] آخر میں دعقت لغرانے والی مفتی صاحب کی شخصیت بھی [illegible]

[illegible] تھا۔

مفتی صاحب ۱۹۱۶ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے علم و دانش کے اعتبار سے جس کی حیثیت ایک روشن مینار کی تھی۔ جس کے دامن سے بہت سے ستارے روشن تھے۔ جنہوں نے اپنے علم و دانش کی روشنی سے بہت سے تاریک ذہنوں کو روشن کیا تھا۔ اس خاندان کے بزرگ حضرات نے نہ صرف دین کی اہم خدمات انجام دیں بلکہ اپنی علمی، ادبی، سماجی، اور سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ سے قوم و ملت کو نفع پہنچایا۔

حضرت مفتی صاحب کے والد محترم جید عالم دین اور دیوبند کے مفتی اعظم تھے۔ آپ کے چچا مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی عربی کے ممتاز ادیب، شاعر اور مورخ تھے۔ دوسرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبند کے صدر مہتمم شیخ الحدیث عالمی شہرت کے مالک تھے۔ انہیں بزرگوں کے زیر سایہ مفتی صاحب کی پرورش ہوئی۔ مفتی صاحب درحقیقت اپنے اسلاف کی روایات کے امین تھے۔ ذہانت، ذکاوت، پرہیزگاری، سادگی، انکساری اور حسنِ اخلاق، یہ تمام خصوصیات ان کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھیں۔

مفتی صاحب کی تعلیم کا سلسلہ دیوبند میں شروع ہوا اور انھوں نے اپنی تعلیم وہیں مکمل کی۔

سنہ ۱۹۳۰ء سے مفتی صاحب باقاعدہ سیاست کے میدان میں آگئے۔ میرے خیال میں مفتی صاحب کے سیاست میں آنے کی بڑی وجہ اس وقت کے حالات تھے۔ وہ زمانہ زبردست سیاسی بحران کا زمانہ تھا۔ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کی تحریک پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ملک کے بڑے بڑے علماء، اور سیاسی رہنما بڑھ چڑھ کر تحریک آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ اس لشکر میں مفتی صاحب کی حیثیت نقیب کی سی تھی۔ وہ مادر وطن کے ان سپوتوں میں سے تھے جن پر قوم ناز کرسکتی ہے۔ جنہوں نے ملک و قوم کو آزاد کرانے

کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ ایک بے باک، دلیر اور دور اندیش لیڈر تھے انھوں نے اپنے لیے کبھی کسی اعزاز یا عہدے کی تمنا نہیں کی۔ مفتی صاحب کے دل میں قوم و ملت اور ملتِ اسلامیہ کے لیے جو درد تھا اس کا اندازہ وہی لوگ بخوبی کر سکتے تھے جو ان کے قریب تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب نفرت کا ایک طوفان اٹھا اور جس کی براہ راست چوٹ ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑی۔ اس وقت مسلم علماء نے مسلم تنظیموں کو یکجا کیا اور بدحواس مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے مسلم مجلس مشاورت بنائی۔ مفتی صاحب اس میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی سے مفتی صاحب بے حد پریشان تھے۔ اس پر آشوب دور میں مفتی صاحب نے تن من دھن سے رات دن برادرانِ قوم کی خدمت کی۔ مفتی صاحب بنیادی طور پر کانگریسی تھے۔ لیکن انہوں نے مصلحت پسندی کو کبھی اپنا شعار نہیں بنایا جو غلط دیکھا محسوس کیا اس کو انتہائی دلیری سے حکومت وقت سے برملا کہا۔

۱۹۳۸ء میں مفتی صاحب نے ایک علمی ادارہ "ندوۃ المصنفین" کے نام سے قائم کیا۔ ندوۃ المصنفین کا قیام مفتی صاحب کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس ادارے سے مفتی صاحب کی سرپرستی میں بہت سی علمی، ادبی اور مذہبی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس ادارے کی حیثیت محض اشاعتی ادارے کی نہیں تھی۔ بلکہ یہ علم و دانش کا مرکز تھا۔ جس نے دین و ملت کی ایسی نمایاں خدمات انجام دیں جس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اس ادارے سے موصوف نے "بُرھان" کے نام سے ایک پرچہ بھی جاری کیا اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۳۸ء میں نکلا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ پرچہ نہ صرف باقاعدگی سے نکل رہا ہے بلکہ اس کا علمی اور ادبی معیار بھی قائم ہے۔ ندوۃ المصنفین کا ترجمان "بُرہان" ہمیشہ مفتی صاحب کو زندہ و جاوید رکھے گا۔ اس سلسلے میں مفتی صاحب کے صاحبزادے عمید الرحمٰن قابلِ ستائش ہیں جن کی انتھک محنت اور لگن سے "بُرھان" اپنی تمام تر خوبیوں اور حسن کے ساتھ زندہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مفتی صاحب کی یہ یادگار ہمیشہ قائم رہے۔ مفتی صاحب

[illegible] کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب اس کا دفتر قرول باغ میں تھا۔ [illegible] گیا، اس کا تمام اثاثہ تباہ ہو گیا، یہ مفتی صاحب کا ہی حوصلہ تھا کہ اس [illegible] دوبارہ زندہ کر دیا۔

مفتی صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ وہ ہندوستان کے بیشتر سماجی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی اداروں سے بیک وقت منسلک رہے لیکن جس ادارے سے بھی منسلک رہے ان کی بھرپور توجہ اس پر مرکوز رہی، اور کبھی ان کے چہرے پر تھکن، جھنجلاہٹ اور پریشانی کے آثار نظر نہیں آئے۔ وہ واقعی مرد آہن تھے۔ خدا نے مخصوص صلاحیتیں انھیں ودیعت کی تھیں۔ مفتی صاحب فرشتہ صورت ہی نہیں۔ فرشتہ سیرت بھی تھے۔ ایسی شخصیتیں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کی وفات سے ہندوستان کے مسلمان ایک مخلص اور حق گو سیاسی رہنما اور سچے عالم دین سے محروم ہو گئے۔

کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ ایک بے باک، دلیر اور دور اندیش شخص تھے انھوں نے اپنے لیے کبھی کسی اعزاز یا منصب کی تمنا نہیں کی۔ مفتی صاحب کے دل میں قوم و ملک اور ملت اسلامیہ کے لیے جو درد تھا اس کا اندازہ وہی لوگ بخوبی کر سکتے تھے جو ان کے قریب تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب نفرت کا ایک طوفان اٹھا اور جس کی براہ راست چوٹ ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑی۔ اس وقت مسلم علماء نے مسلم تنظیموں کو یکجا کیا اور بدحواس مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے مسلم مجلس مشاورت بنائی۔ مفتی صاحب اس میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی سے مفتی صاحب بے حد پریشان تھے۔ اس پر آشوب دور میں مفتی صاحب نے تن من دھن سے رات دن برادرانِ قوم کی خدمت کی۔ مفتی صاحب بنیادی طور پر کانگریسی تھے۔ لیکن انہوں نے مصلحت پسندی کو کبھی اپنا شعار نہیں بنایا جو غلط دیکھا، محسوس کیا اس کو انتہائی دلیری سے حکومت وقت سے برملا کہا۔

۱۹۳۸ء میں مفتی صاحب نے ایک علمی ادارہ "ندوۃ المصنفین" کے نام سے قائم کیا ندوۃ المصنفین کا قیام مفتی صاحب کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس ادارے سے مفتی صاحب کی سرپرستی میں بہت سی علمی، ادبی اور مذہبی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس ادارے کی حیثیت محض اشاعتی ادارے کی نہیں تھی۔ بلکہ یہ علم و دانش کا مرکز تھا۔ جس نے دین و ملت کی ایسی نمایاں خدمات انجام دیں جس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اس ادارے سے موصوف نے "بُرھان" کے نام سے ایک پرچہ بھی جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۳۸ء میں نکلا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ پرچہ نہ صرف باقاعدگی سے نکل رہا ہے بلکہ اس کا علمی اور ادبی معیار بھی قائم ہے۔ ندوۃ المصنفین کا ترجمان "بُرہان" ہمیشہ مفتی صاحب کو زندہ وجاوید رکھے گا۔ اس سلسلے میں مفتی صاحب کے صاحبزادے عمید الرحمن قابلِ ستائش ہیں جن کی اَن تھک محنت اور لگن سے "بُرھان" اپنی تمام تر خوبیوں اور حسن کے ساتھ زندہ ہے۔ ہماری دُعا ہے کہ مفتی صاحب کی یہ یادگار ہمیشہ قائم رہے۔ مفتی صاحب

سے دالعلوم کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب اس کا دفتر قرول باغ میں تھا۔ اس پر بھی بہت برا وقت آیا، اس کا تمام اثاثہ تباہ ہو گیا، یہ مفتی صاحب ہی کا حوصلہ تھا کہ اس کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

مفتی صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ وہ ہندوستان کے بیشتر سماجی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی اداروں سے بیک وقت منسلک رہے لیکن جس ادارے سے بھی منسلک رہے ان کی بھرپور توجہ اس پر مرکوز رہی، اور کبھی ان کے چہرے پر تھکن، جھنجلاہٹ اور پریشانی کے آثار نظر نہیں آئے۔ وہ واقعی مرد آہن تھے۔ خدا نے مخصوص صلاحیتیں انھیں ودیعت کی تھیں۔ مفتی صاحب فرشتہ صورت ہی نہیں۔ فرشتہ سیرت بھی تھے۔ ایسی شخصیتیں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کی وفات سے ہندوستان کے مسلمان ایک مخلص اور حق گو سیاسی رہنما اور سچے عالم دین سے محروم ہو گئے۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

اسلاف کی روایات کے امین

از مولانا محمد حنیف ملی شیخ الحدیث

معہد ملت - مالیگاؤں

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے دلی کے ان علماء کی بساط خالی ہوگئی، جو حرکت وعمل، دعوت وعزیمت، درد وکرب، ایثار وقربانی اور فکر وخیال کی اپنی طویل اور حسین تاریخ رکھتے وہ میر ملت اٹھ گیا۔ جس نے ملت اسلامیہ کے فرزندوں کو زندگی کا سبق دیا تھا، وہ پیر میکدہ اٹھ گیا۔ جس کی ذات سے توحید کے متوالے توحید کے جام ایک جہاں کو تقسیم کرتے تھے۔ ہاں! وہ مجاہد اٹھ گیا جس نے ۴۷ء کے ہنگاموں کے ہند وپاک جنگ تک نہ صرف پامردی سے غیر مسلم جارحیت کا مقابلہ کیا بلکہ مسلمانوں کو حوصلہ نہ ہارنے کا سبق دیا۔ مفتی صاحب اسلاف کے دور کی آخری کڑی تھے۔ وہ اپنے والد بزرگوار کی فقہی بصیرت تنقیح مسائل، گرہ کشائی، دوربینی کے سچے وارث تھے، عثمانی خاندان کے وہ گوہر شب چراغ تھے جس کی ضوفشانی سے دنیا ایک زمانہ تک یاد رکھے گی۔ وہ دارالعلوم کے ان فرزندوں میں شمار ہوتے تھے جن کا نصب العین دارالعلوم کی ترقی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ملت اسلامیہ انھیں ہندوستان کے معمار تاریخ ساز اور عہد آفریں علماء میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ مفتی صاحب نہ صرف ایک عالم دین بلکہ برصغیر میں فقہ وافتاء

تصنیف و تالیف درسگاہ، خانقاہ کے بجائے پوری ایک سرگرم فعّال نسل کے بانی
ہیں۔ انھوں نے اگرچہ تحریر و قلم کے میدان میں اپنے معاصرین میں زیادہ نہیں لکھا
اہم بہرکیف گرانمایہ جلیلیں آبادکیں، اپنے فکر و شعور سے الجھے مسائل کی گتھیاں
سلجھائیں۔ ہند اور بیرون ہند میں پوری دنیا کو ملّت کی قدروں سے آگاہ کیا۔ اور
زبان و قلم کا ذوق رکھنے والے کے لیے تحقیق و ریسرچ اور مضامین کے نت نئے
زاویے عطا کیے اور گائڈ ریسرچ کی حیثیت سے چھوٹے بڑے سب کو راہ بتائی۔
جس پر چل کر ان زرخیز مصنفین کو ان کی تصنیفات کے ذریعہ پورے ملک نے
پہچانا اور وہ یہ خدمت ہے جس پر لوگوں کی کم نظر جاتی ہے۔ ندوۃ المصنفین اسی
زندۂ جاوید تحریک کا نام ہے جسے مفتی صاحب نے اپنا لہو دے کر گل رنگ بنا دیا
ہے۔ اور آج جو ہندوستان کے ممتاز، معیاری اور ہمہ گیر اداروں میں شمار ہوتا ہے
دلی نے اپنی زندگی میں لکھو کھا علماء دیکھے ہوں گے۔ لیکن ایسا جامع کمالات کے لیے
وہ ہمیشہ ترسے گی۔ جس کی زبان تسنیم و کوثر کی طرح پاک و نفع بخش اور قلم نہایت
سادہ، زود اثر اور سحر انگیز اور جس کے فکر و شعور کے سامنے ہمالیہ کی بلندیاں بھی
خم ہوں۔ جن کی اصابت رائے اور زود فہمی نے نازک موڑ پر بھی مسائل چشم زدن
میں سلجھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب علماء کے اس ہراول میں نقیب کی
حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جنگ آزادی کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے۔ انھوں نے
شعلے بھی برسائے۔ اور شبنم ریزی بھی کی۔ غاروں کو گلے بھی لگایا۔ اور ملک و ملت
کے لیے اپنوں کی دوری بھی گوارا کی۔ ان کی زندگی میں ایک دلیر۔ بیباک، معاملہ فہم۔
سربکف اور دور اندیش مجاہد وطن کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ آزادی کے لیے حضرت
شیخ الہند کے ایماء پر جب حضرت مدنی نے جہاد کا اعلان کیا تو دلی کے علماء میں مفتی
صاحب نے سب سے پہلے یہ فتویٰ دیا کہ انگریزوں سے جنگ ناگزیر ہے اور ایک

...لمان اب خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ حضرت سحبان الہند کے بعد دلی کے بلبل
...خوش نوا تھے جن کے نام پر پورا شہر سمٹ کر گوش بر آواز ہو جاتا تھا۔ وہ اعلیٰ دماغ
...روشن ضمیر اور حساس تھے۔ ان کی نگاہیں ادا شناس اور طبیعت انتہائی متحرک
...تھی۔ زبان انتہائی شیریں، جملے معنی خیز، ترکیبیں ہموار اور انداز بیان بڑا شستہ تھا۔
ان کی تقریریں تکرار اور مہمل مضامین سے پاک تھیں۔ دو گھنٹے کی لمبی لمبی تقریروں میں
ان کی شخصیت باد صبا، اور موج کوثر کی تصویر پیش کرتی تھی۔ مخالفتوں اور شور
سے بھرے ہوئے مجمعوں کو اپنی ادا شناس نگاہوں، دل رُبا زبان اور معنی خیز
غمزوں سے رام کر لینا مفتی صاحب کی زندگی کا انتہائی نمایاں وصف تھا۔ ان کے
معاصرین میں مولانا محمد طیب صاحب کے سوا کوئی نہ تھا۔ افسوس کہ ملت
اپنے ان دونوں بزرگوں سے آج محروم ہے۔

"مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی دارالعلوم کے ان اولین سپوتوں میں ہیں
جن پر مادر علمی زندگی بھر ناز کرے گی، فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کے اصرار
پر انھوں نے برسوں باکمال استاذ کی طرح دارالعلوم میں درس دیا۔ بعد میں
حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ڈابھیل آ گئے جہاں تدریس کے ساتھ افتا کی
ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد جب جنگ آزادی شباب پر ہوئی تو
مفتی صاحب بھی اس سرگرم تحریک میں اپنے بزرگوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ حکومت
کے مظالم اور قید و بند کی تکالیف سے بے نیاز مفتی صاحب نے ہر اس تحریک کو
گرمایا جس میں اکابر کا لہو اور پسینہ شامل تھا اور اس وقت تک چین سے نہیں
بیٹھے جب تک انگریز نے ملک چھوڑ نہ دیا۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ آج جو
لوگ بھی حکومت کی کرسیوں پر فائز ہیں مفتی صاحب کی قربانیاں ان سے کسی طرح
کم نہیں ہیں۔ مگر چونکہ اس مرد درویش نے کبھی عہدوں کو پسند نہیں کیا۔ اس لیے

آزادی ملتے ہی تعمیری کاموں میں مصروف ہو گئے۔ تاآں کہ زندگی بھی اس کے لیے قربان کر دی۔ بلاشبہ علم و ادب اور قوم و ملت کے میدانوں میں مرحوم نے اتنا زبردست کام کیا ہے جو جماعتوں اور اداروں کی زندگی میں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ مرحوم حج کمیٹی کے مقبول ترین چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے دور کے کارنامے حجاج کے لیے سہولت، آج کے کام کرنے والوں کے لیے ایک نمونہ ہیں۔ وہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے تاحیات باوقار رکن رہے۔ شوریٰ میں ان کے مشورہ کو بڑا وزن حاصل رہا ہے۔ انھوں نے اس اہم ترین مجلس کی بارہا صدارت بھی فرمائی ہے۔ اور آگے بڑھ کر عملی طور پر بہت سی ذمہ داریاں قبول فرمائیں۔ وہ اپنے گہرے دوست مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب کے فکر و عمل کی طاقت اور ان کے کارناموں میں دست و بازو اور احساسات کے نقش جمیل تھے۔ دارالعلوم کی عظمت اور ترقی انھیں جان و مال سے زیادہ عزیز تھی اخیر میں جو نازک وقت دارالعلوم پر آیا۔ مرحوم اخیر تک اس کے لیے کوشاں رہے۔ بلکہ یہی فکر ان کے لیے پیام اجل ثابت ہوئی۔

مفتی صاحب کا دل قوم و ملت کے درد سے بھرا ہوا تھا۔ ملک کے گوشے گوشے میں جب فسادات کی لہر چلی اور مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ تو ہندوستان کے مسلم علماء نے ساری مسلم تنظیموں کو یکجا کر کے وفاق بنایا۔ اور مسلمانوں کے دلوں سے خوف وہراس دور کرنے اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے مسلم مجلس شوریٰ (مجلس مشاورت بنائی) پھر ملک بھر کا دورہ کیا مولانا بھی اس کے بنیادی بانیوں میں تھے۔ ابتدا میں نائب صدر پھر عمر بھر اس کے صدر رہے۔ اس دورہ کی تقریروں کو تو ملک بھر کے سمجھدار طبقے کبھی نہیں بھول سکے۔ اسی زمانہ میں مشاورت کا وفد استاذ محترم مولانا نعمانی کی کوششوں سے مالیگاؤں بھی آیا۔ جس کا شایان شان استقبال ہندو مسلم

انھوں نے کہا۔ مفتی صاحب بھی وفد میں شریک تھے۔ رات میں مشاورت کا جلسہ
میں جلسۂ عام ہوا۔ اس وقت جن مقررین نے دلوں کو مسحور کیا مفتی ان میں
سرفہرست ہیں۔ ان کی وہ باتیں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انھوں نے فرمایا:
ہم مسلمان ہیں۔ خوف وہراس ہماری فطرت نہیں ہے۔ ہم خدا کی ذات پر اعتماد
رکھتے ہیں۔ اور یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ فرقہ پرستوں کی طرف جو حالات پیدا کر دیے
گئے ہیں وہ خدا کا اٹل فیصلہ اور مسلمانوں کے لیے امتحان ہے جس کا بڑا سبب خود
ہماری غفلت ہے لیکن اس کا ایک مؤثر سبب ملک کی تقسیم ہے جس کے متوقع اندیشوں
کی نشاندہی ہم نے اس وقت بھی کی تھی ہم نے اس وقت بھی تقسیم کی مخالفت یہ
کہہ کر کی تھی کہ ہندوستان ایک مشترکہ ہبہ ہے۔ جسے ہبہ مشاع کہتے ہیں اور مشترک
ہبہ کی تقسیم بے سود ہوتی ہے جیسے کوئی مشترک چارپائی کو حقداروں میں تقسیم کر دیا جائے
تو کسی کے حصہ میں بان کسی کے حصہ میں ڈنڈے اور کسی کے حصہ میں پایہ آئے گا جو
کسی کے لیے مجموعی چارپائی کے مقابلہ پر مفید نہیں ہے مگر افسوس کہ برادران وطن کے
ساتھ ہمارے رہنماؤں کو بھی یہ بات سمجھ میں نہ آسکی بہرحال آج ہم اس مسموم فضا
کو بدلنے اور فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے امن کا پیغام لے کر اٹھے ہیں۔ ہم اگر ایک
طرف انتشار پسند طاقتوں کو وارننگ دے رہے ہیں۔ تو دوسری طرف مسلمانوں کو
یاد دلاتے ہیں کہ یہ ملک ان کا بھی ہے اس کی سالمیت کے ذمہ دار یہ بھی ہیں اس لیے
خوف وہراس دل سے نکال کر ملک کو ترقی دینے اور فرقہ پرستوں سے نظر ملانے کی
ہمت اپنے اندر پیدا کریں۔ مشاورت آپ کو یہی پیغام سنانے آئی ہے۔ ہم نعمانی صاحب
کے مشکور ہیں کہ ان کے ذریعہ اپنا درد دل آپ کو سنا رہے ہیں۔

مفتی صاحب کی اس تقریر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں صاف گوئی اور
بے باکی کے ساتھ کس قدر بے تکلفی تھی۔ وہ جس بات کو ضروری سمجھتے۔ دوستوں اور

[illegible] اس کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ اُن کی تقریریں مداہنت اور خوشامدانہ
[illegible] سے خالی تھیں اسی وصف کی بنا پر حکومت نے علماء میں ان پر اعتماد کیا
[illegible] نازک ترین موقعوں پر حکومت کے اجلاس یا ریڈیو سے انھوں نے قوم و ملت
کی نمائندگی کی۔ لیکن نہ اپنی انفرادیت اور اسلامیت کا سودا کیا۔ اور نہ اس پر کوئی
آنچ آنے دی۔ مولانا کی سینکڑوں ریڈیائی تقریریں خودداری اور مقبولیت کی
[illegible] مثل ہیں جنہیں انتقال سے سال بھر پہلے ندوۃ المصنفین نے "منارِ صدا"
کے نام سے شائع کیا۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ یہ نشری تقریریں منارِ صدا کے ساتھ
صدائے منار بھی ہیں۔ یہ تقریریں وقت کی پکار، غمِ دوراں کا علاج، سرمایۂ تسکین
[illegible] تاریک راہوں میں شعاعِ امید، مایوسیوں میں حوصلہ بخش۔ دیدہ و دل کے لیے فسانۂ
عبرت۔ ہندوستان کے بزرگوں کی دل افروز داستان مسلمانوں کی قربانیوں کا سچا
تذکرہ، جمہوریت کی سچی تعبیر، زخموں کے لیے مرہم۔ پیاسی روحوں کے لیے آبِ زلال۔
[illegible] چین انسانیت کے لیے سامانِ سرور۔ اور پورے ملک کے لیے ان مٹ لازوال
نقوش ہیں جسے مفتی صاحب نے دردِ دل اور نورِ ضمیر کی آمیزش سے ملک کے سارے
باشندوں کے سامنے پیش کیا ہے، قرطاس و قلم کے ساتھ زبان و خطابت کی دنیا میں
[illegible]ن عتیق الرحمٰن صاحب کا وہ دلپذیر اور جامع عطیہ ہے جس پر اسلامیان ہند کا سر
ہمیشہ سر در سے ہمیشہ اونچا رہے گا۔

مفتی صاحبؒ کی قد آور، اور مقبول ترین شخصیت کی عظمت کا دل پر اس وقت
[illegible] گہرا اثر ہوا۔ جب دو پڑوسی ملک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ ان دنوں میں
[illegible] ملت کے چند طلبہ کو لے کر انٹرویو کے لیے دلی گیا ہوا تھا، ہند و پاک مختلف محاذ
[illegible] جنگ میں مصروف تھے۔ مسلمانوں کے لیے زندگی اجیرن بنی ہوئی تھی۔ بے چارے
[illegible]ان تقسیم کا طعنہ سن رہے تھے، دل افزاہوں کی آماجگاہ اور میدان بنا ہوا تھا۔

دیو بند مرحوم بھی دو بار مولانا کی دعوت پر معہد ملت کے جلسہ تقسیم اسناد اور تقریب ختم بخاری میں بھی تشریف لا چکے ہیں۔ یہ ان کی خورد نوازی تھی کہ ہم نیاز مندوں پر شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ مولانا نعمانی صاحب کی علمی اور دینی سرگرمیوں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے، تعلیمی امور میں مفتی صاحب نے معہد ملت کو مہاراشٹر کا ندوہ بتاتے ہوئے اس کی ترقی کے لیے دعائیں بھی دی ہیں۔ مولانا نعمانی صاحب نے بھی مفتی صاحب کی شخصیت اور صلاحیت سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ ہند پاک جنگ کے وقت جب نعمانی صاحب گرفتار ہوئے تو ان سطروں کے راقم نے مفتی صاحب کو بذریعہ تار گرفتاری کی اطلاع دی، مرحوم نے یہ اطلاع پاتے ہی کہ مولانا گرفتار ہو گئے فوراً شاستری حکومت کو یاد دلایا کہ نعمانی صاحب جیسے نیشنلسٹ مسلمان کی گرفتاری جمہوریت کی پیشانی پر بدنما داغ ہے۔ مفتی صاحب کی کوششیں رنگ لائیں۔ اور مولانا نعمانی صاحب سب سے پہلے رہا ہوئے۔ رہائی کے وقت مرحوم نے مجھے جو خط لکھا تھا اس سے دونوں بزرگوں کے گہرے روابط کا پتہ چلتا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

السلام علیکم! گرامی نامہ ملا۔ نہایت مسرت ہوئی ہم لوگ مولانا کی گرفتاری سے کافی پریشان تھے ممکن کوشش بھی کر رہے تھے۔ جیسے ہی آپ کا خط پہنچا سعی میں لگ گئے تھے۔ ہمایوں کبیر صاحب نے بھی اس سے دلچسپی لی تھی۔ نندا جی کو بھی لکھا گیا تھا۔ بہت اچھا ہوا آپ نے بروقت اطلاع کر دی ورنہ شاید کل پرسوں میں نندا جی سے ملاقات کا پروگرام تھا یہاں میر مشتاق احمد صاحب نے بھی چند ناموں کی سفارش کی تھی۔ ان میں ایک نام مولانا کا تھا۔ بیشک حارث صاحب، فقیہ صاحب اور عابد صاحب نے بھی پوری کوشش کی ہو گی عابد بھائی خاص طور پر معتمد ہیں۔ مولانا سے سلام کہیے اور مبارکباد دیجیے۔ ساتھیوں کا کیا رہا توقع ہے کہ وہ بھی رہا ہو گئے ہوں گے حکام کو بہر حال ایسا غیر محتاط قدم نہیں اٹھانا چاہیئے اس سے عام مسلمانوں پر سخت ناگوار اثر پڑتا ہے آپ کے پہلے خط کے جواب میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ہوگئی معذرت خواہ ہوں، یقین ہے کہ آپ سب احباب بخیر و عافیت ہوں گے، ان تینوں طلبہ کو بھی سلام پہنچے، عتیق الرحمٰن عثمانی۔

مفکرِ ملت
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ؒ

محمد سعید الرحمٰن شمس، مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر

ہندوستان کی یہ سرزمین ہمیشہ سے مردم خیز رہی ہے اور اس سرزمین نے ہر دور میں علماء و صلحاء اور صوفیاء کو جنم دیا ہے، اس کی آب و ہوا میں مذہب سے دلچسپی اور نیکی کا جذبہ غالب رہا ہے۔ بڑے نامور اہل علم پیدا ہوئے اور انہوں نے ملک و ملت کی زریں خدمات انجام دیں، اور مذہب اور علم کو سرفرازی بخشی، انہی ممتاز علماء اور اہل علم میں مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ؒ بھی تھے۔ جن کی ذات اور نام پر بجا طور پر ملک و ملت کو ناز تھا۔ اپنی بعض خصوصیاتِ علمی اور ذہنی کی وجہ سے عوام و خواص میں مقبول تھے۔ اور دانشورانِ ملک و ملت ان کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور بلاشبہ ملک و ملت کی طرف سے وہ اس امتیازِ خاص کے مستحق بھی تھے۔

آپ کے دادا مولانا فضل الرحمٰن بانیانِ دارالعلوم دیوبند کی صفِ اوّل میں برابر کے شریک تھے۔ اور ساتھ ہی اپنے وقت کے مشہور عالم دین تھے۔ اور حکومت کے محکمۂ تعلیمات کے ایک افسرِ اعلیٰ تھے، انھوں نے اپنی تمام اولاد کو علم دین کی تعلیم دلائی اور وہ اپنے زمانے کے قابلِ ذکر علماء میں امتیازی شان کے مالک بھی ہوئے۔ عارف باللہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ؒ آپ کے بڑے فرزند تھے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم کے منصبِ افتاء پر فائز کئے گئے اور اس وقت سے لے کر ۱۳۶۳ھ تک تنہا کارِ افتاء انجام دیتے رہے بعد کے حالات نے دہلی کی

تعداد لاکھوں میں ہے۔

ہمارے ممدوح مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ انہی کے فرزند ارجمند تھے، اہل علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ اور علماء و صلحاء کی گود میں پل کر جوان ہوئے اور علم و عمل سے آراستہ ہوئے حافظِ قرآن بھی تھے۔ اور عالمِ دین بھی، مشہور محدث حضرت مولانا انورشاہ صاحب کشمیریؒ کے تلمیذ رشید تھے، فراغت کے بعد دارالعلوم کے استاذ ہوئے اور اس کے ساتھ اپنے والد محترم کے ساتھ افتاء کی مشق کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو ذہانت و ذکاوت کی وافر دولت سے نوازا ہے، مفتی صاحبؒ اپنے خاندان میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ بعد میں اپنے استاذ محترم علامہ کشمیریؒ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل منتقل ہوگئے، اور وہاں آپ نے اونچی کتابوں کا کامیابی کے ساتھ درس دیا اور اسی کے ساتھ کارِ افتاء آپ کے سپرد کیا گیا۔ آپ نے اس خدمت کا بھی پورا حق ادا کیا۔ حکومت برطانیہ کے خلاف جب ایک فتویٰ آپ کا شائع ہوا، تو اربابِ مدرسہ نے آپ پر پابندی عائد کی کہ فتاویٰ اربابِ اہتمام کی نظر سے گذر کر باہر جائیں۔ یہ بات آپ پر بارگذری اور اسے علمی خود داری اور منصبِ افتاء کے منافی سمجھا، اور ایسے بددل ہوئے کہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے علیحدگی اختیار کرلی، اور شاید عزم کرلیا کہ اس طرح کی ملازمت کبھی نہیں کرنی ہے۔

اس کے بعد عرصہ تک کلکتہ میں درس قرآن دیتے رہے، پھر "ندوۃ المصنفین" کا نقشہ ترتیب دیا۔ اپنے احباب کو معاونت پر تیار کیا۔ اور ۱۹۳۸ء میں دہلی آکر ندوۃ المصنفین کی داغ بیل ڈالی، آپ کے ساتھ مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا قاضی زین العابدین، مولانا حامد الانصاری غازی جیسے ممتاز علماء جمع ہوگئے، اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کردیا گیا۔ اس ادارہ سے ایک ماہوار علمی پرچہ "برھان" کے نام سے نکالا۔

پہلے سال جب ندوہ کی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں تو پورے ملک میں ندوۃ المصنفین

دنیا کی دھوم مچ گئی۔ بالخصوص علماء دیوبند میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کہ یہ پہلا تصنیفی ادارہ تھا۔ جس کا عمل عمل میں آیا۔ "ندوۃ المصنفین" دہلی سے مفتی صاحب کی زندگی میں سینکڑوں علمی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں۔ جن کو علمی دنیا میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان میں بہت ساری کتابیں ایسی ہیں جو اپنے مضمون میں اس وقت پہلی کتاب سمجھی گئی۔ اور بلاتمیز جدید وقدیم تعلیم یافتہ سبھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کے مطالعہ سے بہرہ ور ہوئے اور ان کے علم میں اس نئی تحقیق سے اضافہ ہوا۔

بہت سارے مصنفین ایسے بھی ابھر کر سامنے آئے جو اپنے ذوق وشوق کے لحاظ سے ممتاز تھے، لیکن اپنی تصنیفات کے شائع نہ ہونے کی وجہ سے گمنامی کے پردے میں روپوش تھے۔ مفتی صاحب کی قدردانی اور علم نوازی کی وجہ سے ان کی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ اور ان کتابوں کے گمنام مصنفین سے ملت کے ارباب علم وفہم روشناس ہوئے اور ان مصنفین میں آگے بڑھنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا ہوا۔ کوئی شبہ نہیں اگر "ندوۃ المصنفین" دہلی سے ان کی تصنیفات شائع نہ ہوتیں تو شاید ان کو کوئی نہ جانتا۔ اور ان کے حوصلے پست ہو جاتے۔ مفتی صاحب کی یہ خدمت تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو اس خدمت دینی وعلمی کا بہت بہت صلہ عطا فرمائیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ میں جہاں علم وفن کی خدمت کا بھرپور جذبہ تھا وہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو سیاسی بصیرت اور ملک کی خدمت کا بھی ذوق عطا کیا تھا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ مفتی صاحب نے ملازمت سے سبکدوشی اس لئے حاصل کی تھی کہ انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا اور اس کی وجہ سے ارباب مدرسہ نے ان پر پابندی عائد کی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد ہمیشہ اسی صف سے وابستہ رہے جو انگریزی حکومت کے خلاف صف آراء تھا۔ اور ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔

ملک کی آزادی کے بعد جب دہلی میں آگ و خون کی بارش ہو رہی تھی آپ میدان عمل میں نکل آئے۔ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن کے ساتھ اس وقت حق کی بحالی کے لئے اپنا آرام و چین بھول گئے۔ حالانکہ اسی آگ فتنہ و فساد نے آپ کا محبوب ادارہ "ندوۃ المصنفین" جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اور لاکھوں کتابوں کا قیمتی اسٹاک برباد ہو چکا تھا۔ بایں ہمہ آپ نے ہمت نہیں ہاری اور بال بچوں کو دوسرے محلہ میں منتقل کر کے ملک و ملت کی آبرو بچانے کی خاطر سرگرداں دہلی کی گلی کوچوں میں پھرتے رہے۔ اس زمانہ میں بارہ بارہ گھنٹے آپ کام کیا کرتے تھے اور آگ و خون کے سیلاب میں چل پھر کر لوگوں کی خدمت انجام دیتے رہے۔

مفتی صاحب سیاسی میدان میں حربی واقع ہوئے تھے۔ کسی سے دبنا نہیں جانتے تھے... بڑے بڑے غیر مسلم لیڈروں کو غلط اقدام پر برملا ٹوک دیا کرتے تھے۔ "مرارجی ڈیسائی" سابق وزیر اعظم ہند ایک مسلم اجتماع میں مسلمانوں پر احسانات جتانے لگے اور ساتھ ہی دھمکیاں بھی دینے لگے تو مفتی صاحب سے برداشت نہیں ہو سکا، آپ نے بھرے جلسہ میں اٹھکر فرمایا،

"مرارجی بھائی! آپ تو گویا اس ملک کے بادشاہ ہیں جو اپنی پسند اور مرضی پر مسلمانوں کو چلنے کا فرمان سنانے آئے ہیں، آپ کو یہ بات پسند نہیں وہ بات پسند نہیں، یہ بات آپ گوارہ نہیں کر سکتے، وہ بات آپ برداشت نہیں کر سکتے، آپ ہیں کیا؟ جو مسلمان آپ کی مرضی، آپ کی پسند اور آپ کے فرمان کی تعمیل پر اپنے آپ کو مجبور سمجھیں"

(برہان مفکر ملت نمبر)

جب تک مولانا حفظ الرحمٰن زندہ رہے جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے اور اس جماعت کے مشیر خصوصی کی حیثیت رکھتے تھے۔ راؤرکیلا کے فسادکے بعد جب "مسلم مجلس مشاورت" قائم ہوئی تو آپ نے ڈاکٹر محمود صاحب کے ساتھ مل کر کام کیا اور ایک وفد کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کی اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بعد مجلس مشاورت

کے صدر [illegible] تھے۔ اور [illegible] اپنے اس عہدے پر قائم رہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا ءکا
جب [illegible] میں پہلا اجتماع ہوا۔ حضرت مفتی صاحب اس میں بھی پیش پیش رہے اور اس کے
اجلاس میں بڑی گرم تقریر کی۔ اور مسلم پرسنل لا ءکی اہمیت لوگوں پر واضح کی، اور آپ کے
بعد پھر دوسرے مقررین نے بھی اسی انداز کی تقریریں کیں۔ مفتی صاحب دینی مسائل کے تحفظ
دفاع پر جب بولتے تھے۔ مجمع دم بخود رہ جاتا تھا۔ اور پورے مجمع پر سکوت طاری ہو جاتا تھا۔

ایمرجنسی کے زمانہ میں مہدیان دھلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا ءکی ایک میٹنگ تھی۔ مشہور
یہ تھا کہ اراکین مجلس گرفتار کر لئے جائیں گے۔ فوج اس سے پہلے ترکمان گیٹ میں بھیجی
جا چکی تھی۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دیو بند سے دہلی کے لئے روانہ
ہوئے تو ان کے کچھ بہی خواہوں نے دہلی جانے سے روکنا چاہا۔ مگر انہوں نے فرمایا بھائی! میں
صدر رہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہاں سب لوگ جائیں اور میں موجود نہ رہوں، جو ہوگا دیکھا
جائے گا۔ مفتی ضیاء الحق دھلوی کو مہمانوں کی میزبانی سپرد تھی۔ وہ چھپ چھپ کر سارا انتظام
کر رہے تھے، تمام اراکین و مدعو حضرات پہونچے۔

اس موقع پر سب سے پہلے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہی تقریر کے لئے
کھڑے ہوئے جہاں اور باتیں فرمائیں، برملا کہا کہ یہ دین کا معاملہ ہے، ہم سب کو قطعاً
گھبرانا نہیں چاہئے، گرفتاری ہوئی تو میں سب سے پہلے اس کے لئے تیار ہوں۔ اور پھر سبھوں
نے اظہار رائے کیا اور گرفتاری کے لئے اپنے کو پیش کیا میٹنگ دو گھنٹے سکون سے ہوئی
تجویز لکھی گئی، اور پڑھی گئی مگر فورس نہیں پہونچی۔

مرشدی حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے لکھا ہے کہ مشاورت کے دورے کے موقع
سے میں نے حکومت پر سخت تنقید کی۔ پنڈت سندر لال جو شریک وفد تھے، انھوں نے میری
تقریر پر سخت تنقید کی۔ اور رات کے بعد صبح میں بھی کچھ بولتے ہی رہے۔ کسی نے ان کو نہیں
ٹوکا۔ مگر صبح میں جونہی مفتی صاحب کے کان میں ان کی آواز پہونچی تو پنڈت جی کو مخاطب

کسی نے کہا کہ حضرت ایک مولانا نے کیسی بے جا بات کہی! آخر آپ اتنے گرم کیوں ہوئے؟ چپ ہو کر
سکوت فرما گئے اور پھر زبان نہیں کھولی۔

حضرت حفظ الرحمان نے ہی لکھا ہے کہ اس دورہ میں آخری تقریر مفتی صاحب کی ہوئی۔ انھوں نے فرمایا۔ "صحیح آزادی اور جمہوریت وہ ہوتی ہے جس کا فیض یکساں طور پر آبادی کے تمام عناصر اور ملک کے تمام فرقوں اور طبقوں کو پہونچے۔ پھر مسلمانوں کو جو شکایتیں ہیں ان کا ذکر کیا پھر یہ اشعار پڑھے۔ ؎

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے
کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پر بھی نکھار آئے
چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں
کہیں بہار نہ آئے اور کہیں بہار آئے

مفتی صاحب مرحوم بڑے خلیق، ملنسار اور با وضع عالمِ دین تھے۔ دہلی میں مفتی صاحب تمام لوگوں کے مرجع ہوتے تھے۔ سارے لوگ ان کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے۔ اور رہبر جماعت کے افراد ان کے نیک مشوروں سے مستفید ہوتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساری سیاسی پارٹی والے ان کو اپنا مخلص جانتے تھے اور دراصل وہ سچے خیر خواہ تھے۔ سبھوں کو مشورے صحیح دیا کرتے تھے۔ عموماً خود گھر سے چائے لے کر آتے تھے۔ حالانکہ ملازمین موجود ہوتے، کھانے کا وقت ہوتا تو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے تھے۔

فقہ و فتاویٰ پر بڑی اچھی نظر تھی۔ کتابوں کے حوالے نوک برزباں ہوتے تھے۔ حالات زمانہ پر نظر رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس کی نظر حالاتِ زمانہ پر نہ ہو وہ فتویٰ دینے کا اہل نہیں ہے۔ ۱۹۵۰ء تک وہ استفتاروں کے جوابات باضابطہ لکھتے رہے۔ اور خواص ان کے نام استفتار بھیجتے رہے ہزاروں فتوے انھوں نے دہلی کے قیام کے زمانہ میں بھی دیئے ان کا رجسٹر ندوۃ المصنفین میں موجود ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد جب ندوۃ المصنفین کے انتظامی امور اور ملکی ہنگاموں کی دیکھ بھال میں منہمک ہو گئے، تو جوابات لکھنا بند کر دیا، کوئی زیادہ اصرار کرتا تو لکھ دیا کرتے تھے۔ وہ فرمایا

ہے دار الافتاء دار العلوم دیو بند سے معلوم کریں۔ یوں تو اہل علم سے خط و کتابت میں مسائل کے متعلق اظہار کیا کرتے تھے اور کہنا چاہیے کہ ان کی علمی تحریر سے اچھی رہنمائی ہوا کرتی تھی، آپ کے خطوط بھی علمی ہوا کرتے تھے۔ چونکہ ہمیشہ اہل علم میں ہی وقت گذرتا تھا اس لیے بڑی علمی مناسبت تھی، ذہن ہر وقت حاضر رہتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تقریر و تحریر دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کی تحریر کی طرح تقریر بھی مرتب و مہذب ہوا کرتی تھی، الفاظ اور جملے نپے تلے اور موثر ہوتے تھے۔ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ "منارِ صدا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ زبان کس قدر پاکیزہ تھی۔ اور اس میں کیسی جاذبیت ہے۔

مفتی صاحب کی وضع داری بھی قابلِ ذکر ہے، جس سے ایک مرتبہ تعلقات قائم ہو جاتے تھے اس کو برابر نباہتے تھے۔ کبھی اس میں فرق آنے نہیں دیا کرتے تھے۔ ایسا با وضع آدمی کم دیکھنے میں آیا ہے، بارہا کا تجربہ ہے کہ جب بھی کوئی ملنے والا آتا آپ کے اخلاق اور ملنساری سے متأثر ہو کر اٹھتا، مزاج میں سادگی تواضع اور بے تکلفی تھی۔ اپنے چھوٹوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے، اور لکھنے پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا اللہ تعالیٰ نے خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا۔

مفتی صاحب کا ذاتی کتب خانہ بڑا نفیس اور صاف ستھرا تھا۔ کتابوں کی جلدیں بہت عمدہ، مضبوط اور جاذبِ نظر ہوتی تھیں۔ الماریوں میں کتابیں سلیقہ سے لگی رہتی تھیں۔ یہاں سے نکالتے پھر اسی جگہ رکھا کرتے تھے۔ اس کتب خانہ میں مصلیٰ ہمیشہ بچھا رہا کرتا تھا اور عموماً وہ بند رہا کرتا تھا۔ عام لوگوں کا جانا آنا نہیں ہوتا تھا۔ مفتی صاحب اپنے معمولات کے زبردست پابند تھے۔ مگر عبادت و ریاضت میں ان کے یہاں نمائش قطعاً نہ تھی۔ نماز باجماعت مسجد میں ادا کرنے کے البتہ عادی تھے، اس میں غیر حاضری نہیں ہوا کرتی تھی۔

آپ کے پدر بزرگوار حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ ہندوستان کے

باعمل عالم دین۔ ممتاز فقیہ اور اپنے دور کے مفتی اعظم تھے۔ سلوک و معرفت میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ ہزاروں عوام و خواص آپ کے مرید تھے اور پورے متحدہ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ آپ کے ایک سگے چچا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔ اور عربی زبان کے مشہور ادیب اور شاعر تھے۔ اور اپنے فہم و تدبر میں شہرت رکھتے تھے۔ دوسرے چچا شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے۔ جو دارالعلوم دیوبند کے عرصہ تک صدر مہتمم رہے۔ پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث ہوئے اور پاکستان کے شیخ الاسلام۔

لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مفتی صاحب نے ان بزرگوں میں سے کسی کا کوئی سہارا نہیں لیا۔ اور ان کے نام پر کوئی منصب اور مقام حاصل نہیں کیا۔ جو کچھ کیا اپنی ذاتی صلاحیت اور استعداد پر اعتماد کر کے کیا اپنا مقام اور منصب خود حاصل کیا، ہمارے بزرگ قاضی زین العابدین صاحب مدظلہٗ نے بہت درست لکھا ہے۔

> "ہمارے مفتی صاحب نے انہی بزرگوں کی آغوش میں تربیت پائی اور وہ ان کے علمی و عملی کمالات سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مفتی صاحب ان اسلاف کرام کے خلف صالح تھے۔ مگر انہوں نے کبھی ان کی قبروں کا سودا نہیں کیا۔ وہ اگر اپنے والد بزرگوار کے مسند بیعت و ارشاد پر بیٹھنا پسند کرتے، تو بے شبہ ہزاروں لوگ ان کے آگے سر نیاز جھکاتے اور ان کے سامنے بھی تحفہ و ہدایا کی رقوم کے ڈھیر لگ جاتے، مگر انہوں نے ہمیشہ اس سے احتراز کیا۔ انہوں نے ہمیشہ بزرگوں کی استخواں فروشی سے اظہار بیزاری کیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے لئے کامیابی کی راہ نکالنے کو پسند کیا،" (برہان مفکر ملت نمبر)

مفتی صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اہل علم کی مجلس اور خالص علمی مجمع پر کنٹرول

کرنے کا ملکہ تامہ حاصل تھا۔ قدیم و جدید دونوں طرح کے تعلیم یافتہ آپ کی باتوں سے خوش ہوتے تھے اور ساتھ ہی متاثر بھی ہوتے تھے۔ "کل ہند مجلس مشاورت" اور "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کے جلسوں میں حضرت مفتی صاحب کی یہ صلاحیت نمایاں ہوکر سامنے آتی تھی۔ اصابتِ رائے اور معاملہ فہمی آپ کا وصفِ خاص تھا۔ اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانا مفتی صاحب کے لئے بڑا آسان ہوا کرتا تھا لوگ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔

عوام و خواص، سرکاری اور غیر سرکاری، کانگریسی اور غیر کانگریسی سارے کے سارے آپ کی عزت کیا کرتے تھے۔ بعض مرکزی وزراء تک مشورہ کے لئے آپ کی خدمت میں پہونچتے تھے۔ اور آپ سے مشورہ حاصل کرکے خوش ہوا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت ساری خوبیاں آپ میں جمع کردی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ سارے اہلِ علم ذی رائے اور ملک و ملت سے دلچسپی رکھنے والے آپ کی قدر کیا کرتے تھے۔

آپ کبھی سخت سے سخت موقع پر بھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ زمانہ کے سینکڑوں نشیب و فراز آپ نے دیکھے اور کتنے ہی طوفانوں اور آندھیوں سے ہوکر گذرے لیکن کبھی خوف و ہراس اور ناامیدی آپ پر طاری نہیں ہوئی۔

عمر کے آخیر حصہ میں فالج نے آپ کو صاحبِ فراش کردیا تھا۔ ان کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ مگر مفتی صاحب اس حالت میں بھی تر و تازہ نظر آتے تھے۔ اور اپنی باتوں سے آنے والوں کو حوصلہ بخشتے تھے۔ مگر مرض بڑھتا گیا اور آخر وہ وقت بھی آیا کہ عمر کی چوراسی منزلیں پوری کرکے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اور اپنے پیچھے ملک و ملت کو سوگوار چھوڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔

کاروانِ حریت کے سپہ سالار جمہوری قدروں کے پاسبان

مفکرِ ملت

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

مولانا مفتی جمیل الرحمن قاسمی ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی ، نئی دہلی

بنی نوع انسان کی تاریخ میں ہزار ہا اربابِ فضل و کمال ، اہلِ فراست اہلِ بصیرت صاحبانِ علم و عرفان ، کائناتِ رنگ و بو کے مطلعِ وجود پر آفتاب و ماہتاب بن کر نمودار ہوئے۔ اور پھر کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کی تصدیق کرتے ہوئے فنا کے دبیز پردوں میں روپوش ہوگئے، تاہم کچھ اہل کمال اور ایثار پیشہ افراد قفسِ عنصری سے آزاد ہوکر نقشِ دوام کی حیثیت سے جلوہ گر رہتے ہیں۔ اور دنیا کا ہر گوشہ اور ہر طبقہ ان کے تذکار سے رونق اور آسودگی حاصل کرتا ہے۔ ؎

فغاں کہ گشت نیوشندۂ سخن خاموش
وگرچہ گو بہ تسلی کنم من ایں لب و گوش

مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اس نوع استثنار کی ایک زندہ جاوید مثال ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کاروانِ حریت کے عظیم سپہ سالار اور جمہوری اقدار و روایات کے پاسبان ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم سے متحدہ قومیت کا درس دیا ، فرقہ واریت کو زہر ہلاہل بتایا ، فرنگی سامراج

کے خلاف کھلی ہوئی کشمکش جنگ لڑی۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، اور جہادِ حریت کے ہر باشی کی حیثیت سے قربانی کی ہر منزل پر قائدانہ رول ادا کیا۔ حق گوئی، بے باکی، اور بے خوفی میں ہوتے اسد اللّٰہی سے سرشار نظر آئے۔ ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

آزادیٔ وطن کے بعد مفتی صاحب کی تمام تر توجہ ملک کے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنے پر صرف ہوئی۔ ملک کے مختلف فرقوں میں تال میل پیدا کرنے کی ایک پُرخلوص لگن تھی۔ برادرانِ وطن کو دردبھری آواز سے اتحاد اور اعتماد پیدا کرنے کا درس دیتے تھے، فرقہ وارانہ فسادات، آزاد ہندوستان کی پیشانی پر کلنک لگا رہے تھے، مفتی صاحب اپنے بزرگوں اور رفقاءکار کے ساتھ اس بدنامی کو نیک نامی سے بدلنے کا ماحول پیدا کر رہے تھے، فضا میں انتشار تھا، تشتت تھا، انارکی اور لاقانونیت تھی، مفتی صاحب کے قلب و جگر میں اضطراب تھا، بے چینی تھی، اور کسک اور ہوک کی کیفیت تھی، جمعیت علماء کے قائد ہوتے ہوئے بھی وہ پوری قوم سے مخاطب ہوتے تھے۔ ان کی افتادِ طبع تفرقہ اور گروپ بندی سے بیزار تھی، ان کے یہاں سب ہم وطن بھائی بھائی تھے۔ ایک فرقہ کی تباہی کو وہ پوری قوم کی تباہی سے تعبیر کرتے تھے۔ انہوں نے مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سیوہاروی کی قیادت میں ایک کنونشن بلایا۔ جس میں ہر پارٹی کے نمائندے موجود تھے، سب نے بلا امتیاز مذہب و ملت اس مسئلہ پر تشویش ظاہر کی، اور فسادات پر قابو پانے کے لیے حکومت کے سامنے کچھ تجاویز پیش کیں۔ پھر کلکتہ کے ہولناک فساد پر مفتی صاحب کی بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اور انہوں نے مسلم جماعتوں کا ایک مشترک پلیٹ فارم

تیار کیا۔ یہ بات شاید ارباب بست وکشاد کو اچھی معلوم نہ ہوئی، اور جمعیت علماء کی قیادت بدلنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔

اس کے چند ماہ بعد حضرت مفتی صاحب کو اپنے اعوان وانصار کے ساتھ جمعیت سے بے دخل ہونا پڑا۔ لیکن مفتی صاحب نے اپنی روایت اور وضعداری میں فرق نہ آنے دیا۔ متحدہ قومیت اور سیکولرازم کے لئے وہ برابر لڑتے رہے۔ کانگریس کا پلیٹ فارم انھوں نے نہ چھوڑا۔ اور جمہوریت کے بقاء وارتقاء کے لئے اپنی جد وجہد جاری رکھی۔ ملک کا سیکولر طبقہ مفتی صاحب کی اس وضعداری کی قدر کرتا تھا۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد ابراہیم صاحب، ڈاکٹر سید محمود صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین، فخرالدین علی احمد، جنرل شاہنواز خاں، مسٹر شفیع قریشی، جناب یونس سلیم صاحب ضیاء الرحمٰن انصاری، خورشید عالم خاں اور دوسرے رہنما مفتی صاحب کو اپنا شریک سفر سمجھتے تھے۔ اور اہم امور میں ان کی آراء قبول کرتے تھے۔

دوسری جانب مسلم مکاتب فکر کے زعماء، مفتی صاحب کو پکا قوم پرست سمجھنے کے باوجود اپنا مخلص اور مسیحا گردانتے تھے، جناب محمد اسماعیل صاحب، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، جناب ذوالفقار اللہ صاحب، محترم سیدنا برہان الدین صاحب، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب جناب سید حامد صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا ابواللیث صاحب، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب، سلطان صلاح الدین اویسی صاحب اور جناب محمد مسلم صاحب وغیرہ حضرت مفتی صاحب کی فراست ودوراندیشی کے قدرداں تھے، اور ان کی آراء اور مشوروں کو ملی جماعتوں اور مذہبی اداروں کے حق میں مفید تر خیال کرتے تھے، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ہو یا جامعہ ملیہ، امارت شرعیہ ہو ندوۃ العلماء، دارالعلوم ہو یا مظاہر علوم، جملہ مراکز کا حسن انتظام مفتی صاحب کا رہین منت رہا۔ وہ تمام اداروں کو اپنا ادارہ اور تمام جماعتوں کو اپنی جماعت سمجھتے تھے، کسی

گویا ادارہ میں طوفان آیا۔ ارباب حل وعقد ندوۃ المصنفین میں جمع ہوگئے، مفتی صاحب درد اور تڑپ کا اظہار کرتے، اور روٹھے ہوئے دلوں کو جوڑ کر بحران کو ختم کر دیتے۔ ان واقعات کو اگر تفصیل کا جامہ پہنایا جائے۔ تو دفاتر کے دفاتر درکار ہیں۔ ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ توز داماں گلہ دارد

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت (جس کو تمام مکاتب فکر کی نمائندگی حاصل ہے) کی صدارت اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے ہر بار تمام زعماء نے مفتی صاحب کو مشاورت کا صدر منتخب کیا۔ اہلِ سیاست جو بالعموم ظاہر و باطن کا فرق رکھتے ہیں، اور اپنے راز ہائے سربستہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے، مفتی صاحب کو اپنے مخفی ارادوں سے مطلع کرتے، اور ان کی بصیرت و فراست سے بے تکلف مستفید ہوتے، اس وضع و کردار کا انسان بلا ریب صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ربع مسکوں پر بسنے والے ابنائے آدم کیا، عرشیوں کی جماعت بھی اس پیکر خلائق پر رشک کرتی ہے ... کہکشاں اس کی عملی ضیا پاشیوں سے نور اخذ کرتا ہے اور گیتی کے گلہائے رنگا رنگ اس کے بے لوث کارناموں کی تخم کاریوں سے زینت اور تابانی حاصل کرتے ہیں۔ ؎

جمع ہیں تجھ میں سب وصف و ہنر اے مجمعِ خوبی
ملاقاتی ترا گویا بھری محفل سے ملتا ہے

اپنی ان گوناگوں مصروفیات کے باوجود چھوٹے مدارس و مکاتب سے بھی مفتی صاحب نگرانی اور سرپرستی کا تعلق رکھتے تھے، مدارس کے ارباب اہتمام ان کے پاس جاتے۔ اور ان کا قیمتی وقت لیتے۔ مفتی صاحب تکان اور نقاہت کے باوجود ان کے مسائل سے پوری دلچسپی لیتے۔ جمعیت علماء سے علیحدہ کئے جانے کے باوجود بھی سینکڑوں مدارس ان کی سرپرستی میں کام کرتے تھے۔ والد محترم حضرت الحاج قاری عبدالرحمٰن صاحب اور ان کے جامعہ رحمانیہ سے بھی مفتی صاحب کو تعلقِ خاطر رہا۔ بارہا جامعہ کے جلسوں کو رونق بخشی، اور اپیلیں

تحریر فرماتیں۔ ہاپوڑ سے جو وفد مفتی صاحب کی خدمت میں پہونچتا تو مفتی صاحب اسی سے سوال کرتے کہ بھائی ہمارے قاری جی خیریت سے ہیں۔ ایک مرتبہ والد صاحب نے کسی مسئلہ میں پریشانی ظاہر کی، مفتی صاحب وضو کر رہے تھے۔ وضو کے چپل پہنتے پہنتے والد صاحب کو لے کر سید عزیز شفیع جج صاحب کے مکان پر پہونچ گئے۔ اور فرمایا کہ ان کا کام میرا کام ہے آپ کو انجام دینا ہے۔

اتنے عظیم مناصب پر فائز ہونے کے باوجود بڑائی کا احساس دور دور تک نہ تھا کسر نفسی خوش خلقی اور ملنساری سے اپنوں اور پرایوں کے دل جیت لیتے تھے۔ بڑے سے بڑا مخالف ایک دو ملاقات کے بعد ولی صمیم بن جاتا تھا۔

دارالعلوم کے بحران کے زمانہ میں اکثر ان سے فیض حاصل کرنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ہر مخالف، موافق کے ساتھ خندہ پیشانی کا معاملہ دیکھا، میں نے بغور جائزہ لیا کہ یہ خوش روئی صرف ظاہر تک محدود نہ تھی بلکہ باطن بھی پاک وصاف تھا، کسی سے رنجش اور کبیدگی کا کوئی خانہ نہ تھا، جذبہ انتقام تو بڑی بات ہے۔

اس زمانہ میں بعض جریدے ناگفتنی اور غیر شائستہ مضامین لکھ رہے تھے ایک صحافی نے بعض غلط فہمیوں کے سبب مفتی صاحب کے خاص طور پر ہدف بنا رکھا تھا، مفتی صاحب سے لوگ تذکرہ کرتے، کبھی ان مضامین کو دکھاتے لیکن مفتی صاحب کے چہرہ پر کبھی ناگواری کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ فرماتے! خدا ان احباب کو فہم سلیم عطا فرمائے۔ نیرنگیٔ اتفاق کہ دن وہ صحافی صاحب خود مفتی صاحب کی مجلس میں پہونچ گئے۔ اس وقت مفتی ضیاء الحق صاحب، مولانا احمد علی قاسمی صاحب مولانا فقیہ الدین صاحب، جاوید حبیب، جناب محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر طاہر الاسلام صاحب اور متعدد احباب موجود تھے۔ مختلف امور پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ جب رخصت ہونے لگے، تو... مفتی صاحب نے صحافیِ محترم کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا! کیوں میاں آج کل بڑے سخت مضامین آرہے ہیں۔ ہم سے اتنے ناراض کیوں ہو؟ جو کچھ نصیحت کیا کرو، یہاں آکر کر لیا کرو، مفتی صاحب

[illegible] تھے دل پر گہرا اثر ہوا، زبان گنگ ہوگئی کہ جواب ۔ [illegible]

ہوکر [illegible] الصمد [illegible] تھے، اور انداز فکر بدل دیا۔

یہ ہیں بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، جن کا آج صرف تذکرہ رہ گیا ہے۔ ان واقعات کو خامہ گرفت میں لیتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہ دنیا کیوں ایسے لوگوں سے خالی ہوتی جارہی ہے، صاحب بارش ہیں، گلستانِ زمین کو اس نعمتِ عظمیٰ سے کب بہرہ ور فرمائیں گے، کہ ہماری زندگیاں ان نقوشِ تاباں سے آراستہ ہوجائیں۔ ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

کہیں سے آبِ بقاءِ دوام لا ساقی

افسوس یہ حق گو، راست باز، بے باک اور مخلص رہنما ہمارے درمیان نہ رہا، آج کے نت نئے مسائل اور پرآشوب ماحول میں ان کی ایمانی قوت، دینی فراست، فکری رفعت، اور سیاسی بصیرت شدت سے یاد آرہی ہے۔ کاش وہ ہمارے درمیان ہوتے، ہماری ڈھارس بندھاتے، اور یاس وبیم کی لعنت سے چھٹکارا دلاتے۔ ؎

ملتِ اسلام کا تھا تو امیرِ کارواں

آگیا آبِ زیرِ گردش کارواں تیرے بغیر

اکنوں از غیر حسرت چارہ چیست ، مرضیِ مولیٰ ازہمہ اولیٰ

وہ رضا وتسلیم کے ساتھ مسکراتے ہوئے، عالمِ جاودانی کی طرف چلے گئے، اور ہم کو دنیائے فانی میں روتا بلکتا چھوڑ گئے۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وادخلہ فی نعیم جناتہ

بُرہان

جلد ۱۰۹	مارچ ۱۹۹۲ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ	شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا۔

نظرات

بجٹ اور مہنگائی کی لہر

گذشتہ ماہ کے دوران میں ۹۳-۱۹۹۲ء کے لئے ریلوے بجٹ اور عام بجٹ پارلیمنٹ میں پیش کئے گئے۔ ریلوے بجٹ میں جو ۲۵ فروری کو پیش کیا گیا فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے کرایہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ سامان کی حمل ونقل کے بھاڑہ میں بھی کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن اناج، پھل، سبزیوں اور بناسپتی کے بھاڑہ میں کسی طرح کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ وزیر ریلوے مسٹر جعفر شریف کا یہ ایک احسان ہے۔ جو انہوں نے ہندوستانی عوام پر کیا ہے۔ وزیر خزانہ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے ۲۹ فروری کو لوک سبھا میں بجٹ برائے ۹۳-۱۹۹۲ء پیش کیا۔ اس میں ۵۳۸۹ کروڑ روپئے کا خسارہ دکھایا گیا ہے۔ اس بجٹ کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ انکم ٹیکس کی حد ۲۲ ہزار روپے سے بڑھاکر ۲۸ ہزار کردی گئی ہے۔ وناسپتی، سیمنٹ، نائیلون اور رکانی پر ڈیوٹی گھٹا دی گئی ہے۔ گھڑیوں، فلٹر سیگریٹ اور ٹائر پر ڈیوٹی بڑھادی گئی ہے۔ بجٹ میں خاندانی بہبود کے لئے رقم بڑھا دی گئی ہے یہ رقم ایک ہزار کروڑ روپے کردی گئی ہے ڈیفنس کے لئے ۱۷۵۰۰ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے۔

بجٹ کے دوران ہی میں پارلیمنٹ میں اپوزیشن پارٹیوں نے یہ الزام لگایا کہ عالمی بنک کو بجٹ کی تجاویز سے پہلے ہی مطلع کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے عالمی بنک اور عالمی مالیاتی فنڈ سے جو خط وکتابت کی ہے۔ اس میں آنے والے بجٹ کی تجاویز کا انکشاف کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے اس الزام کو غلط بتایا۔ اور اسپیکر کی ہدایت پر ساری خط وکتابت ایوان میں رکھدی اپوزیشن پھر بھی مطمئن نہ ہوئی۔ یہ بحث کافی دن چلتی رہی۔ اس دوران میں اپوزیشن نے دوبارہ واک آوٹ کیا۔ نیشنل فرنٹ اور بائیں بازو کی پارٹیوں نے الزام لگایا کہ اس

بجٹ میں عالمی بینک اور عالمی مالیاتی فنڈ کی چھاپ ہے۔

اپوزیشن اور ملک کا دانشور طبقہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہندوستان کی معیشت پر آہستہ آہستہ غیر ممالک چھا رہے ہیں۔ بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ہندوستان میں سرمایہ کاری کی دعوت دی جا رہی ہے۔ یہ کمپنیاں ہمارے آپ کے لئے تو کارخانے نہیں لگائیں گی۔ اور نہ پروجیکٹ چلائیں گی ظاہر ہے کہ یہ اس میں زیادہ سے زیادہ منافع اپنے لئے رکھیں گی۔ وقت آرہا ہے۔ یہ غیر ملکی کمپنیاں ہمارے اقتصادی ڈھانچہ کو اپنی گرفت میں لیں گی کہ شاید صدیوں میں ہم ان کے چنگل سے آزاد نہ ہونگے

ریلوے بجٹ اور عام بجٹ کے نتیجہ میں مہنگائی بڑھے گی۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہوسکتیں۔ اگر لوگوں کی آمدنی میں بھی ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا تو یہ مہنگائی ناگوار نہ گذرتی۔ لیکن آمدنی تو اپنی جگہ ہے۔ اور مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ اس صورت میں ایک عام اور شریف آدمی گذر بسر کیسے کرتا ہے۔ ہاں جن کے پاس نمبر دو کی آمدنی ہے۔ ان پر بجٹ کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

سیاسی کھیل ختم

بھارتیہ جنتا پارٹی نے ایکتا یاترا کے نام پر جو پھوٹ ڈالو یاترا شروع کی تھی۔ وہ آخر کار ۲۶ر جنوری کو یوم جمہوریہ کے موقعہ پر سری نگر کے لال چوک میں ترنگا لہرانے کے ڈرامہ پر ختم ہوتی۔ پارٹی کے صدر مسٹر مرلی منوہر جوشی اور دیگر منتخب لیڈروں کو جموں سے ائرفورس کے ایک طیارہ میں سری نگر سے لایا گیا۔ اور وہاں لال چوک میں مسٹر جوشی نے جھنڈا لہرانے کے اپنے چیلنج کو پورا کر دکھایا۔ صورتحال یہ تھی۔ ایک طرف فوج اور پولیس کا زبردست پہرہ تھا۔ دوسری طرف فضا میں کشمیری جنگجوؤں کی گولیوں کی گونج تھی۔

ایکتا یاترا کے نام پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے اس سیاسی ڈرامہ کا مقصد محض سستی سیاسی مقبولیت حاصل کرنا تھا۔ یہ مقبولیت حاصل ہوئی یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا۔ لیکن یہ ڈرامہ ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا۔ تماشائیوں نے تالیاں نہیں بجائیں۔ اس ڈرامہ کو ناکام بنانے میں وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ کی ذہانت کام کر رہی تھی۔ بلاشبہ وزیر اعظم جیت گئے۔ اور بھارتیہ جنتا پارٹی ہار گئی تھی۔ مسٹر جوشی چاہتے تھے کہ حکومت انہیں سری نگر نہ جانے دے۔ جموں میں ہی انھیں اور ان کے

ساتھی یاتریوں کو گرفتار کرے۔ یا پھر یہ کہ وہ تمام یاتریوں سمیت سری نگر پہونچیں اور ہندوستانی رائے عامہ کو یہ تاثر دیں کہ وہ حکومت کے تمام دعووں کے باوجود یہ کام کر سکتے ہیں۔ اور کشمیری جنگجوؤں کو چیلنج کر کے جھنڈا لہرا سکتے ہیں۔ یہ دونوں مقصد حکومت نے پورے نہ ہونے دیئے۔ ان کی یاترا لم بن سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہاور بات ہے کہ راستے بند ہونے کا "حیلہ" کام آگیا۔ نہ ہی حکومت نے انہیں گرفتار کیا۔ بلکہ انہیں ایک خصوصی طیارہ میں بٹھا کر سرینگر لے جایا گیا۔ اور انہوں نے جھنڈا لہرانے کی رسم پوری کی۔

رام مندر کے مسئلہ کو لے کر مسٹر اڈوانی نے ایودھیا یاترا نکالی تھی۔ اس کے نتیجہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو چناؤ میں زبردست کامیابی ملی تھی۔ اسی کامیابی سے حوصلہ پاکر پارٹی نے ایکتا یاترا کا منصوبہ بنایا۔ چونکہ پارٹی کی اعلیٰ لیڈرشپ میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی ان کی پارٹی کو ابھی قومی پیمانہ کی پارٹی نہیں سمجھا گیا۔ ادھر وندھیاچل تک اس کی حدود ختم ہو جاتی ہے۔ اور ادھر بہار کی سرحد سے آگے اس کا کوئی وجود نہیں کیونکہ ایسا کوئی کام کیا جائے۔ جس سے ملک گیر سطح پر ان کی پارٹی کو مان لیا جائے۔ یہی سوچ کر ایکتا یاترا شروع کی گئی تھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی یاترا پنجاب اور ہریانہ سے تیز رفتاری سے گذری۔ پنجاب میں ایک علاقہ میں اس پر حملہ بھی کیا گیا اس طرح صحیح معنیٰ میں پورے شمالی ہند سے بھی یہ نہیں گذر سکی۔ یوں کنیاکماری سے کشمیر تک کی سیر کرنا ایک آسان بات ہے ہزاروں اشخاص روزانہ یہ سیر کرتے ہیں۔

ایکتا اور قومی اتحاد کا راز۔ یاترا میں نہیں ہے۔ ذہنیت اور جذبات سے ہے۔ ہندوستانیوں میں بطور قوم جو جذباتی یکجہتی اور ہم آہنگی ہونی چاہیئے۔ اس تک بھارتیہ جنتا پارٹی کی رسائی نہیں ہے۔ اس پارٹی کے نزدیک مسلمان، سکھ اور عیسائی "سیاسی اچھوت" ہیں اور ہریجن ویسے ہی اس پارٹی سے دور رہیں۔ نہ وہ اس میں بڑے پیمانہ پر آسکتے ہیں۔ اور نہ بھاجپا۔ جو دراصل سورن ہندوؤں اور سرمایہ داروں کی پارٹی ہے۔ اسے اپنے سینہ سے لگا سکتے ہیں۔ جس پارٹی کا یہ حال ہو وہ ملک میں قومی اتحاد کیسے لا سکتی ہے۔ اور جذباتی یکجہتی کیسے پیدا کر سکتی ہے ہاں وہ فرقوں کے درمیان دیواریں ضرور کھڑی کر سکتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سری نگر میں ترنگا لہرانے کا اسٹنٹ رچا کر بھاجپا نے بین الاقوامی رائے عامہ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آیا سری نگر میں ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ میں کوئی کمزوری ہے۔

پنجاب میں چناؤ

۱۹ فروری کو پنجاب میں اسمبلی اور لوک سبھا کے چناؤ ہو گئے۔ جیسا کہ توقع تھی کہ کانگریس کی جیت ہوگی۔ اسمبلی میں کانگریس دو تہائی سے زیادہ اکثریت سے جیت کر آئی ہے۔ دوسرے نمبر پر بہوجن سماج پارٹی اور تیسرے نمبر پر بھارتیہ جنتا پارٹی رہی۔ لوک سبھا کی ۱۳ اسیٹوں میں سے ۱۲ کانگریس لے گئی۔ اس طرح سیاسی الفاظ میں کانگریس نے میدان مار لیا۔ لیکن کیا اسے حقیقت میں جیت کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں کہ ایک چھوٹے اکالی دل (کابل گروپ) کے سوا تمام اکالی دھڑوں نے اس چناؤ کا بائیکاٹ کیا۔ اس چناؤ کو حقیقی چناؤ کہنا دشوار ہے۔ علاوہ ازیں چناؤ میں صرف ۲۵ فی صد ووٹنگ ہوئی۔ اس میں سے کانگریس کو صرف پندرہ فیصد ووٹ ملے۔ اس طرح پنجاب کی موجودہ سرکار وہاں کے پندرہ فی صد لوگوں کی نمائندہ ہے اسے فی الواقع پنجاب کی نمائندہ یا عوامی سرکار کہنا غلط ہے۔

اب جبکہ مسٹر بےانت سنگھ کی سرکردگی میں پنجاب میں، کانگریسی حکومت برسر اقتدار آگئی ہے۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ پنجاب کے مقدم مسائل کو حل کرے گی اور ریاست کے عوام کو جان و مال کا تحفظ دے گی۔ پنجاب میں گذشتہ پانچ برس سے صدر راج تھا۔ اس سلسلہ میں آئین میں ایک ترمیم بھی کی گئی تھی۔ لیکن اب چناؤ کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا تھا۔ درست ہے کہ چناؤ کے بعد ایک منتخب سرکار وجود میں آگئی لیکن کیا یہ پنجاب کے مسائل حل کر دے گی۔ اور وہاں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کو روک سکے گی۔ اس کا جواب ہاں میں نہیں دیا جاسکتا۔ پنجاب کا اصل مسئلہ امن و قانون کا مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ سیاسی مسئلہ بھی ہے۔ اور صوبائی حکومت ہو یا مرکزی، دونوں حکومتیں اسے حل کرنے میں اب تک بری طرح ناکام ہی ہیں خواہ ان کے دعوے اس کے برعکس ہوں سیاسی مبصروں کا خیال ہے کہ موجودہ حکومت کو دو اہم مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک تو دہشت گردی کا مقابلہ اور دوسرا مسئلہ سیاسی پارٹیوں یعنی چناؤ

کا بائیکاٹ کرنے والے اکالی دلوں کی سیاسی مہم کا۔ چونکہ یہ پارٹیاں نئی حکومت کو "سکھ دشمن" قرار دے کر کوئی بھی تحریک شروع کر سکتی ہیں۔ جہاں تک دہشت گردی کا تعلق ہے۔ اب یہ بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ آج سے دس برس پہلے جب اس کا آغاز ہوا ہوا تھا۔ اس وقت قتل کی ایک دو واردات پر بھی ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔ عوامی ردعمل بھی سخت ہوتا تھا۔ اب دہشت گردی کا اور ڈھنگ ہے۔ وہ پنجاب کا طرز زندگی بن چکا ہے اب پنجاب میں دہشت گردی ایک انڈسٹری ہے ۱۹۸۴ء میں آپریشن بلیو اسٹار سے پہلے جنگجوؤں کے پاس صرف تھری ناٹ تھری رائفلیں ہوتی تھیں اب ان کے ہاتھوں میں اے کے ۴۷ رائفلیں۔ اعلیٰ قسم کے وائرلیس۔ اور ایسے وائرلیس ہیں جو فون پر ہونے والی بات چیت بھی پکڑ لیتے ہیں۔ ریموٹ کنٹرول ہے۔ جس سے کافی فاصلہ سے بم داغے جا سکتے ہیں راکٹ لانچر ہیں۔ روسی ساخت کی رائفلیں ہیں۔ جن میں طاقتور دوربین نصب ہیں۔ پنجاب میں ہلاکت انگیزی اور خوں ریزی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ گذشتہ دو برسوں ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء میں ۵۰۵۸ قتل کئے گئے۔ یہ تعداد تقریباً گذشتہ ۱۲ برسوں میں ہوئے کل ہلاک شدگان کی تعداد یعنی ۵۰۷۰ کے برابر رہے۔ موجودہ سرکار اس لہر کو کس طرح روکے گی۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اسکے بعد آئے گا ان سب سے سکھ انتہا پسندوں اور کچھ اکالی پارٹیوں کو خالصتان کے نعرہ سے کس طرح باز رکھا جائے ان تمام سوالوں کے جواب مستقبل کے پردہ میں پوشیدہ ہیں۔

گذارش

نکاح کے لئے مرد اور عورت کا انتخاب

اسلامی شریعت پر ایک نظر

پہلی قسط

از: مولانا محمد شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور

ازدواجی زندگی کی اہمیت

شادی بیاہ کرکے گھر گرہستی کی زندگی گزارنا دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے ایک اچھا اور صحیح اقدام ہے۔ ازدواجی زندگی سے نہ صرف دنیوی منافع حاصل ہوتے ہیں بلکہ روحانی اعتبار سے انسان کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ خود زہد و عبادت کے لئے بھی دل کی یکسوئی ضروری ہے جو نکاح کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے برعکس بہت سے زاہد مرتاض ایسے بھی گزرے ہیں جو عمر بھر ریاضت کرنے کے بعد کسی پری رو کے اسیر بن کر اپنی رہبانیت کو تیاگ دے چکے ہیں اور دربارِ حسن میں سجدہ ریز ہوکر اپنی شکست تسلیم کرچکے ہیں۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں تحریر کیا ہے کہ نکاح کے پانچ فوائد یا مقاصد ہیں:

۱۔ شیطان سے بچاؤ اور شہوت کو توڑنا، تاکہ اس کے ذریعہ نگاہ نیچی رکھنے اور پاکیزہ زندگی گزارنے میں مدد مل سکے۔

۲۔ اولاد کا حصول، جوکہ نکاح کا اصل مقصد ہے۔

۳۔ نفس کو راحت پہنچانا، تاکہ اس کے ذریعہ عبادت و بندگی میں تقویت حاصل ہوسکے جیساکہ قرآن مجید میں تصریح کی گئی ہے۔ وَمِنْ آیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً لِتَسْکُنُوا اِلَیْھَا: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرسکو (روم: ۲۱)

۴۔ قلب کو خانہ داری کے انتظام کے لئے فارغ کرنا۔ تاکہ وہ خوش دلی کے ساتھ

گھریلو اسباب کی فراہمی پر آمادہ ہو سکے۔ اگر انسان میں جنسی شہوت نہ ہوتی تو بھی اس کے لئے گھر میں تنہا زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا۔

۵۔ اہل و عیال کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی تربیت و اصلاح میں نفس کو مجاہدہ اور ریاضت میں ڈالنا اور اولاد کی پرورش کے لئے کسب حلال کی راہ میں مشقت برداشت کرنا۔[1]

رشتہ داری کے لئے کیسا آدمی چاہئے؟

نکاح کے ذریعہ دو اجنبی افراد (مرد اور عورت) کو ایک بندھن میں باندھ کر انھیں ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ازدواجی (گرہستی) زندگی گزارنے کے لئے سب سے پہلا مسئلہ ایک رفیق حیات کے انتخاب کا آتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت تاکہ زندگی کے ہر موڑ پر ایک دوسرے کے ہمدم و ہمسفر بن کر مذکورۂ بالا فوائد حاصل کریں اور ایک دوسرے کے ساتھی بن کر زندگی کو کامیاب بنائیں۔ کیونکہ زندگی محض عیش و عشرت کا نام نہیں بلکہ دنیا و آخرت کی بھلائیوں کو سمیٹنے کا نام ہے۔ لہٰذا مرد اور عورت دونوں کے انتخاب میں کافی سوچ بچار سے کام لینا چاہئے۔

مگر موجودہ دور میں لوگ شادی بیاہ کے لئے عموماً مالدار یا کھاتے پیتے لڑکوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور اخلاق و دینداری کی طرف بہت کم توجہ مبذول کرتے ہیں۔ شریعت کی نظر میں اس کے برعکس اخلاق و دینداری کی زیادہ اہمیت ہے اور یہ حقیقت قرآن مجید اور حدیث نبوی دونوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے: وَانْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ؛ اور تم میں جو بے نکاحی (مرد اور عورتیں) موجود ہیں ان کے نکاح کر دیا کرو۔ اور اسی طرح تمھارے غلاموں اور لونڈیوں میں جو

---

[1] خلاصہ از احیاء العلوم ۲/۲۲-۳۱۔ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت

... ان کے بھی۔ اگر وہ لوگ (اس وقت) مفلس ہیں تو اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی بنا دے گا۔ (نور ۳۲)

اس آیت کریمہ میں دو اہم مسائل بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ مسلم معاشرہ میں جو مرد اور عورتیں بے نکاحی ہیں ان کا نکاح کرا دینا چاہیے۔ لفظ "ایامٰی" بے نکاحی مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور اس لفظ کی وسعت میں کنواری لڑکیاں، مطلقہ عورتیں اور بیوائیں سب شامل ہیں[۱]۔

۲۔ اگر ایسے بے نکاحی مرد اور عورتیں غریب اور بے سہارا ہوں مگر وہ عادات و اطوار کے اچھے ہوں تو پھر ان کی غربت کی پرواہ کئے بغیر ان کا نکاح کر دینا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنے فضل و کرم سے غنی یعنی خوشحال بنا دے گا جیساکہ احادیث سے اس موضوع پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ابن مسعود نے فرمایا التمسوا الغنیٰ فی النکاح مالداری (خوش حالی) نکاح میں تلاش کرو پھر آپ نے یہی آیت بطور دلیل پڑھی[۲]۔

اس سلسلے میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق کا فرمان ہے: اَطِیْعُوا اللّٰهَ فِیْمَا اَمَرَکُمْ بِهٖ مِنَ النِّکَاحِ یُنْجِزْ لَکُمْ مَا وَعَدَکُمْ مِنَ الْغِنٰی قَالَ تَعَالٰی اِنْ یَکُوْنُوْا فُقَرَاءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ نکاح کے بارے میں اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرو تو وہ تمہارے لئے مالداری کا اپنا وعدہ پورا کرے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اگر وہ غریب ہیں تو اللہ انھیں اپنے فضل سے مالدار بنا دے گا[۳]۔

نیز اس بارے میں خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے فرمایا اِبْتَغُوا الْغِنٰی فِی الْبَاءَۃِ؛ بعض مرفوع احادیث میں اس آیت کریمہ کی مزید تشریح و تفسیر اس طرح مذکور ہے اذا جاءکم من ترضون دینه وخلقه فانکحوه، الا تفعلوا تکن فتنة فی الارض

---

[۱] ملاحظہ ہو تفسیر کشاف ۶۳/۳، تفسیر کبیر ۲۱۰/۲۳ طبع جدید نیز تفسیر قرطبی ۲۳۹/۱۲

[۲] تفسیر قرطبی ۲۴۱/۱۲

[۳] ابن ابی حاتم منقول از کنز العمال، ۴۸۶/۱۶

[۴] مصنف عبدالرزاق و مصنف ابن ابی شیبہ، منقول از کنز العمال ۴۸۶/۱۶

فساد کبیر: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارے پاس ایسا شخص نکاح کا پیغام لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق سے تم راضی ہو تو اس کا نکاح کردو اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد برپا ہوگا۔[۶]

اَنْکِحُوا الصَّالِحِیْنَ وَالصَّالِحَاتِ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے مسلمانو تم نیک مردوں اور نیک عورتوں کا نکاح کردو[۷]

اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ۔ قَالُوْا مَا الْعَلَائِقُ؟ قَالَ مَا تَرَاضٰی عَلَیْہِ الْاَھْلُوْنَ: تم میں سے جو بے نکاحی مرد اور عورتیں ہیں ان کے نکاح کردو۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ کن شرائط کی بنیاد پر؟ فرمایا کہ جن پر تم ایک دوسرے سے راضی ہو سکو[۸]

دینداری کے ساتھ ساتھ اگر مال و دولت بھی ہو تو پھر سونے پر سہاگہ ہے مگر مال و دولت کو ہر حال میں اولیت دیتے ہوئے دینداری کو پس پشت ڈال دینا صحیح نہیں ہے لیکن اس معاملہ میں لوگ عموماً مالداری اور دنیا داری ہی کے شائق نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث نبوی میں اس حقیقت پر سے پردہ اس طرح اٹھایا گیا ہے: اِنَّ اَحْسَابَ اَھْلِ الدُّنْیَا، الَّذِیْ یَذْھَبُوْنَ اِلَیْہِ الْمَالُ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا والوں کا حسب جس کی طرف یہ دوڑتے ہیں مال ہے[۹] (حالانکہ اصل چیز دینداری ہے)

اس اعتبار سے اسلام میں اصل معیار اخلاق اور دینداری ہے اور یہی امام مالک کا مسلک ہے جو بعض صحابہ کرام سے بھی منقول ہے[۱۰] اس کے برعکس دیگر فقہائے کرام نے اس سلسلہ میں دینداری کے علاوہ نسب اور پیشہ کا بھی اعتبار کیا ہے[۱۱] مگر اس

۶۔ جامع ترمذی ۳/ ۳۹۵۔ سنن ابن ماجہ ۱/ ۶۳۲، مستدرک حاکم ۲/ ۱۶۵

۷۔ سنن دارمی ۲: ۲/ ۱۳۷

۸۔ السنن الکبریٰ بیہقی، الکامل ابن عدی منقول از کنز ۱۶/ ۳۲۲

۹۔ سنن نسائی ۲/ ۶۷۹، مستدرک حاکم ۲/ ۱۶۳، مسند احمد ۵/ ۳۵۳

۱۰۔ تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری از حافظ ابن حجر ۹/ ۱۳۲، مطبوعہ ریاض

سلسلے میں بھی احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے وہ حد درجہ ضعیف ہیں[١٢] اسی بناء پر احناف میں بعض جلیل القدر علما، مثلاً امام ابوالحسن کرخی اور امام ابوبکر جصاص رح بھی امام مالک اور امام سفیان ثوری کی ہمنوائی کرتے ہوئے نکاح میں کفاءت (نسب اور پیشے وغیرہ کے اعتبار سے برابری) کو معتبر نہیں مانتے[١٣]

حسب ونسب بمقابلۂ دینداری

حاصل یہ کہ اسلام میں حسب ونسب اور پیشوں وغیرہ کا کچھ زیادہ اعتبار نہیں ہے گو وہ بعض صورتوں میں معتبر ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے کوئی ضابطہ مقرر کرنا بڑا مشکل کام ہے اور اس سلسلے میں بعض فقہاء نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کی پابندی ہر حال میں ممکن نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اسے خود طرفین کی صواب دید اور بصیرت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں تو پھر جھگڑے کی کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی اور یہی بات بعض فقہا نے بھی کہی ہے۔ مثلاً شمس الائمہ سرخسی رح حنفی تحریر کرتے ہیں: وَاِذَا تزوّجت المرأۃ غیر کفوءٍ فرضی بہ احدُ الاولیاء جاز ذالك: اگر کوئی عورت غیر ہمسر (اپنے سے کمتر درجے کے شخص) سے نکاح کرلے اور اس کے سرپرستوں میں سے کوئی ایک اس بیاہ سے راضی ہو جائے

---

[١١] مرقات شرح مشکوٰۃ از ملا علی قاری ۳/۴۰۶، مطبوعہ بمبئی، نیز تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی از مولانا عبدالرحمن مبارکپوری ۴/۲۰۴، مطبوعہ دارالفکر۔

[١٢] دیکھئے عمدۃ القاری از علامہ بدرالدین عینی ۲۰/۸۷ مطبوعہ لاہور، نصب الرایہ از علامہ زیلعی ۳/۱۹۶-۱۹۷ مجلس علمی، کتاب الموضوعات از علامہ ابن جوزی ۲/۲۶۳، دار... اللآلی المصنوعہ از علامہ سیوطی ۲/۱۶۵ دارالمعرفۃ، الفوائد المجموعہ از علامہ شوکانی ص ۱۲ مطبعۃ السنۃ المحمدیہ۔

[١٣] ملاحظہ ہو فتح القدیر از علامہ ابن الہمام ۳/۱۸۷، ردّ المختار از علامہ ابن عابدین ۲/۳۴۵ مطبوعہ کوئٹہ نیز بدائع الصنائع از امام کاسانی ۲/۳۱۷ مطبوعہ کراچی۔

تو یہ بات جائز ہے[1]

اور ملا علی قاری حنفی تحریر فرماتے ہیں فان رضیت المرأۃ او ولیہا بغیر کفو صح النکاح : اگر عورت یا اس کا سرپرست ایک نابرابر شخص سے نکاح کے لئے راضی ہو جائے تو یہ نکاح صحیح ہو جائے گا[2]

اور یہی بات امام شافعی سے بھی منقول ہے کہ اس طرح نابرابری کا نکاح ناجائز حرام نہیں بلکہ عورت اور اس کے سرپرستوں کے لئے ایک ترغیب کی بات یہ ہے کہ ورنہ اگر وہ راضی ہوجائیں تو پھر نکاح صحیح ہو جائے گا۔ (وتوسط الشافعی فقال لیس نکاح غیر الاکفاء حراما فارد به النکاح، وانماهو تقصیر بالمرأۃ والاولیاء، فاذا رضوا صح[3])

ان توجیہات سے یہ مسئلہ بہت بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے۔ بہر حال قرآن مجید کی تصریح کے مطابق اس سلسلے میں اصل چیز تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم، اے لوگو ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمھیں (مختلف) قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (مگر) تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا پرست ہو (حجرات:۱۳)

اور اس اصول کی شرح و تفسیر بعض احادیث میں اس طرح مروی ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام تشریق کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: یا ایھا الناس اِنَّ ربکم واحدٌ وَاِنَّ اباکم واحدٌ الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربیٍ ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی

---

[1] المبسوط ۵/۲۶، مطبوعہ کراچی

[2] مرقاۃ شرح مشکاۃ ۳/۴۰۶، مطبوعہ بمبئی۔

[3] نیل الاوطار از علامہ شوکانی: ۶/۲۶۳، مطبوعہ ریاض

احمر الا بالتقویٰ: اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارے باپ (حضرت آدم علیہ السلام) بھی ایک ہیں ہاں تو جان لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی (غیر عربی) پر یا کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے نیز اسی طرح ایک گورے شخص کو ایک کالے پر یا ایک کالے کو کسی گورے پر بھی کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے[۱۷]

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ، فَلَا فَضْلَ عَرَبِیٍّ عَلَی اَعْجَمِیٍّ، وَلَا اَحْمَرَ عَلَی اَسْوَدَ، إِلَّا بِالتَّقْوَیٰ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب ایک اور تمہارا باپ ایک ہے لہٰذا کسی عربی کو کسی غیر عربی پر یا کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے[۱۸]

وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَہٗ انْظُرْ فَإِنَّکَ لَسْتَ بِخَیْرٍ مِنْ اَحْمَرَ وَلَا اَسْوَدَ إِلَّا اَنْ تَفْضُلَہٗ بِتَقْوَیٰ:۔ حضرت ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ دیکھو تم کسی گورے کالے شخص سے بہتر نہیں ہو بجز اس کے کہ تم تقویٰ میں اس سے بڑھ جاؤ[۱۹]

یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ إِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ نَخْوَۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَتَعَظُّمَھَا بِالْآبَاءِ النَّاسُ مِنْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ تَلَا: یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ .. ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے گروہِ قریش! اللہ نے تم سے زمانۂ جاہلیت کے گھمنڈ اور باپ دادا پر فخر کرنے کی لت کو تم سے دور کر دیا۔ تمام لوگ آدم سے ہیں اور

---

[۱۷] مسند احمد ۵/۴۱۱، دار الفکر بیروت، واسنادہ صحیح (زاد المعاد ۵/۱۵۸)
[۱۸] رواہ الطبرانی والبزار، ورجال البزار رجال الصحیح، مجمع الزوائد: ۸/۸۴
[۱۹] رواہ احمد ورجالہ ثقات، مجمع الزوائد: ۸/۸۴
[۲۰] ابوداؤد کتاب الادب ۵/۳۴۰، ترمذی ابواب المناقب ۵/۳۹۰، مسند احمد ۲/۳۶۱

آدم مٹی سے تھا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے ... [۱۱]

اس موضوع پر علامہ ابنِ قیم نے زاد المعاد میں کافی اچھی بحث کرتے ہوئے اس سلسلے کی بعض دیگر قرآنی آیات سے بھی استدلال کیا ہے، جو بڑی فکر انگیز ہیں[۱۲]

رسول اللہ صلعم کا طرزِ عمل

قرآن اور حدیث کی ان صراحتوں کے بعد اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کو دیکھا جائے اور آپ کی سنت مطہرہ پر نظر ڈالی جائے تو حقیقتِ حال پوری طرح واضح ہو جاتی ہے چنانچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "حسب ونسب" کے اس بت کو توڑنے کے لئے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب بنتِ جحش (جو عبد المطلب کی نواسی اور ہاشمی خاندان کی ایک فرد تھیں) کا نکاح زید بن حارثہ سے کر دیا تھا جو نہ صرف آپ کے آزاد کردہ غلام (مولیٰ) تھے۔ اگرچہ وہ عربی الاصل تھے[۱۳] مگر ان دونوں کے درمیان نبھ نہ سکی اور بہت جلد طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت زینب کا نکاح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا۔ اور یہ واقعہ خود قرآن مجید میں بھی مذکور ہے

واضح رہے زمانۂ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے (متبنّیٰ) کا درجہ سگے بیٹے ہی کی طرح ہوا کرتا تھا اور منہ بولے بیٹے کی بیوی سگی بہو کی طرح تصور کی جاتی تھی۔ اس لئے اسلام نے اس غلط رسم کو توڑنے کے لئے یہ اقدام کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں تصریح موجود ہے: فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا۔ پھر جب زید نے اس سے (یعنی زینب سے) اپنی حاجت

---

[۱۲] دیکھئے زاد المعاد مرتبہ شعیب الارنؤوط ۵/ ۱۵۸/ ۱۶۱، موسسۃ الرسالۃ۔

[۱۳] ان کا سلسلۂ نسب امرؤ القیس سے ملتا ہے، ملاحظہ ہو الطبقات الکبریٰ از ابن سعد ۳/ ۴۰ دار صادر بیروت ۱۴۰۵ھ، نیز الاصابہ از ابنِ حجر ۱/ ۳۱، بیروت ...

پوری کرلی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا۔ تاکہ اہل ایمان پر ان کے منہ بولے بیٹوں کے بارے میں کوئی گناہ نہ ہو جب کہ وہ ان سے اپنی پوری حاجت پوری کرلیں۔ اور اللہ کا حکم ہو کر رہے گا (احزاب: ۳۷)

نیز قرآن مجید نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ کسی کو متبنّٰی بنا لینے سے وہ سگا بیٹا نہیں ہو جاتا، لہٰذا ایسے افراد کو ان کے اصل باپوں ہی کی طرف منسوب کیا جائے:
اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ: اپنے منہ بولے بیٹوں کو ان کے اصلی باپوں کے نام سے پکارو۔ اللہ کے نزدیک یہی بہتر انصاف ہے (احزاب: ۵)

اسی طرح حضرت زید بن حارثہ کے اس واقعہ میں ہمارے لئے کئی بصیرتیں موجود ہیں۔ پھر اس واقعہ کے بعد حضرت زید بن حارثہ نے قریش ہی کے بعض دیگر شرفاء کے گھرانوں سے بھی رشتہ ازدواج قائم کیا۔ مثلاً ان کا نکاح ام کلثوم بنت عقبہ سے، پھر درّہ بنت ابولہب بن عبدالمطلب سے اور پھر ہند بنت عوام (حضرت زبیر بن العوام کی بہن) سے ہوا[۲۳]

نیز اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید کا نکاح ایک قریشی عورت فاطمہ بنت قیس سے کر دیا تھا، حالانکہ ان کے لئے دو قریشی مردوں کا پیغام آچکا تھا جیسا کہ صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ فاطمہ بنت قیس سے نکاح کے لئے ابوجہم بن حذیفہ اور معاویہ بن ابوسفیان نے پیغام بھیجا تھا جو قریشی ہونے کے اعتبار سے فاطمہ بنت قیس کے لئے موزوں اور برابر کے لوگ تھے مگر اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اسامہ بن زید سے نکاح کرلیں اور اس طرح ان دونوں کا نکاح ہو گیا[۲۴] حالانکہ اپنے آزاد کردہ

---

[۲۳] زید بن حارثہ کے نکاح کا یہ واقعہ سنن دارقطنی ۳/۳۰۲ اور السنن الکبریٰ بیہقی ۷/۱۳۶ اور جامع الاصول از ابن اثیر ۱۱/۲۱۲-۲۱۱ میں بھی ملاحظہ ہو [illegible]

[۲۴] دیکھئے [illegible]

غلام کے بیٹے اور غیر قریشی تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نسب یا خاندان میں برابری رشتہ داروں کے لئے شرط نہیں ہے۔

اب رہا معاملہ پیشہ کا تو یہ بھی چنداں مضر نہیں ہے اور اخلاق و دینداری کے ساتھ اسے بھی بہت حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس سلسلے میں اصل چیز باہمی رضامندی ہے۔ اگر طرفین مطمئن ہوں تو کسی بھی پیشہ والوں سے رشتہ داری قائم کی جا سکتی ہے، چنانچہ اس بارے میں حسب ذیل حدیث دلیل راہ بن سکتی ہے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ اَبَا هِنْدٍ حَجَمَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الْیَافُوخِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: یَا بَنِی بَیَاضَةَ! اَنْکِحُوْا اَبَا هِنْدٍ وَاَنْکِحُوْا اِلَیْهِ وَقَالَ: وَاِنْ کَانَ فِیْ شَیْءٍ مِمَّا تَدَاوُوْنَ بِهٖ خَیْرٌ فَالْحِجَامَةُ: حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ ابوہند نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھنے لگائے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے نبی بیاضہ! ابوہند کا اپنے قبیلے میں نکاح کر دو اور اس کی لڑکیوں کے لئے نکاح کا پیغام بھیجو۔ پھر فرمایا کہ اگر تمہاری استعمال کیا نے والی دواؤں کوئی بہتر دوا ہو سکتی ہے تو وہ حجامت (پچھنے لگانا) ہے[۲۵]

حجامت کے اصل معنی پچھنے لگانے کے ہیں جس کا رواج زمانۂ قدیم میں تھا۔ اور پچھنے لگانے والے کو حجام کہا جاتا ہے۔ اس کا تعلق علاج و معالجہ سے ہے مگر ارد و

---

۲۴ ملاحظہ ہو صحیح مسلم کتاب الطلاق ۲/۱۱۱۴، جامع ترمذی کتاب النکاح ۳/۴۲۱ نیز السنن الکبریٰ البیہقی ۷/۱۳۶ اور سنن نسائی ۶/۶۳ و ۶۴۔

۲۵ ابوداؤد کتاب النکاح ۲/ ۵۷۹، مستدرک حاکم ۲/۱۶۴، السنن الکبریٰ بیہقی ۷/۱۳۶، سنن دارقطنی ۳/۳۰۰، صحیح ابن حبان ۷/۴۷۱، بلوغ المرام از حافظ ابن حجر ص ۲۰۹ دار الفکر۔ امام حاکم نے اس حدیث کو امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح بتایا ہے اور حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ اس کی سند جید ہے اور تلخیص میں اس کی اسناد کو حسن بتایا گیا ہے۔

زبان میں حجام کے معنی نائی کے ہیں۔ جو عربی زبان کے حجام سے بہت مختلف ہے۔
بنو بیاضہ انصار کا ایک قبیلہ تھا اور ابو ہندجن کا اصل نام سالم تھا، اسی قبیلہ کے ایک مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے[۲۶] چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے پیشوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے مذکورۂ بالا قبیلہ والوں کو تاکید فرمائی کہ ایک پچھنے لگانے والے شخص (حجام) کو حقیر نہ جانیں۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ وہ ایک مولیٰ بھی تھے کیونکہ اہل عرب کے یہاں ایک مولیٰ سے رشتہ کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ نیز آپ نے اس کی بھی وضاحت فرما دی کہ پچھنے لگانا کوئی قبیح پیشہ نہیں بلکہ طبی اعتبار سے ایک معزز پیشہ ہے اور جہاں تک ابو ہند (سالم) کی دینداری کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ایک دوسری روایت میں ہے ان کی تعریف اس طرح مذکور ہے:

مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی مَنْ صَوَّرَ اللّٰہُ الْاِیْمَانَ فِیْ قَلْبِہٖ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ ھِنْدٍ: جس کو اس بات سے مسرت ہوسکتی ہے کہ وہ اس شخص کو دیکھے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان سے مزین کر دیا ہو تو ابو ہند (سالم) کو دیکھ لے[۲۷]۔

امام بخاری کا استدلال

نیز اس سلسلے میں امام بخاری نے ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے "باب الاکفاء فی الدین" یعنی برابری دینداری میں ہونا چاہئے اور اس باب میں موصوف نے جو حدیثیں درج کی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دین کے مقابلے میں حسب و نسب کا کچھ زیادہ اعتبار نہیں ہے چنانچہ ان حدیثوں کے مطابق مشہور بدری صحابی حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ نے اپنی بھتیجی ہند بنت ولید بن عتبہ (ایک قریشی عورت) کا نکاح سالم

---

[۲۶] ملاحظہ ہو شرح ابو داؤد از امام خطابی ۵۸۰/۲، نیز بذل المجہود از مولانا خلیل احمد سہارنپوری ۱۱۴/۱۰ مطبوعہ مکہ مکرمہ

[۲۷] سنن دار قطنی ۳۰۰/۳، مطبوعہ قاہرہ

نامی ایک آزاد کردہ غلام (مولیٰ) سے کر دیا تھا، جسے بعد میں انھوں نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب (قریشی عورت) کا نکاح مقداد بن اسود سے ہوا تھا۔ جو قریشی نہیں تھے بلکہ ایک قول کے مطابق حبشی مولیٰ تھے جن کو اسود نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا[۷۸]

نیز اس سلسلے میں امام بخاریؒ نے قول فیصل کے طور پر یہ حدیث بھی درج کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت سے بیاہ چار باتوں کی وجہ سے کیا جاتا ہے: اس کے مال کی وجہ سے، اس کے خاندان کی وجہ سے، اس کی خوب صورتی کی وجہ سے اور اس کی دینداری کی وجہ سے۔ تو دیندار عورت کو پسند کر لے[۷۹]

بہرحال صحابۂ کرام کے واقعات میں اس قسم کی مزید مثالیں ملتی ہیں مثلاً حضرت بلال کا نکاح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی بہن ہالہ بنت عوف سے ہوا تھا۔ حالانکہ حضرت بلال حبشی تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آنے سے پہلے حضرت سلمان فارسی پر پیش کیا تھا[۸۰]

فقہاء کا عام مسلک خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایک عورت کا ایک مرد سے رشتہ کرنے کے لئے علماء عام طور پر اس بات کے قائل ہیں کہ جس شخص سے رشتہ مقصود ہے اس کا چار باتوں میں عورت کا ہمسر ہونا ضروری ہے ۱۔ دین ۲۔ حریت ۳۔ نسب ۴۔ اور پیشہ، اور بعض نے جسمانی عیوب سے سلامتی اور خوشحالی کو بھی معتبر مانا ہے[۸۱] (باقی آئندہ)

۷۸ھ تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری از حافظ ابن حجر ۹/ ۱۳۳-۱۳۵، عمدۃ القاری از علامہ عینی ۲۰/ ۸۴، نیز السنن الکبریٰ ۷/ ۱۳۷ اور سنن نسائی ۶/ ۶۳-۶۴ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، نیز ملاحظہ ہو جامع الاصول ۱۱/ ۴۶۵-۴۶۸۔

۷۹ھ صحیح بخاری کتاب النکاح ۶/ ۱۲۳

۸۰ھ دیکھئے بلوغ المرام حواشی ص ۲۰۹، دارقطنی ۳/ ۳۰۲

۸۱ھ دیکھئے شرح خطابی، منقول از ابوداؤد کتاب النکاح ۲/ ۵۸۰۔

اولاد حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام

از۔ جناب غلام رسول مخلص بڑھ پورہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سرزمین اہواز میں بمقام سوس ہوئی پھر آپ کو والد بابل ملک نمرود میں لے گئے۔ یہود و نصاریٰ و مشرکین عرب سب آپ ہی فضل اور شرف کے معترف اور آپ کی نسل میں ہونے پر فخر کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح یا عازر تھا۔ عازر کو آذر بھی لکھتے ہیں۔ وہ بابل کے بادشاہ نمرود کا ایک مقرب درباری تھا۔ نمرود جیساکہ آپ کو معلوم ہے دنیا میں ظلم وستم کی حکومت اور رب ہے رحمانہ۔ استبداد کا موجد تھا۔ اس کی آنکھوں میں نور نہ تھا وہ خشک تھیں۔ آنکھیں بہت چھوٹی تھیں اور اس کے چہرے پر سیاہ داغ تھے۔ عازر کی بیوی کا نام اوشا تھا۔

حضرت ابراہیم حضرت نوح علیہ السلام کے دین وملت اور انہیں کے طریق وسنت پر ہیں دونوں حضرات علیہم السلام کے درمیان ۲۰۰۰ سال کا عرصہ ہے اس دور میں صرف دو نبی ہوئے ہود اور حضرت صالح۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بطن پاک سے تولد ہوئے۔ حضرت ہاجرہ مصری خاتون تھیں۔ جسے فرعون نے حضرت سارہ کو احترام وانعامات کے ساتھ ہدیہ میں دیا تھا۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیمؑ کی پہلی اہلیہ تھی۔ جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اور حضرت سارہ ہی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت ہاجرہ سے نکاح پر زور ڈالا تاکہ کوئی اولاد ہو سکے اور ذریت چلے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی سارہ کے کہنے پر حضرت ہاجرہ سے نکاح کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کے بطن سے ایک بچہ تولد ہوا جس کا اسماعیل

نام رکھا گیا۔ کچھ مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دوسرا بچہ دینے کا وعدہ فرمایا لیکن بچہ کی ماں حضرت سارہ ہوگی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی۔ اور اس کا نام اسحاق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ آپ کے ان دو بیٹوں سے دو قومیں بنیں گی۔ اور تین مذاہب کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ اس لئے تم ہاجرہ اور اسماعیل کو ملک فلسطین سے کہیں دور نئے ملک میں لے جاؤ۔ یہ واقعات اللہ تعالیٰ کے منصوبہ کا ایک اہم جز تھا کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذریت سے ایک بہت بڑے پیغمبر کو لانا تھا۔ جو لوگوں کو طرالمستقیم دکھائے گا۔ یہ پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہونگے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہلائیں گے اور یہ نبی آخرالزماں ہونگے۔ جس کی آرزو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کو کعبہ شریف کی تعمیر کرتے کرتے موجزن ہوئی تھی اور کعبہ شریف کی تعمیر مکمل کرنے کے بعد دونوں نے یہی دعا اللہ تعالیٰ سے کی تھی کہ اے رب اپنے محبوب آخرالزماں کو ہماری نسل سے ہی ظاہر فرما۔ اور یہ شرف ہمیں عنایت فرما۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت اسحاق کی نسل سے حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام دو برگزیدہ پیغمبر ہوں گے۔ یہ تھی جوازیت فلسطین کو چھوڑنے اور جس کے اسباب خود اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ہمراہ لے کر فلسطین سے ہجرت کر گئے۔ انہوں نے ایک طویل سفر طے کیا اور بالآخر وہ بکہ کی بے گیاہ وادی میں پہونچے۔ بکہ مکہ شریف کا پہلا نام تھا۔ یہ بکہ شہر ایک تجارتی روٹ تھا۔ اس وادی میں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ البتہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان دو کو بکہ میں چھوڑا اس وقت انہیں ایک پانی کی مشکیزہ دی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کی نگہبانی کرے گا۔ یہ تھوڑا سا آذوقہ کتنی دیر کفالت کرتا ختم ہوگیا۔ بچہ پانی کے لئے بے قرار ہوا اور نڈھال ہونے لگا نزدیک دو پہاڑیاں تھیں ایک پہاڑی صفا اور دوسری پہاڑی مروہ کہلاتی تھیں۔ بچہ کی کمزوری محسوس کرتے ہوئے حضرت ہاجرہ ایک پہاڑی پر پانی کی تلاش کے لئے چڑھ گئیں لیکن کہیں پانی کے آثار نظر نہ آئے۔ اس لئے وہ دوسری پہاڑی پر گئیں بہت جستجو کی پانی حاصل کرنے کے لئے مگر نا امید لوٹ آئیں۔ ادھر بچہ پانی کے لئے

تڑپ رہا تھا۔ وہ پھر پہلی اور پھر دوسری پہاڑی پر گئیں مگر مایوس ہو کر ہٹتیں اس طرح وہ ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک کل سات بار چکر کرتی گئیں۔ پھر نہایت اداسی اور بے کسی کی حالت میں بچہ کی طرف لوٹیں۔ بچہ کے نزدیک پہنچ کر آپ کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب آپ نے بچہ کے نزدیک ایک چشمہ نمودار ہوا پایا جس میں پانی موجزن تھا آپ کی خوشی انتہا کو پہونچ گئی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اور آپ نے اپنے بچہ کے ساتھ اسی چشمہ کے نزدیک رہنے کا ارادہ کیا۔ یہ چشمہ زمزم کہلایا۔ اس چشمہ کی برکت سے چشمہ کا ماحول تجارتی قافلوں کے لئے آرام لینے کا مقام بنا۔ اور ہوتے ہوتے مکہ شریف تجارتی منڈی کا ایک اہم مرکز بنا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کو دیکھنے کے لئے فلسطین سے وقتاً فوقتاً حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لایا کرتے تھے۔ اور ادھر حضرت اسماعیل علیہ السلام طاقتور ہوتے گئے۔ اس قسم کے ایک سفر کے دوران اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ دونوں کعبہ شریف کی از سر نو تعمیر کا کام ہاتھ سے لیں۔ دنیا کی پہلی جگہ کعبہ ہے جہاں اللہ کی عبادت شروع ہوئی۔

وقت گذرتا گیا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذریت بھی بڑھتی گئی۔ ذریت اتنی بڑھی کہ وہ کئی قبیلوں میں بٹ کر سارے ملک عرب میں پھیل گئی۔ ان میں سے ایک قبیلہ قریش کہلایا اس قبیلہ کے لوگ کبھی مکہ سے باہر نہ گئے۔ اور اس قبیلہ کے لوگ ہمیشہ کعبہ شریف کے قریب مسکن ہوئے۔

قریش قبیلہ کا بزرگ قبیلہ کا سردار ہوتا تھا۔ اس کے ذمہ کئی فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔ ان میں ایک اہم فریضہ یہ ہوتا تھا کہ باہر سے آئے ہوئے حاجیوں کی دیکھ بھال کرنا۔ اور انکے کھانے اور پینے کا انتظام کرنا۔ یہ ایک قابل فخر خدمت تھی۔ اور سردار قبیلہ یہ خدمت انجام دینے پر بہت ناز کرتا تھا۔ لیکن کچھ صدیاں گذرنے کے بعد عرب کے لوگ اللہ کی عبادت کرنے سے منحرف ہوئے اور مختلف ممالک سے جہاں وہ تجارت کی غرض سے جاتے تھے اپنے ساتھ بت لانے لگے اور یہ بُت انہوں نے خانہ کعبہ میں رکھے۔ خانہ کعبہ اب انکی نظروں میں اللہ کا گھر نہ رہا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام نے سوچا تھا۔ تاہم عرب کے لوگ خانہ کعبہ کا احترام کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں قریش کا سردار قصّی نامی تھا۔ وہ مکہ کا حکمران بنا۔ وہ خانہ کعبہ کی کنجیاں اپنی تحویل میں لے گیا۔ اور اس نے حاجیوں کی دیکھ بھال کرنا ان کے طعام و مشارب کا انتظام بھی

خود کرنے لگا۔ اور اجلاس بلاتا تھا۔ اور جب کسی قبیلہ کے ساتھ لڑنا مقصود ہوتا تھا تو یہ اپنے قبیلہ کا جھنڈا آگے آگے اٹھاتا تھا اور اسی کے محل میں قریش قبیلہ اپنے جھگڑے طے کیا کرتا تھا قصی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبد مناف قریش قبیلہ کا سردار بنا۔ عبد مناف کے بعد اس کا بیٹا ہاشم ہاشم کے عہد میں ہی قریش قبیلہ کے دو تجارتی قافلوں کا عرب سے باہر تجارت کرنے کے لئے بندوبست کیا گیا۔ ایک قافلہ موسم گرما میں شام شریف اور شمال کی جانب اور دوسرا قافلہ یمن اور جنوب کی طرف جانے لگا۔ اس بنا پر مکہ کی اہمیت بڑھ گئی تجارت میں ترقی ہوئی لوگوں کی معاشی حالت سدھر گئی اور مکہ تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز بنا۔ ایک موسم گرما میں ہاشم شمال کی طرف تجارت کا سامان خریدنے گیا۔ تاکہ سامان خرید کر اسے یمن میں فروخت کر سکے۔ راہ میں وہ یثرب میں تجارت کی چیزوں کی خرید و فروخت کرنے کے لئے قیام پذیر ہوا۔ وہاں اس نے ایک حسین عورت دیکھی۔ اس حسین عورت کا نام سلمٰی تھا اور بیٹی تھی امیر بن زید کی۔ امیر بن زید ایک معزز گھرانہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہاشم نے اس حسین عورت سے شادی کرنے کی درخواست ارسال کی۔ جو قبول ہوئی اس بنا پر کہ وہاں کے لوگ ہاشم کو ایک ذی عزت ہستی تسلیم کر چکے تھے شادی کے بعد اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ یہ بچہ خوبصورت تھا۔ اس کے کچھ بال سفید تھے اور لوگ اسے شیبہ کے نام سے پکارنے لگے، شیبہ کے معنی ہیں سفید بال والا۔

ماں بیٹا یثرب شہر میں رہے کیونکہ یثرب کی ہوا سرد، خوشگوار آب و ہوا اور صحت افزا مقام تھا۔ جبکہ ہاشم مکہ لوٹے لیکن وہ اکثر کاروان شمال کو لے جانا پسند کرتے تھے تاکہ بیوی اور بیٹے کی ملاقات ہو سکے۔ خیر اس قسم کے ایک سفر میں ہاشم علیل ہوگئے اور رحلت پا گئے۔

شیبہ جو نہایت خوبصورت، بڑا ذہین اور زیرک تھا ماں کے زیر سایہ یثرب میں پھلتا پھولتا گیا، اسے بہت ناز تھا ہاشم ابن عبد مناف کا بیٹا ہونے پر۔ جو قریش کا سردار خانۂ کعبہ کا سرپرست اور حاجیوں کا محافظ تھا۔ اگرچہ وہ اپنے باپ کو نہیں جانتا تھا کیونکہ ہاشم کی رحلت کے وقت وہ ایک ننھا منا بچہ تھا۔

ہاشم کی رحلت کے بعد المطلب برادر ہاشم نے قریش کی سرداری کا بوجھ، خانہ کعبہ کی سرپرستی اور حاجیوں کی نگہداشت کرنے کی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھائی۔ وہ اپنے بھتیجہ شیبہ کو دیکھنے

یثرب آ گئے تھے۔ جب شیبہ نے ہوش سنبھالا اتار چڑھاؤ سمجھنے لگا تو المطلب نے اسے مکہ لانے کی تیاریاں کیں۔ اگرچہ سلمیٰ کو شیبہ کی جدائی بہت شاق گذری تاہم وہ جانتی تھی کہ شیبہ کا مکہ جانا اس کی بھلائی اور بہبودی کے لئے ہے۔ چنانچہ شیبہ المطلب کی ہمراہی میں مکّہ کی طرف روانہ ہوتا ہے اور جب ان کی سواری کا اونٹ مکہ پہونچا یہ دوپہر کا وقت تھا اور لوگوں نے المطلب کے پیچھے اونٹ پر شیبہ کو دیکھا وہ سمجھ گئے کہ یہ المطلب کا غلام ہوگا اس لئے انہوں نے اس لڑکے کو عبدالمطلب کے نام سے پکارا۔ عبد جیسا کہ آپ جانتے ہیں عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں غلام کے لیکن المطلب نے انہیں (لوگوں) بتایا کہ یہ لڑکا غلام نہیں بلکہ میرا بھتیجا ہے جو اب ہمارے ساتھ قیام کرے گا۔ لیکن لوگ ہمیشہ انہیں (لڑکے) عبدالمطلب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایک سال المطلب تجارت کی غرض سے یمن گئے اور وہاں ہی وفات پا گئے۔ عبدالمطلب چچا کی جگہ قریش کا سردار تسلیم کیا گیا۔ وہ خاندان کا ایک معزز فرد تصور کیا جانے لگا۔ لوگ اسے پیار کرتے تھے۔ اور ان کی تعریف کرتے تھے۔ مگر وہ عرب اسے پسند نہ کرتے تھے۔ جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب کو خیر باد کہا تھا۔ اور بتوں کو پوجتے تھے۔

جیسا کہ پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کا نام حضرت ہاجرہ تھا ہاجرہ بادشاہ مصر کی بیٹی تھی۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بھتیجے حضرت لوط کو لے کر عراق سے نکلے اور شام شریف چلے گئے۔ یہ خدا کی راہ میں دوسری قربانی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی۔ اس قربانی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ساتھ دینے والا صرف ان کا بھتیجا حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ خدا کے پاک بندوں کے نزدیک دنیا کا کوئی رشتہ خدا سے زیادہ پیارا نہیں ہوتا۔ خیر یہاں قحط سالی ہوئی اور آپؑ اپنے بھتیجے اور بیوی کو مصر لے گئے۔ مصر کے بادشاہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدا پرستی اور نیکی معلوم ہوئی اور یہ رشتہ پیدا ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر تقریباً ستاسی سال کی تھی جب حضرت اسماعیل کی پیدائش واقع ہوئی۔ حضرت اسماعیل جوان ہونے لگے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا۔ خواب میں اس بیٹے کو قربان کرنے کا اشارہ تھا۔ آپ نے فرزند دلبر سے کہا اے بیٹے اللہ کا حکم ہوا ہے کہ میں

تجھے اس کی راہ میں قربان کروں اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے یہ آپ نے اس لئے کہا تھا کہ فرزند کو ذبح سے وحشت نہ ہو اور اطاعت امر الٰہی کے لئے وہ برغبت تیار رہوں چنانچہ اس فرزند ارجمند نے رضائے الٰہی پر فدا ہونے کا کمال شوق سے اظہار کیا۔ یہ واقعہ منیٰ میں ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرزند کے گلے پر چھری چلائی قدرت الٰہی کہ چھری نے کچھ کام نہ کیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ فرزند اسماعیل نہ تھے حضرت اسحاق تھے۔ لیکن دلائل کی قوت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور فدیہ میں اللہ تعالیٰ نے دنبہ بھیجا جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا۔ واقعۂ ذبح کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام تولد ہوئے ہیں۔

واقعۂ زمزم کے بعد قبیلہ جرہم نے اس طرف سے گذرتے ہوئے ایک پرندہ کو دیکھا انہیں پرندہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ بیابان اور پرندہ۔ یہ کیا ماجرا سوچنے لگے کہ ضرور یہاں کہیں پانی ہوگا تلاش میں نکلے کافی جستجو کی اور آخر زمزم شریف دیکھا پانی سے بھرا ہوا۔ اور قبیلہ کے لوگوں نے آپس میں شورہ کر کے زمزم کے قرب وجوار میں سکونت اختیار کرنے کے لئے حضرت ہاجرہ سے اجازت حاصل کرنے کی درخواست کی۔ حضرت ہاجرہ نے اس شرط پر رہنے کی اجازت دیدی کہ زمزم اور اس کے پانی پر قبیلہ کا کوئی حق نہ ہوگا۔ قبیلہ نے منظور کر لیا اور بعد میں اسی قبیلہ کی ایک حسین لڑکی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی ہوئی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے ایک سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر آئے ملاقات کرنے کی غرض سے حضرت اسماعیلؑ روزی کی تلاش میں کہیں گئے تھے اور جاتے وقت حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تاکید کی تھی کہ سواری سے نیچے نہ اترنا چنانچہ آپ نے بہو سے کہا میں نیچے اتر نہیں سکتا کوئی کھانے کی چیز ہو وہ مجھے کھانے کو پیش کرو۔ بہو نے جواب دیا کیا تم نہیں جانتے یہ ملک خشک ہے اور پیداوار سے خالی ہے آپ نے دودھ مانگا بہو بولی بھیڑوں کے پستانوں میں دودھ نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا جب تمہارا شوہر گھر آئے گا تو اس سے کہو کہ ایک آدمی اس شکل وصورت کا تمہیں ڈھونڈھنے آیا تھا اور اس نے آپ کے لئے ایک پیغام رکھا ہے وہ یہ کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل ڈالو۔ جب حضرت

اسماعیل علیہ السلام گھر لوٹ آئے اور بیوی سے پوچھا کوئی مہمان آیا تھا۔ بیوی نے جواب دیا ہاں ایک صاحب اس خدوخال اور شکل صورت کے آئے تھے اور جو گفتگو بیوی نے مہمان سے کی تھی بتایا اور یہ پیغام بھی سنایا کہ صاحب نے آپ کو کہہ رکھا ہے کہ گھر کی چوکھٹ بدل ڈالو، حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کا مطلب سمجھ گئے اور بیوی کو طلاق دیدی۔ یہ دنیا کی تاریخ میں پہلی طلاق ہے۔ جو آج تک قائم ہے۔ اس بیوی کو طلاق دینے کے بعد آپ نے عمالقہ کے قبیلے کے ایک آدمی مغاض نام کی لڑکی رعلہ سے شادی کی۔ یہ عمالقہ قبیلے کی خوشحالی اور آرام کی خبر سنکر یہاں بسنے آیا تھا حسب دستور ایک سال گذرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے سے ملاقات کرنے آئے۔ اس بار بھی حضرت سارہ نے اسے سواری سے نہ اترنے کی تاکید کی تھی۔ چنانچہ جب آپؑ اپنے بیٹے کے خیمہ پر پہونچے۔ تو آپ کی نئی بہو نے آپ کا گرم جوشی سے استقبال کیا سواری سے نیچے اترنے کی بار بار گذارش کی اور آپؑ نہ اترے۔ بہو نے لذیذ ضیافت پیش کی جو آپ نے تناول فرمائی۔ اور آپ کے پاؤں بستانے کے لیے دو بڑے پتھر لائے ان پر پاؤں رکھنے کی گذارش کی۔ پانی سے پاؤں دھویا، منہ دھلایا۔ بالوں کی کنگھی کی۔ تابعداری اور وفاداری کی باتیں کیں۔ حضرت ابراہیمؑ نئی بہو کے اس آؤ بھگت اور خاطر داری سے بہت محظوظ ہوئے اور کہا جب اسماعیل گھر لوٹیں گے تو ان کو کہنا کہ اس خدوخال اور چال ڈھال کے آدمی آپ سے ملنے آئے تھے وہ آپ کے نام یہ پیغام رکھ گئے ہیں کہ گھر کی دہلیز بہت اچھی ہے اور اسکو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی اچھی طرح نگہداشت اور پرورش کرنی چاہیئے۔

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیس سال کی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوا خانہ کعبہ کی تعمیر کرنے کا۔ آپ نے یہ خوشخبری حضرت اسماعیل کو دیدی۔ چنانچہ باپ بیٹا اس کار خیر میں جٹ گئے۔ زمین کھودی اور اس کی بنیاد پائی۔ نزدیک پہاڑ سے پتھر کاٹے اور ۳۰ گز لمبی ۲۴ گز چوڑی اور نو گز اونچی عمارت بنائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک پتھر کی صورت دکھا کر اس کی تلاش کا حکم دیا آپ نے حضرت اسماعیلؑ کو یہ پتھر تلاش کرنے کو کہا۔ وہ پہاڑ سے نیچے کھودنے لگے اور جب وہ کھودنے میں مصروف تھے تو ایک نورانی صورت کا فرشتہ سفید پتھر اٹھائے سامنے نظر آیا فرشتہ نے پتھر آپ کو دیا اور غائب ہوا۔

خلیل اللہ کو پتھر دکھایا اور باپ بیٹے نے اس پتھر کو ایک مخصوص مقام پر نصب کیا یہ پتھر حجراسود ہے جس کو ہم جیسے گناہ گار لوگوں نے چوم چوم کر کالا بنا دیا۔ تعمیر کعبہ مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں کو بلاؤ وہ ابو قیس پہاڑ پر چڑھے اور بلند آواز میں لوگوں کو خانہ کعبہ کی زیارت کرنے کو کہا۔ یہ آواز لاکھوں لوگوں کے کانوں میں آج بھی گونج رہی ہے اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان زیارت بیت اللہ کے لئے مکّہ شریف آتے ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد کے ساتھ اپنے اور اپنی نسل کے لیے مسلمان بنے رہنے کی دعا کی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ اے پروردگار! تیری رضا و خوشنودی کے لیے ہم دونوں کو مسلمان بنائے رکھ اور ہماری نسل میں بھی مسلمان قوم کا سلسلہ برقرار رکھ۔

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اپنی رفیقۂ حیات حضرت سارہ کے پاس گئے اور مستقل طور پر سکونت اختیار فرمائی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عرب میں ہی رہے۔

حضرت اسماعیل خدا پرست تھے اور صدیاں گذر گئیں ان کی اولاد دینِ ابراہیم بھول گئی عرب والوں نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ مکّہ کی شادابی دیکھ کر بہت سے قبیلے مکہ شریف میں آباد ہوئے مکہ کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر ایک قبیلہ کی کوشش تھی مکہ میں خانۂ کعبہ کے نزدیک رہے۔ مگر سب جگہ حاصل نہ کر سکے۔ دور دور انہیں جگہ مل گئی ۔ انہوں نے مٹی اور پتھر کے گھر بنائے۔ اور کعبہ شریف سے دور ہونے کی وجہ سے وہ کعبہ شریف کے پتھر کے ٹکڑے تبرکاً اپنے گھر لائے اور ان پتھر کے ٹکڑوں کو گھر کی دیواروں میں نصب کرتے گئے پھر ان پتھروں کے گرد گھر کے لوگ طواف کرنے لگے۔ گویا ان کی نظروں میں ان کا گھر اب خانۂ کعبہ تھا۔ اور ان ہی پتھروں کی پرستش کرنے لگے۔ اس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خدا کی پرستش کی اور ان کے بیٹوں نے پتھروں کی۔

فلسفۂ صیام

از۔ مولانا مفتی جمیل الرحمٰن قاسمی

رمضان کا مبارک مہینہ اطاعت عبادت رحمت مغفرت اور خیر و برکت کا مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں قرآن پاک نازل کیا۔ شب قدر ودیعت فرمائی، نیکیوں کا ثواب بڑھایا اور اپنی رحمت برکت اور مغفرت کے خزانے بندوں کے لئے کھول دیئے۔ اس مہینہ کی ریاضت و عبادت سے انسان پرہیزگاری اور نکوکاری کا خوگر بنتا ہے۔ اخلاق اور احسان کے مقام رفیع کو حاصل کرتا ہے اور نفس کی برائیوں اور فتنوں سے محفوظ رہنے اور نفس کی خواہشوں پر قابو پانے کا عادی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے!

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔ تاکہ تمہارے اندر پرہیزگاری پیدا ہو جائے۔ (البقرہ: ۱۸۳)

پرہیزگاری انسانیت کا جوہر ہے جو انسان کو کشادہ ظرف اور عالی مرتبت بناتی ہے۔ کائنات کی بیکراں وسعتوں تک ذہن و فکر کی پرواز ہوتی ہے۔ اور معاشرہ میں عزت و رفعت کا قابل قدر مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ ایمان قوی ہوتا ہے ارادے آہنی بنتے ہیں اور ضبط نفس کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

روزہ سے تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن کا کام انجام پاتا ہے۔ ظاہری پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ کبر و نخوت خود پسندی اور طمع و حرص کے جراثیم نابود ہوتے ہیں۔ جسم فاسد فضلوں سے پاک ہوتا ہے اور ایمان و یقین کی پختگی وسعت ظرف، کشادہ دستی اور مکارم اخلاق سے باطنی نورانیت تابندہ ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ہر شئی کی زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے۔ (ابن ماجہ)

تجھے اس کی راہ میں قربان کروں اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے یہ آپ نے اس لئے کہا تھا کہ فرزند کو ذبح سے وحشت نہ ہو اور اطاعت امرِ الٰہی کے لئے وہ برغبت تیار رہوں چنانچہ اس فرزند ارجمند نے رضائے الٰہی پر فدا ہونے کا کمال شوق سے اظہار کیا۔ یہ واقعہ منیٰ میں ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرزند کے گلے پر چھری چلائی قدرت الٰہی کہ چھری نے کچھ کام نہ کیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ فرزند اسماعیل نہ تھے حضرت اسحاق تھے۔ لیکن دلائل کی قوت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور فدیہ میں اللہ تعالیٰ نے دنبہ بھیجا جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا۔ واقعۂ ذبح کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام تولد ہوئے ہیں۔

واقعۂ زمزم کے بعد قبیلہ جرہم نے اس طرف سے گذرتے ہوئے ایک پرندہ کو دیکھا انہیں پرندہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ بیابان اور پرندہ۔ یہ کیا ماجرا سوچنے لگے کہ ضرور یہاں کہیں پانی ہوگا تلاش میں نکلے کافی جستجو کی اور آخر زمزم شریف دیکھا پانی سے بھرا ہوا۔ اور قبیلہ کے لوگوں نے آپس میں مشورہ کرکے زمزم کے قرب وجوار میں سکونت اختیار کرنے کے لئے حضرت ہاجرہ سے اجازت حاصل کرنے کی درخواست کی۔ حضرت ہاجرہ نے اس شرط پر رہنے کی اجازت دیدی کہ زمزم اور اس کے پانی پر قبیلہ کا کوئی حق نہ ہوگا۔ قبیلہ نے منظور کرلیا اور بعد میں اسی قبیلہ کی ایک حسین لڑکی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی ہوئی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے ایک سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر آئے ملاقات کرنے کی غرض سے حضرت اسماعیلؑ روزی کی تلاش میں کہیں گئے تھے اور جاتے وقت حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تاکید کی تھی کہ سواری سے نیچے نہ اترنا چنانچہ آپ نے بہو سے کہا میں نیچے اتر نہیں سکتا کوئی کھانے کی چیز ہو وہ مجھے کھانے کو پیش کردو۔ بہو نے جواب دیا کیا تم نہیں جانتے یہ ملک خشک ہے اور پیداوار سے خالی پھر آپ نے دودھ مانگا بہو بولی بھیڑوں کے پستانوں میں دودھ نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا جب تمہارا شوہر گھر آئے گا تو اس سے کہو کہ ایک آدمی اس شکل وصورت کا تمہیں ڈھونڈھنے آیا تھا اور اس نے آپ کے لئے ایک پیغام رکھا ہے وہ یہ کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل ڈالو۔ جب حضرت

اسماعیل علیہ السلام گھر لوٹ آئے اور بیوی سے پوچھا کوئی مہمان آیا تھا۔ بیوی نے جواب دیا ہاں ایک صاحب اس خدوخال اور شکل صورت کے آئے تھے اور جو گفتگو بیوی نے مہمان سے کی تھی بتایا اور یہ پیغام بھی سنایا کہ صاحب نے آپ کو کہہ رکھا ہے کہ گھر کی چوکھٹ بدل ڈالو۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کا مطلب سمجھ گئے اور بیوی کو طلاق دیدی۔ یہ دنیا کی تاریخ میں پہلی طلاق ہے۔ جو آج تک قائم ہے۔ اس بیوی کو طلاق دینے کے بعد آپ نے عمالقہ کے قبیلے کے ایک آدمی مفاض نام کی لڑکی رعلہ سے شادی کی۔ یہ عمالقہ قبیلے کی خوشحالی اور آرام کی خبر سنکر یہاں لینے آیا تھا حسب دستور ایک سال گذرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے سے ملاقات کرنے آئے۔ اس بار بھی حضرت سارہ نے اسے سواری سے نہ اترنے کی تاکید کی تھی۔ چنانچہ جب آپؑ اپنے بیٹے کے خیمہ پر پہونچے۔ تو آپ کی نئی بہو نے آپ کا گرم جوشی سے استقبال کیا سواری سے نیچے اترنے کی بار بار گذارش کی اور آپؑ نہ اترے۔ بہو نے لذیذ ضیافت پیش کی جو آپ نے تناول فرمائی۔ اور آپ کے پاؤں بستانے کے لئے دو بڑے پتھر لائے ان پر پاؤں رکھنے کی گذارش کی۔ پانی سے پاؤں دھویا۔ منہ دھلایا۔ بالوں کی کنگھی کی۔ تابعداری اور وفاداری کی باتیں کیں۔ حضرت ابراہیمؑ نئی بہو کے اس آؤ بھگت اور خاطر داری سے بہت محظوظ ہوئے اور کہا جب اسماعیل گھر لوٹیں گے تو ان کو کہنا کہ اس خدوخال اور چال ڈھال کے آدمی آپ سے ملنے آئے تھے وہ آپ کے نام یہ پیغام رکھ گئے ہیں کہ گھر کی دہلیز بہت اچھی ہے اور اسکو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی اچھی طرح نگہداشت اور پرورش کرنی چاہیئے۔

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیس سال کی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوا خانۂ کعبہ کی تعمیر کرنے کا۔ آپ نے یہ خوشخبری حضرت اسماعیل کو دیدی چنانچہ باپ بیٹا اس کار خیر میں جٹ گئے۔ زمین کھودی اور اس کی بنیاد ڈالی۔ نزدیک پہاڑ سے پتھر کاٹے اور ۳۰ گز لمبی ۲۴ گز چوڑی اور ۹ گز اونچی عمارت بنائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک پتھر کی صورت دکھا کر اس کی تلاش کا حکم دیا آپ نے حضرت اسماعیلؑ کو یہ پتھر تلاش کرنے کو کہا۔ وہ پہاڑ کے نیچے کھودنے لگے اور جب وہ کھودتے میں مصروف تھے تو ایک نورانی صورت کا فرشتہ سفید پتھر اٹھائے سامنے نظر آیا فرشتہ نے پتھر آپ کو دیا اور غائب ہو۔

خلیل اللہ کو پتھر دکھایا اور باپ بیٹے نے اس پتھر کو ایک مخصوص مقام پر نصب کیا۔ یہی حجر اسود ہے جس کو ہم جیسے گناہ گار لوگوں نے چوم چوم کر کالا بنا دیا۔ تعمیر کعبہ مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں کو بلاؤ۔ وہ ابو قیس پہاڑ پر چڑھے اور بلند آواز میں لوگوں کو خانہ کعبہ کی زیارت کرنے کو کہا۔ یہ آواز لاکھوں لوگوں کے کانوں میں آج بھی گونج رہی ہے اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان زیارت بیت اللہ کے لئے مکہ شریف آتے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد کے ساتھ اپنے اور اپنی نسل کے لیے مسلمان بنے رہنے کی دعا کی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ اے پروردگار! تیری رضا و خوشنودی کے لئے ہم دونوں کو مسلمان بنائے رکھ اور ہماری نسل میں بھی مسلمان قوم کا سلسلہ برقرار رکھ۔

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اپنی رفیقۂ حیات حضرت سارہ کے پاس گئے اور مستقل طور پر سکونت اختیار فرمائی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عرب میں ہی رہے۔

حضرت اسماعیل خدا پرست تھے اور صدیاں گذر گئیں ان کی اولاد دین ابراہیم بھول گئی۔ عرب والوں نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ مکہ کی شادابی دیکھ کر بہت سے قبیلے مکہ شریف میں آباد ہو گئے۔ مکہ کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر ایک قبیلہ کی کوشش تھی مکہ میں خانہ کعبہ کے نزدیک رہے۔ مگر سب جگہ حاصل نہ کر سکے۔ دور دور انہیں جگہ ملی گئی۔ انہوں نے مٹی اور پتھر کے گھر بنائے۔ اور کعبہ شریف سے دور ہونے کی وجہ سے وہ کعبہ شریف کے پتھر کے ٹکڑے تبرکاً اپنے گھر لائے اور ان پتھر کے ٹکڑوں کو گھر کی دیواروں میں نصب کرتے گئے پھر ان پتھروں کے گرد گھر کے لوگ طواف کرنے لگے۔ گویا ان کی نظروں میں ان کا گھر اب خانہ کعبہ تھا۔ اور ان ہی پتھروں کی پرستش کرنے لگے۔ اس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خدا کی پرستش کی اور ان کے بیٹوں نے پتھروں کی۔

فلسفۂ صیام

از: مولانا مفتی جمیل الرحمن قاسمی

رمضان کا مبارک مہینہ اطاعت عبادت رحمت مغفرت اور خیر و برکت کا مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں قرآن پاک نازل کیا۔ شب قدر ودیعت فرمائی۔ نیکیوں کا ثواب بڑھایا اور ابواب رحمت برکت اور مغفرت کے خزانے بندوں کے لئے کھول دیئے۔ اس مہینہ کی ریاضت و عبادت سے انسان پرہیزگاری اور نکوکاری کا خوگر بنتا ہے۔ اخلاق اور احسان کے مقام رفیع کو حاصل کرتا ہے اور نفس کی برائیوں اور فتنوں سے محفوظ رہنے اور نفس کی خواہشوں پر قابو پانے کا عادی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے!۔

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔ تاکہ تمہارے اندر پرہیزگاری پیدا ہو جائے۔ (البقرہ: ۱۸۳)

پرہیزگاری انسانیت کا جوہر ہے جو انسان کو کشادہ ظرف اور عالی مرتبت بناتی ہے۔ کائنات کی بیکراں وسعتوں تک ذہن و فکر کی پرواز ہوتی ہے۔ اور معاشرہ میں عزت و رفعت کا قابل قدر مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ ایمان قوی ہوتا ہے ارادے آہنی بنتے ہیں اور ضبط نفس کا جذبہ بیدار رہتا ہے۔

روزہ سے تزکیۂ نفس اور تطہیر باطن کا کام انجام پاتا ہے۔ ظاہری پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ کبر و نخوت خود پسندی اور طمع و حرص کے جراثیم نابود ہوتے ہیں۔ جسم فاسد فضلوں سے پاک ہوتا ہے اور ایمان و یقین کی پختگی وسعت ظرفی، کشادہ دستی اور مکارم اخلاق سے باطن نورانیت تابندہ ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ہر شئی کی زکوٰۃ ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے۔ (ابن ماجہ)

روزہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے خالص ایک باطنی اور معنوی عبادت ہے اس عبادت کا کوئی ظاہری روپ نہیں ہے بندہ صرف اپنے خالق کی خوشنودی کے لئے بھوکا پیاسا رہتا ہے۔ اور خواہشات کو قابو میں رکھتا ہے۔ اس لئے اس عبادت کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود بندوں کو عطا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے !

اولادِ آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے سوائے روزہ کے۔ کہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔ روزہ ایک ڈھال ہے۔ جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو اسے بدکلامی سے بچنا چاہیئے۔ مبادا کوئی سبّ وشتم اور گالی گلوج پر اتر آئے تو روزہ دار کو یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جانا چاہیئے کہ میں روزہ سے ہوں۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے۔ روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ اور عمدہ ہے ۔

روزہ دار کو دو خوشی حاصل ہوتی ہیں ایک افطار کی اور دوسری اپنے رب کے دیدار کی ۔

بندہ میرے لئے خورد و نوش اور خواہشات کو خیرباد کہتا ہے۔ اس لئے روزہ میرے واسطے ہے۔ اور میں ہی اس کی جزاء دوں گا۔ (بخاری)

روزہ تزکیۂ نفس اور پرہیز گاری کے ساتھ صبر کی شان بھی پیدا کرتا ہے۔ صبر مقبول ترین عبادت ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔ دل کھانے پینے اور صحبت کرنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ مگر بندہ خواہش کو پامال کر کے صبر کرتا ہے۔ اور یہ احساس کرتا ہے کہ میں روزہ دار ہوں۔ نظریں دیدہ زیب اور دلفریب نظاروں کی طرف اٹھنا چاہتی ہیں مگر بندہ ان کو روزہ کا حوالہ دے کر روک دیتا ہے۔ حریف کی گالم گلوج پر غضب جوش زن ہوتا ہے ہاتھ زدوکوب کے لئے بڑھنا چاہتے ہیں ۔ اور زبان بدکلامی کے لئے دراز ہونا چاہتی ہے مگر بندہ صبر کرتا ہے۔ اور بڑے سے بڑے طوفان سے یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ میں روزہ سے ہوں ۔

روزہ نکوکاری سچائی اور ایفاء عہد کا خوگر بناتا ہے۔ بندہ اپنے عمل سے ایمان میں صادق اور کردار میں پختہ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ سے آئین وفاداری کو پورا کر کے معاشرہ

میں راست باز اور پابندِ عہد بن جاتا ہے۔

روزہ سماج میں اتحاد اور تنظیم کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ ایک نظم اور ڈسپلن کے تحت ایک وقت پر سب لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ ایک وقت میں اجتماعی بندش عائد ہو جاتی ہے اور ایک ساعت پر سارے روزہ دار افطار کرتے ہیں۔ ایک منٹ کے لئے بھی کوئی آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ جس سے معاشی اور سماجی نظم کی وحدت کا پرداز قائم ہوتا ہے۔

روزہ امیر و غریب کے فرق کو بھی مٹاتا ہے۔ اور معتدل اقتصادی مساوات اور خیر خواہی کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ امراء اور خوشحال بھوکے اور غریب لوگوں کے درد اور تڑپ سے باخبر ہوتے ہیں۔ روزہ کی حالت میں فارغ البال احساس کرتے ہیں کہ ہم ایک مہینہ بھوک اور پیاس کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اور سماج کے پسماندہ بدحال لوگ اور ان کے معصوم بچے پورے سال بے روزگاری اور دانہ پانی سے محرومی کے لمحات گذارتے ہیں۔ تڑپتے ہیں بلکتے ہیں بھوک میں غم کھاتے ہیں اور پیاس میں غم کے آنسو پی کر وقت گذارتے ہیں۔ اور کوئی بندۂ خدا ان کے درد کا درماں کرنے کے لئے آگے نہیں آتا روزہ داران فاقہ مستوں کے کرب کا ادراک کرتا ہے اور دل میں ٹھان لیتا ہے کہ میں رمضان کے مہینہ میں بھوکا پیاسا رہ کر فاقہ مستوں کا ساتھ دے رہا ہوں۔ لیکن سال کے گیارہ مہینوں میں ان غریبوں اور بیکسوں کی امداد کر کے میں ان کو اپنا شریکِ حال بناؤں گا۔ میں خوشحال ہوں تو وہ بھی میری آمدنی اور دولت کا حصہ پاکر حال اور مستقبل میں خوشحالی اور شکم سیری کی زندگی گذاریں گے۔

اس طرح روزہ مواساۃ خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات موجزن کرتا ہے۔ اور بخل و طمع کو ختم کر کے سخاوت اور دریا دلی کا مزاج بناتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں دولت صرف چند افراد کی مٹھی یا چند سرمایہ داروں کی تجوری میں مقید ہو کر نہیں رہ جاتی۔ بلکہ سماج میں گردش کرتی ہے اور سماج کے تمام افراد حسبِ صلاحیت اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ روزہ دار رمضان کے مبارک مہینہ میں زکوٰۃ تقسیم کرتا ہے۔ اور عید کے پرمسرت موقع پر صدقۂ فطر ادا کرتا ہے۔ تقسیم ثروت کے اس معتدل اجتماعی نظام سے امیر و غریب کے درمیان نفرت اور دوری کی دیوار پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اور پورا معاشرہ خیر خواہی، ملنساری اور باہمی اشتراک و تعاون کا خوگر بن جاتا ہے۔

روزے کی ان باطنی روحانی اور اخلاقی خصوصیات کے علاوہ مادی اور جسمانی منفعت بھی مسلّمات میں سے ہے۔ روزہ جسم کو توانا اور تندرست بناتا ہے۔ اور فاسد رطوبتوں کو ختم کرتا ہے امراضِ خبیثہ رخصت ہوتے ہیں اور قلب و جگر کو نئی توانائی ملتی ہے۔ ابو نعیم نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا! روزہ رکھو تندرست رہو۔

یورپ کے حاذقین اور ماہرینِ صحت نے کہا ہے:

ایک مہینہ کا روزہ پورے سال کے اندر جسم میں جمع ہونے والے فاسد مادوں کو ختم کر دیتا ہے۔

سید رشید رضا مصری نے تفسیر "المنار" جلد اوّل میں لکھا ہے!

جو لوگ بسیار خوری کے عادی ہوتے ہیں اور مشقت کے کام بھی نہیں کرتے ایسے لوگوں کے جسم میں جمع شدہ فاسد مواد کو روزہ جلا دیتا ہے۔ مضر رطوبتوں کو کم کر دیتا ہے۔ آنتوں کی صفائی کرتا ہے۔ اور اس چربی کو پگھلا دیتا ہے جو دل کے لئے شدید خطرہ بن جاتی ہے۔

روزے کے یہ روحانی جسمانی اور اخلاقی فائدے ان خوش نصیبوں کو حاصل ہوتے ہیں جو روزہ کا حق ادا کرنے والے ہوں۔ خاص طور پر اکلِ حلال روزہ کی مقبولیت کے لئے شرطِ اوّل کا درجہ رکھتا ہے۔ سمگلری، فریب کاری اور جابرانہ لوٹ کھسوٹ سے روپیہ حاصل کرنے والے خاندان اور سماج کی حق تلفی کرنے والے رمضان اور صیام کی برکتوں اور رحمتوں سے لذت آشنا نہیں ہو سکتے۔ فسق و فجور اور لہو لعب میں مبتلا رہنے والے، گالم گلوچ کرنے والے، فخر و مباہات اور ریا و نمود کرنے والے بدبخت روزہ کے معنوی اور حقیقی فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ اور دونوں جہاں کی محرومی اور تہی دامنی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا!

بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنھیں روزہ سے بھوک پیاس کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ (نسائی)

امام غزالی نے فرمایا!

جو شخص روزہ دار ہونے کے باوجود گناہ کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو ایک محل تعمیر کرتا ہے اور ایک شہر کو ویران کرتا ہے۔

رمضان کے مبارک مہینہ میں گناہوں سے محفوظ رہنے کی عادت سے پورے سال گناہوں سے پاک صاف رہنے کا مزاج بن جاتا ہے۔ صفائی ستھرائی پاکیزگی اور پرہیزگاری انسانیت کے قیمتی جوہر ہیں جو بابرکت مہینہ کی ریاضت و عبادت سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس مہینہ کی قدر و منزلت اور طاعت و عبادت کی تکمیل، مطالبہ ہے ایمان و یقین کا۔ اور تقاضہ ہے عقل و شعور کا۔ چاہیئے کہ ہم سبقت اور پیش قدمی کریں۔ اور اپنے خالق کی خوشنودی اور دونوں جہان کی سرخروئی حاصل کریں۔

ختم شد

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم، قاعدہ نمبر ۸

۱۔	مقام اشاعت	اردو بازار جامع مسجد دہلی
۲۔	وقفہ اشاعت	ماہانہ
۳۔	طابع کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
	قومیت	ہندوستانی
۴۔	ناشر کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
	سکونت	۴۱۳۶، اردو بازار جامع مسجد دہلی
۵۔	ایڈیٹر کا نام	عمیدالرحمٰن عثمانی
	قومیت	ہندوستانی
	سکونت	۴۱۳۶، اردو بازار جامع مسجد دہلی
۶۔	ملکیت	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی

میں عمیدالرحمٰن عثمانی ذریعہ ہٰذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط) طابع و ناشر

عمیدالرحمٰن

وفد کا دورۂ ایودھیا

مرکزی حکومت نے قومی یکجہتی کونسل اور پارلیمنٹ کے کچھ ممبران پر مشتمل ایک وفد ایودھیا بھیجا تھا کہ وہاں بابری مسجد کے آس پاس ہونے والی تعمیرات کا جائزہ لے کر حکومت کو اپنی رپورٹ دے۔ شروع میں وزیر داخلہ مسٹر ایس۔ بی چوان بھی اس وفد میں جانے والے تھے۔ لیکن بعد میں ان کا نام واپس لے لیا گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس وفد کا بائیکاٹ کیا۔ وفد نے واپس آنے کے بعد وزیر داخلہ کو زبانی طور پر اپنی رپورٹ دیدی ہے چند دن بعد باقاعدہ طور پر وفد اپنی رپورٹ پیش کر دے گی۔ وفد کی اس رپورٹ کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ان تشویش ناک خبروں اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ بند ہو گا جو بابری مسجد کمپلکس کے بارے میں سامنے آرہی ہیں
بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھی اپنا وفد بھیجا تھا۔ یہ وفد مسٹر سکندر بخت کی سرکردگی میں گیا تھا اس نے واپس آکر جو رپورٹ دی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ یکطرفہ اور پارٹی کے حق میں ہے۔ اس لئے اس کی قدر و قیمت عوام کی نگاہ میں نہیں ہوگی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی اور یو۔ پی کی کلیان سنگھ حکومت کا اصرار اس پر تھا کہ پارلیمانی وفد ایودھیا کا دورہ نہ کرے اور اگر کرے تو فیض آباد کی مسجد کا دورہ نہ کرے، فیض آباد کی اس مسجد میں ایک بم دھماکہ ہوا تھا۔ یہ عجیب و غریب قسم کی شرط تھی۔ اور محسوس کرنے والے محسوس کر رہے تھے کہ اس میں کھلے تعصب کی بو آتی تھی۔ بھاجپا سرکار سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے لیکن بات اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھی۔ اصل مقصد تو ایودھیا سے ممبران پارلیمنٹ کو دور رکھنا تھا۔ بابری مسجد کے پاس محکمۂ سیاحت نے کئی ایکڑ زمین جو ایکوائر کی ہے۔ وہ

[illegible] کے لئے دی ہے۔ اور یہ امر اب یقینی ہو گیا ہے کہ اس زمین پر سیاحت کے نام سے کئی عمارتوں کی تعمیر شروع ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد رام مندر کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گا۔ رام مندر کے نام سے ایک بڑی دیوار خاص مسجد سے متصل بنائی جا چکی ہے۔ اب اس دن کا انتظار ہے کہ ہر طرح کے قاعدوں اور ضابطوں کو نظر انداز کر کے کب مسجد کا ڈھانچہ گرا دیا جائے اور یہ سارا قصہ ہی ختم کر دیا جائے اس سلسلہ میں عدالت میں زیر سماعت کیسوں کو بھی وقت آنے پر نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ادھر نئی دلّی میں بھاجپا کی لابی پوری طرح اس کے لئے کوشاں ہے کہ مرکز کو ہر طرح کی کارروائی سے روکا جائے۔ ایک دفعہ وزیر داخلہ نے یو۔ پی حکومت کو معمولی سی دھمکی دی تھی تو یہ لابی پنجے جھاڑ کر مرکزی حکومت کے پیچھے پڑ گئی تھی جب تک مرکز میں نرسمہا راؤ سرکار ووٹوں کے معاملہ میں بھاجپا کی محتاج رہے گی۔ وہ اسکا دباؤ بھی برداشت کرتی رہے گی۔ اس لئے مرکز سے کچھ زیادہ توقعات رکھنا بھی فضول ہے۔

یو۔ پی حکومت اگر چہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کو بات چیت کی دعوت دے چکی ہے مگر یہ برائے نام ہے۔ اب کھل کر یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ اسی طرح باتوں میں لگا کر یو۔ پی سرکار اپنا کام کرتی رہے گی۔ یو۔ پی سرکار کو ویسے بھی اس کام کی جلدی اس لئے ہے کہ وشو ہندو پریشد اس کام کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتا ہے۔ اندرونی طور پر بھاجپا اور وشو ہندو پریشد کے درمیان روز بروز اختلافات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ یو۔ پی سرکار اب اس کام میں تاخیر نہیں کرنا چاہتی۔ چونکہ اس سے نہ صرف یو۔ پی میں ان کا اقتدار برقرار رہے گا بلکہ سارے ملک کا اقتدار ہاتھ میں لینے کا منصوبہ بھی تکمیل کو پہونچے گا۔ یہ صورت حال ہے جس میں مسلمانان ہند پھنسے ہوئے ہیں۔ اس سے نکلنے کی کیا صورت ہے۔ مسلم قیادت کو اس بارے میں سوچنا چاہیئے۔

سیاست اور جرائم پیشہ

لوک سبھا کے اجلاس میں ممبران نے عام طور پر اس رائے سے اتفاق کیا کہ مختلف سیاسی پارٹیوں میں جرائم پیشہ عناصر گھس گئے ہیں اور یہ کہ ان عناصر سے سیاست کو نجات دلائی جانی چاہیئے۔

[illegible] اس احساس پہ ہی ایک شعر یاد آتا ہے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یوں تو سیاست میں معیار اور اصولوں کا زوال ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سے ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن گذشتہ ۲۰ برسوں میں سیاست اور جرائم کا رشتہ اتنا گہرا ہو گیا کہ عوام ان دونوں کو مترادف سمجھنے لگے۔ آیا سیاستداں خود جرائم پیشہ بن گئے۔ یا جرائم پیشہ لوگ سیاسی صفوں میں آگئے۔ اس کا پتہ تو کمیشن کے ذریعہ انکوائری کے بعد ہی چلایا جا سکے گا۔ لیکن تو علانیہ نظر آتی ہے کہ ہر سیاسی پارٹی میں جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ایک انگریزی کہاوت ہے۔ "ہر بدمعاش کی آخری پناہ گاہ سیاست ہے" یہ تو پہلے زمانہ کی بات ہے۔ اب بدمعاشی کا آغاز ہی سیاست سے ہوتا ہے۔ ہر سیاسی پارٹی "وقت ضرورت" کام آنے کے لئے جرائم پیشہ عناصر کو پروان چڑھاتی ہے۔ یہ جرائم پیشہ سیاستدانوں کے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں۔ اور سیاستداں بدلہ میں ان کے جرائم پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یوں دونوں کا کاروبار چل رہا ہے۔ علاوہ ازیں ہر سیاسی پارٹی نے اپنی ایک دفاعی لائن بنا رکھی ہے۔ اس دفاعی لائن میں مجرموں کو ہی بھرتی کیا جاتا ہے۔ یہ غنڈہ عناصر وقت آنے پر ان سیاسی پارٹیوں کی صف اول میں ہوتے ہیں۔ اور ترقی کر کے اوپر کی منزل تک بھی پہونچ جاتے ہیں۔ ہماری سیاست ان جرائم پیشہ عناصر سے اتنی آلودہ ہو چکی ہے کہ اس کے علاج کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہم ممبران لوک سبھا کے ممنون ہیں کہ ان کی نگاہ سیاست کے اس عیب پر پڑ گئی۔ ورنہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ اس معاشرہ میں ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ اور کہنے سننے کا کچھ فائدہ نہیں۔

یہ ایک دو دن کی بات نہیں۔ سالہا سال میں اس مرض نے یہ شکل اختیار کی ہے۔ اس بات کو کون نہیں جانتا کہ یو۔پی میں کئی ممبران اسمبلی ایسے ہیں۔ جن کا پس منظر انتہائی خراب ہے۔ کئی کئی فوجداری کیس پہلے سے ان کے خلاف چل رہے ہیں، ڈکیتی تک کے الزامات انکے خلاف ہیں۔ اسی طرح بہار میں کئی مافیا گروپ ہیں۔ ان گروپوں کے پیچھے برسراقتدار پارٹی ہے۔ یہ مافیا گروپ مزدوروں، کسانوں اور یونینوں کو کچلنے کے لئے بنائے گئے۔ بہار سے کبھی کبھی تشدد کے لرزہ خیز واقعات کی خبریں ملتی ہیں۔ ان میں کسی ایک یا دوسرے مافیا گروپ کا ہاتھ ضرور

بڑھتا ہے۔ اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر اور دوسرے صوبوں میں بھی پوزیشن اس سے مختلف نہیں ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ جس ملک میں سیاست گھٹیا پن پر اتر آئے وہاں ہر چیز پر زوال آجاتا ہے۔ قاعدوں، ضابطوں اور اخلاقی قدروں کے فروغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج قدروں پر مبنی سیاست کی بات کانوں کو عجیب سی لگتی ہے جب تک ملک میں اعلیٰ درجہ کی لیڈر شپ نہ ابھرے گی۔ اس مرض کا علاج ممکن نہیں۔

ماہ رمضان اور تربیت

الحمدللہ مسلمانانِ ہند بلکہ مسلمانان عالم نے ماہ رمضان کو اس کے لوازم کے ساتھ گذارنے کا اہتمام کیا۔ ہماری مراد روزوں کی تکمیل اور رات میں تراویح کی پابندی سے ہے۔ مسلمانوں کی خاصی تعداد ماہ رمضان کی ان برکتوں اور نعمتوں سے بہرہ یاب ہوئی۔ ہاں کچھ ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے یہ مہینہ غفلت میں گذارا۔ ان کے لئے ہم دعائے خیر ہی کرسکتے ہیں۔

ماہ رمضان ہمیں کیا سبق دیتا ہے۔ اس میں بنیادی سبق ایک ہی ہے۔ خداوند تعالیٰ کی اطاعت۔ اس ایک ماہ میں نفس کو امور دین کا پابند بناکر ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ لازم ہے کہ اگلے گیارہ مہینوں میں بھی اسے برقرار رکھیں۔ ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سب باتوں سے بے نیاز ہے۔ اسے ان میں سے کچھ نہیں پہونچتا۔ مقصود تو ہمارا امتحان لینا ہوتا ہے۔ رضائے الٰہی کے امیدوار کی حیثیت سے ہمیں اس امتحان میں پورا پورا اترنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

کیا ہم نے روزہ میں یہ محسوس کیا کہ ہمارے پڑوسی کا پیٹ بھی بھرا ہے؟ کیا ہم نے عید کے موقعہ پر یہ محسوس کیا کہ جس طرح ہمارے اور ہمارے اہل خانہ کے بدن پر زرق برق یا نئے ملبوسات تھے۔ آیا قوم کے غریب بچوں کے بدن پر بھی کپڑے ہیں۔ اگر ہم نے ماہ رمضان پانے کے بعد بھی اس راز کو نہیں پایا تو سمجھئے کہ اس ماہ کی سعادتوں میں سے ہمیں پورا حصہ نہیں ملا۔ ہمیں عہد کرنا چاہیئے کہ اگلے برس ماہ رمضان میں ہم یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے انشاء اللہ۔

شوکت علی فہمی کو اعزاز

نئی دلی۔ ۱۰ اپریل ایوان غالب نئی دلی میں منعقدہ ایک تقریب میں جن مختلف شخصیتوں کو ادب وصحافت اور شاعری کے شعبوں میں نمایاں خدمات کے لئے ایوارڈ ۱۹۸۹ء دیئے گئے۔ ان میں مفتی شوکت علی فہمی، کیفی اعظمی، ساحر ہوشیار پوری، شبیر احمد خاں غوری، جگیندر پال اور سید محمد مہدی کے نام نامی شامل ہیں۔ یہ اعزاز غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے بیگم عابدہ احمد کی نگرانی واہتمام میں دیا گیا۔

نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اپنے دست مبارک سے یہ انعامات تقسیم کئے۔

ادارہ برہان تمام انعام یافتگان اور خصوصاً مفتی شوکت علی فہمی ایڈیٹر دین دنیا کو اس عزت افزائی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ہمیں دلی مسرت ہے کہ مفتی صاحب کو اس اعزاز سے نوازا گیا۔

گذارش

جوابی امور وخط وکتابت نیز منی آرڈر کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ خریداری یاد نہ ہونے کی صورت میں کم سے کم جس نام سے آپ کا رسالہ جاری ہے اس کی وضاحت ضرور فرمائیں۔ چیک سے رقم نہ روانہ کریں صرف ڈرافٹ سے روانہ کریں۔ اور اس نام سے بنائیں۔ "برہان دہلی" "BURHANDELHI"

پتہ :۔ دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

نکاح کے لئے مرد اور عورت کا انتخاب

اسلامی شریعت پر ایک نظر

از: مولانا شہاب الدین ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور

دوسری قسط

یہ بات صرف مردوں کے انتخاب میں ہے۔ ورنہ عورتیں کفارت (ہمسری) میں اپنے سے بہتر افراد سے بھی نکاح کرسکتی ہیں۔ اور اس صورت میں عورتوں کے سرپرستوں کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ امام سرخسیؒ تحریر کرتے ہیں:

"واذا تزوّجتِ المراۃُ رجُلاً خیراً منھا فلیس للولی اَن یفرّق بینھما۔ لان الکفاءۃ غیرُ مطلوبۃٍ من جانبِ النساءِ۔ فانّ الولیّ لا یتعیّرُ بأنْ یکون تحتَ الرجلِ مَن لا تُکافئُہ۔" [1]

غرض جن علماء نے حسب ونسب کو معتبر مانا ہے ان کے نزدیک نسبی اعتبار سے ایک اونچے درجے کا شخص اپنے سے کمتر درجے کی عورت سے نکاح کرسکتا ہے۔ مگر ایک اعلیٰ درجے کی عورت کو ایک کمتر شخص سے نکاح کرنا ایک عیب کی بات ہے۔

بہرحال یہ عام فقہاء یا جمہور علماء کا مسلک ہے جو بعض خاص صورتوں میں معتبر ہوسکتا ہے ورنہ عمومی قانون وہی ہوگا جو قرآن، حدیث اور صحابہ کرام کے عمل سے پوری طرح ظاہر ہے واللہ اعلم [2]

---

[1] المبسوط للسرخسی: ۵/۲۹، مطبوعہ کراچی، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷م

[2] راقم سطور نے اس موضوع پر جو کچھ بھی تحریر کیا ہے وہ قرآن اور حدیث کے دلائل کی رو سے اپنی ذاتی رائے ہے۔

[illegible] عالم عربی عورت کا ہمسر ہو سکتا ہے؟

[illegible] کی کتابوں میں عام طور پر یہی لکھا ہے کہ ایک عجمی (غیر عربی) شخص ایک عربی عورت کا کفو [illegible] نہیں ہو سکتا خواہ وہ عالم یا سلطانِ وقت ہی کیوں نہ ہو لیکن فقہ حنفی کی سب سے زیادہ [illegible] معتبر کتاب ردّ المحتار میں مذکور ہے کہ ایک عجمی عالم علوی عورت کا ہمسر ہو سکتا ہے اسی طرح [illegible] عجمی عالم ایک جاہل مالدار کا بھی کفو بن سکتا ہے۔ کیونکہ علم کی فضیلت نسب کی فضیلت سے [illegible] کر ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا مرتبہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے بڑھ کر ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کا پایہ علمی اعتبار سے بہت اونچا تھا۔

قالوا الحسیب یکون کفواً للنسیب۔ فالعالم العجمی یکون کفواً للجاھل العربی والعلویۃ [illegible] شرف العلم فوق شرف النسب۔ وارتضاہ فی فتح القدیر۔۔۔ وذکر الخیرا [illegible] عن جمع الفتاوی العالم یکون کفواً للعلویۃ لأن شرف الحسب أقوی من شرف النسب۔ [illegible] هذا قیل ان عائشۃ أفضل من فاطمۃ لأن لعائشۃ شرف العلم۔ [1]

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ انسان کے لئے شرف و فضیلت کی اصل چیز اور اصل معیار علم اور دینداری ہے۔ اور جو شخص اس صفت میں فائق ہو جائے اس کا مقابلہ دنیا کی دوسری کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ چنانچہ قرآن اور حدیث میں علم اور اہل علم کی جو فضیلت آئی ہے وہ کسی دوسری چیز کی نہیں آئی۔ چنانچہ ایک موقع پر بطور سوال اہل علم کی فضیلت اس طرح ظاہر کی گئی ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (زمر: ۹) کہدو کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

عورت کا دوبارہ نکاح ایک مشکل مسئلہ

واضح رہے اگر کوئی عورت اپنے سے کمتر شخص (غیر کفو) سے نکاح کرلے تو فقہ حنفی کی رو

[1] ردّ المختار (فتاوی شامیہ) از علامہ ابن عابدینؒ ۲/۳۵۰ مطبوعہ کوئٹہ

ہے اس عورت کے سرپرستوں کو اس پر اعتراض کا حق حاصل رہتا ہے، جب تک کہ اس عورت کو بچہ نہ ہو جائے ؎ اور ایسی صورت میں عورت کے سرپرست ان دونوں کے درمیان "تفریق" کرا سکتے ہیں کیونکہ ایسے کمتر شخص سے نکاح کرنا ان کے لئے ایک عار کی بات ہے ؎ مگر ایسی کوئی بھی تفریق صرف قاضی کی عدالت ہی میں ہو سکتی ہے۔ اور جب تک قاضی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کردے طلاق اور وراثت وغیرہ کے احکام ان دونوں کے درمیان جاری رہیں گے۔ کیونکہ نکاح کی اصل عقد صحیح ہے لہٰذا صحت عقد میں اولیاء (سرپرستوں) کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔

ولا یکون التفریق بذلک الا عند القاضی۔ لأنه فسخ للعقد بسبب نقص۔ فکان قیاس الرد بالعیب بعد القبض۔ وذلک لا یثبت الا بقضاء القاضی۔ ولأنه مختلف فیه بین العلماء، فکان لکل واحد من الخصمین نوع حجة فیما یقول۔ فلا یکون التفریق الا بالقضاء۔ ومالم یفرق القاضی بینهما فحکم الطلاق والظهار والایلاء والتوارث قائم بینهما لأن أصل النکاح انعقد صحیحاً فی ظاهر الروایة۔ فانه لا ضرر علی الأولیاء فی صحة العقد۔؎

اس اعتبار سے عورت کے سرپرستوں کو اعتراض کرنے اور نکاح کو فسخ کرانے کا اختیار صرف ایک نظریاتی مسئلہ ہے اور عملی دنیا میں اس کا نفاذ انتہائی مشکل اور دشوار ہے۔ خاص کر ہندوستان جیسے ملکوں میں چونکہ کسی عورت کا نکاح عموماً صرف ایک بار ہوتا ہے اس لئے ایسے ملکوں میں اس قانون کا وجود اور عدم دونوں برابر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر عورت کے سرپرست کسی نہ کسی طرح بمشکل تمام ان دونوں کے درمیان تفریق کرانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو پھر ایسی "مطلقہ" عورت کا دوبارہ نکاح ایک مشکل ترین مسئلہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے اور عرب ممالک کے حالات بہت مختلف ہیں۔ دور اسلام میں حال یہ تھا کہ کسی عورت کی اگر طلاق ہو جاتی تو فوراً ہی اس کا نکاح ثانی ہو جایا کرتا تھا۔ اور ایسی مطلقہ عورتوں کو اس دور کے معاشرہ میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر آجکل ایسی

؎ دیکھئے ہدایہ مع العنایہ برحاشیہ فتح القدیر ۳/۱۶۰، مطبوعہ کوئٹہ (پاکستان)۔

؎ المبسوط للسرخسی ۵/۲۵-۲۶۔ مطبوعہ کراچی۔

؎ المبسوط ۵/۲۶۔

عورتوں کو ہندو رسم و رواج کی بنا پر حد درجہ منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے مسائل میں (جو عرف و عادات سے متعلق ہیں) دوبارہ غور کر کے ہماری فقہ میں اصلاح و ترمیم کرنے کی ضرورت ہے۔

عورت کا انتخاب

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ مرد کے انتخاب کے بارے میں تھا۔ اب رہا عورت کے انتخاب کا مسئلہ تو اس میں کفارت یا برابری (ہمسری) شرط نہیں ہے۔ مگر اس سلسلے میں کافی سوچ بچار سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ جس عورت یا جس دوشیزہ کو اپنا جیون ساتھی بنانے کے لئے منتخب کیا جا رہا ہے وہ اپنے معیار کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں جذباتی بن کر فیصلہ کرنا ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نکاح بار بار نہیں ہوتا۔ بلکہ ہندوستان جیسے معاشروں میں تو عموماً زندگی میں صرف ایک ہی بار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں پر دوسری شادی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ اگر اس کی نوبت آ بھی جائے تو عموماً "روکھی سوکھی" پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہندو رسم و رواج کی وجہ سے یہاں کا ماحول کافی بگڑا ہوا ہے۔ لہٰذا نکاحِ ثانی کے لئے دوبارہ کسی دوشیزہ یا کنواری لڑکی کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

اس سلسلے میں خود حدیث نبوی سے کافی رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ اپنی زندگی کو خوشگوار اور مسرت بخش بنانے کے لئے ہمیں کس قسم کی عورت کا انتخاب کرنا چاہیئے؟۔

عورت کے انتخاب کا غلط طریقہ

عورت کے انتخاب میں عام طور پر لوگ لڑکی کے اخلاق اور اس کی دینداری سے زیادہ اس کے مال و دولت یا اس کے حسن اور اس کی خوبصورتی کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ تو اس سلسلے میں بعض حدیثوں میں اس قسم کے رجحان کو غلط اور غیر تعمیری فعل قرار دیا گیا ہے۔ کسی عورت سے محض اس کے مال و متاع، حسن و خوبصورتی اور حسب و نسب کی بنا پر نکاح کرنا ایک غیر دانشمندانہ فعل ہے، جس کے نتائج آگے چل کر خراب نکل سکتے ہیں۔

مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا ذُلًّا، وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ

اِلَّا فَقْرًا، وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِحَسَبِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا دَنَاءَةً، وَمَنْ تَزَوَّجَ اِمْرَأَةً لَمْ يُرِدْ بِهَا اِلَّا اَنْ يَغُضَّ بَصَرَهُ، وَيُحْصِنَ فَرْجَهُ، اَوْ يَصِلَ رَحِمَهُ، بَارَكَ اللّٰهُ لَهُ فِيْهَا وَبَارَكَ لَهَا فِيْهِ :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے محض اس کی شہرت کی بناء پر نکاح کیا تو اللہ اسے ذلیل کرے گا۔ اور جس نے کسی عورت سے محض اس کے مال کی بنا پر بیاہ کیا تو اللہ اس کے فقر و محتاجی میں اضافہ کرے گا اور جس نے کسی عورت سے محض اس کے حسب و نسب کی بنا پر شادی کی تو اللہ اسے پست و حقیر کردے گا۔ اور جس نے کسی عورت سے نکاح اپنی نظر نیچی رکھنے، اپنی شرمگاہ کو برائی سے بچانے اور صلہ رحمی کی غرض سے کیا تو اللہ ایسے مرد اور عورت دونوں کو خیر و برکت سے نوازے گا۔ [1]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

لَا تَزَوَّجُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ، فَعَسٰى حُسْنُهُنَّ اَنْ يُرْدِيَهُنَّ وَلَا تَزَوَّجُوهُنَّ لِاَمْوَالِهِنَّ، فَعَسٰى اَمْوَالُهُنَّ اَنْ تُطْغِيَهُنَّ . وَلٰكِنْ تَزَوَّجُوهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ . وَلَاَمَةٌ خَرْمَاءُ سَوْدَاءُ ذَاتُ دِيْنٍ اَفْضَلُ :

عورتوں سے ان کے حسن و جمال کی بنا پر نکاح مت کرو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان کا حسن و جمال انہیں مغرور کردے۔ نیز تم عورتوں سے ان کی مالداری کی بنا پر بھی نکاح مت کرو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان کا مال انہیں سرکش بنا دے۔ لیکن تم ان سے ان کی دینداری کی بنا پر نکاح کرو (اور یاد رکھو) ایک کالی کلوٹی اور کن کٹی مگر دیندار لونڈی بھی البتہ افضل ہوسکتی ہے۔ [2]

عورت کے انتخاب کا صحیح طریقہ

عورت کے انتخاب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ عورت کی ظاہری خوبیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے

---

[1] ترغیب و ترہیب ۳/۴۶، رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ عبدالسلام بن عبدالقدوس وھو ضعیف، مجمع الزوائد ۴/۲۵۲

[2] ابن ماجہ ۱/ ۵۹۷، سنن سعید بن منصور ۲/ ۱۲۸، السنن الکبریٰ ۷/ ۸۰ ۔

سب سے پہلے اس کے باطنی خوبیوں کو ٹٹولنا چاہیئے۔ یعنی یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی سیرت و کردار اور اخلاق و عادات کا کیا حال ہے۔ اور وہ دین کی کس حد پابند ہے؟ دنیوی چیزیں تو آنی جانی رہا۔ ظاہر ہے کہ مال و متاع ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا عقل اور دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ عورت کے انتخاب میں دینداری کو اولیت دی جائے۔ قرآن اور حدیث میں صراحتاً و اشارتاً تاکید ہے کہ عورت کا انتخاب ایسا ہونا چاہیئے جس کے باعث وہ مرد کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے۔ اور اس کی دینداری میں اضافہ کا باعث ہو۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ: اور (رحمان کے بندے) وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہماری بیویوں اور بچوں کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا۔ (فرقان: ۷۴)

اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہوا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نیک بیویوں اور صالح اولاد کے عطا کئے جانے کی دعا کرتے رہنا چاہیئے۔ اور اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہم کو اپنی زندگی میں اس کی عملی جدوجہد بھی کرتے رہنا چاہیئے۔ اس اعتبار سے اس آیت کریمہ کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو بیاہ سے پہلے عورت کے انتخاب میں اس پہلو کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ حدیثوں میں اس آیت کریمہ کی شرح و تفسیر اس طرح آئی ہے:

تُنْكَحُ الْمَرْاَةُ لِاَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ[1]:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت سے چار باتوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کے مال کی وجہ سے، اس کے خاندان کی وجہ سے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کی دینداری کی وجہ سے۔ تو تم دیندار عورت کو منتخب کر لو۔[1] (باقی آئندہ)

---

[1] بخاری نکاح ۶/۱۲۳، مسلم رضاع ۲/۱۰۸۶، ابوداؤد نکاح ۲/۵۳۹، نسائی نکاح ۶/۶۸، ابن ماجہ نکاح ۱/۵۹۷، دارمی نکاح ۲/۱۳۳، کتاب السنن ۲/۱۲۵، مسند احمد (الفتح الربانی) ۱۶/۱۴۴، ابو یعلیٰ و بزار، مجمع الزوائد ۴/۲۵۴۔

احیائے علوم اسلامیہ
اور
شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ

پہلی قسط

(احسان اللہ فہد فلاحی، شعبۂ دینیات (سنّی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

مغل ہندوستان میں اکبری الحاد کے استیصال کے لئے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو مجاہدانہ اقدامات کئے تھے وہ ہندوستان کی تاریخ احیائے اسلام کا ایک روشن باب ہے۔ آپ نے اکبر کے دین الٰہی کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کے دربار کے صالح عناصر کو شریعت کا گرویدہ بنایا، بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کا فریضہ ادا کیا اور عوام میں غیر شرعی بدعات و خرافات سے نفرت پیدا کی۔ لیکن تاریخ اسلام کے محققین یہ بھول جاتے ہیں کہ سترہویں صدی میں مسلمانوں کی مذہبی، علمی اور سیاسی اصلاح و تربیت میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے آپ نے مسلمانان ہند کے بکھرے ہوئے شیرازے کو درس حدیث کے ذریعہ منظم کیا۔ ان میں دینی اور مذہبی احیاء کی لہر دوڑائی۔ شریعت سے محبت اور بدعت سے نفرت پیدا کی اور وہ خاموش مذہبی اور اصلاحی تحریک برپا کی جس کے نتیجے میں ہندوستانی سماج کی بنیادیں بدلیں فکر و عمل کے زاویئے بدلے اور اسلامی معاشرہ کو صحیح اصولوں پر منظم کرنے کا جذبہ بڑھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۵۵۱ء — ۱۶۴۵ء) ماہ محرم ۹۵۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد کا نام شیخ سیف الدین تھا۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ، اچھے شاعر اور پُرلطف اور بذلہ سنج انسان تھے۔ لوگ انکی ظرافت و لطافت، معاملہ فہمی اور محبت آمیز رویہ کے معترف تھے۔ شیخ محدث نے اپنے والد ماجد کے بارے میں خود ہی لکھا ہے کہ "شاعری، علم، مقبولیت ذوق و شوق، ظرافت، زہد، پاکیزگی، حضور قلب اور نکتہ سنجی میں اپنے عہد میں بے مثال تھے"[1] شیخ سیف الدینؒ ایک صاحب باطن اور

خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے فقر و غنا اور توحید کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ آپ تکلف و تصنع سے بالکل پاک تھے۔ شیخ محدث کا بیان ہے کہ "وہ قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ انھیں دنیا کی ثروت اور اسباب غنا کے حاصل کرنے کا کبھی شوق پیدا نہیں ہوا۔ دل کی توجہ تھی تو فقر و محبت کی طرف تھی" (۲) چنانچہ آپ نے اسی نہج پر شیخ محدث کی تربیت فرمائی۔ شیخ محدث کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور خیالات کے نشوونما میں آپ کے والد ماجد کا خاص حصہ رہا ہے۔
جب آپ تین چار سال کے ہوئے تو آپ کے والد ماجد شب و روز آپ کو آغوش میں لیکر آپ کی تربیت کرنے لگے۔ اور برسوں کی ریاضت نے جو ذہنی اور قلبی کیفیات آپ میں پیدا کر دی تھیں۔ ان کو شیخ محدث کے اندر منتقل کرنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود کے اسرار و حکم سے بچے کو واقف کرنا چاہتے لیکن جب کوئی نکتہ بچے کی سمجھ میں نہیں آتا تو تجربہ کار باپ یہ کہکر تسلی کر دیتا "انشاء اللہ رفتہ رفتہ پردہ از روئے کار بکشاید و جمال یقین روئے نماید" لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کرتا "لیکن باید کہ دایم دریں خیال باشند و ہر مقدار کہ دست دہد سعی کنید" (۳) شیخ سیف الدین کے تعلیمی نظریات بہت بلند تھے۔ تعلیم کا مقصد آپ کے نزدیک صرف ذہن کی جلا نہ تھی بلکہ اس سے دلی اور روحانی شیفتگی بھی پیش نظر تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنے بیٹے کے سینے میں منتقل کرنے کی پوری کوشش کی۔ شیخ محدث اپنے زمانۂ طفلی میں باپ کی تربیت کے سلسلے میں رقمطراز ہیں "زمانۂ طفلی میں والد ماجد نے مجھے حضرات صوفیہ کے اقوال بتائے اور ظاہری چیزوں کے ساتھ ساتھ باطنی تربیت کا بھی خیال رکھا۔ میں بھی آپ کے اقوال کا دلدادہ تھا۔ جب آپ خاموش ہوتے تو میں کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو بھول جاتا اور واقفان اسرار کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کی استدعا کرتا ان میں سے بعض باتیں اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک مجھے یاد ہیں یہ امر بہت غیر معمولی ہے۔ اس سے بڑھکر عجیب بات یہ ہے کہ فقیر کو اپنے دودھ چھٹنے کا زمانہ جبکہ عمر دو یا ڈھائی سال کی ہوگی ایسا یاد ہے جیسے کہ کل کی بات، اسی زمانہ میں جبکہ والد کی تربیت و عنایت کا فیض جاری تھا میں تحصیل علم کر چکا تھا اور ان کی خدمت میں علمی بحث و تکرار میں مصروف رہتا تھا سی شغل میں راتیں گذر جاتی تھیں۔ والد ماجد فقیر کو خصوصاً تلقین علم توحید اور تحقیق مسئلۂ

حدت الوجود میں شرف مکالمت عطا کرتے اور خوش ہوتے تھے "(۴) ابتدائی تعلیم شیخ سیف الدینؒ نے خود ہی شروع کر دی۔ سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کرایا۔ تین مہینے کے قلیل مدت میں آپ نے قرآن حفظ کر لیا۔ پھر والد ماجد نے لکھنے کی طرف شیخ کی توجہ مبذول کرائی اور ایک مہینے کی قلیل مدت میں لکھنا سکھا دیا۔ پھر گلستاں، بوستاں اور دیوان حافظ پڑھایا۔ میزان الصرف، مصباح و کافیہ کی تعلیم دی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھا دی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں مختصر و مطوّل سے فارغ ہو گئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں علوم نقلی و عقلی کے تمام گوشوں کی سیر کر لی۔ اس عمر کی پوری روئداد کو بیان کرتے ہوئے شیخ محدث رقمطراز ہیں: "والد ماجد مجھ سے یہ بھی فرماتے تھے کہ ہر ایک علم میں سے مختصر پڑھ لوگے تو تم کو کافی ہوگا۔ انشاء اللہ برکت اور سعادت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور تمہیں سارے علوم بے تکلف حاصل ہو جائیں گے ان کے اس ارشاد پاک نے یہ اثر کیا کہ تحصیل علم میں مجھکو ایسی سرعت ہوئی کہ جسکو طے زمان اور طے مکان کہتے ہیں۔ ہر علم حاصل ہو گیا۔ یعنی مختصرات نحو مثل کافیہ ولب وارشاد وغیرہ شاید ایک ایک جزو بلکہ زیادہ یاد کرتا تھا اور اتمام تحصیل علم کے لئے اس قدر بے چینی تھی کہ اگر کوئی جزو ان مختصرات کا صحیح اور محشی مل جاتا تھا تو اس کو خود مطالعہ کر لیتا تھا۔ حاجت استاد سے پڑھنے یا دریافت کرنے کی نہ ہوتی۔ اگر بحث آسان ہوتی یا مضمون سے پہلے سے واقفیت ہوتی تو میرا فکر اس کو قبول نہیں کرتا۔ خدا جانے میں ان دنوں کیا سمجھتا تھا اور کیا دیکھتا تھا لیکن ہر کتاب کے متن اور حاشیے اور ان کے الفاظ سے پورا فائدہ حاصل کرتا اور جو کتاب میرے ہاتھ آتی یا جزو کسی کتاب کا ملتا خواہ میرے پڑھے ہوتے یا نہ ہوتے اس کو اوّل سے آخر تک دیکھتا اپنے اوپر واجب کر لیتا تھا اور میں اس امر کا مقید نہ تھا کہ شروع یا خاتمہ کتاب ملے تو دیکھوں۔ میری نظر تحصیل علم پر تھی خواہ کسی طرح پر ہو"(۵) آپ نے ان علوم سے فراغت کے بعد دہلی کے ایک مدرسہ میں داخلہ لیا جو تقریباً آپ کے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ آپ صبح سویرے ہی مدرسہ کے لئے پیدل روانہ ہو جاتے اور دوپہر کے وقت کھانا کھانے کی غرض سے تھوڑی دیر کے لئے گھر آیا کرتے۔ بقیہ اوقات کتابوں کے مطالعہ پر صرف کرتے۔ والد محترم بار بار کہتے کہ تھوڑی دیر محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیل لو۔ اور وقت پر سو جایا کرو تو شیخ محدثؒ والد ماجد کو جواب

مقصد دل کو خوش کرنا ہی تو ہے میری طبیعت اس سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں
...بیں کامل دستگاہ اور علم کلام و منطق پر پورا عبور حاصل کرنے کے بعد شیخ محدث
نے کچھ اور علماء و فضلاء سے بھی علم حاصل کیا لیکن شیخ نے ان بزرگوں کا نام نہیں بتایا ہے۔ تحصیل
علم سے فراغت کے بعد شیخ محدث نے درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک یہ مشغلہ
جاری رکھنے کے بعد حجاز چلے گئے۔ وہاں پر ۹۹۶ھ تک آپ نے مکہ معظمہ کے محدثین سے صحیح بخاری
اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متقیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے شیخ محدث کو
علم کی تکمیل کرائی اور احسان و سلوک کی راہوں سے آشنا کیا اور آپ کی علمی صلاحیتوں کا صحیح رخ
متعین کیا۔ شیخ محدث نے شیخ متقیؒ سے مشکوٰۃ پڑھی۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں آپکے
ساتھ معتکف رہے۔ مناسک حج انھیں کے ساتھ ادا کئے۔ عرفات و مزدلفہ میں ان کی صحبت سے
فوائد حاصل کئے۔ پھر درس میں مشغول ہو گئے ۲۴ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ متقیؒ کی اجازت
سے مدینہ منورہ آگئے اور آخر رجب ۹۹۸ھ تک یہیں مقیم رہے۔ اور پھر مکہ معظمہ آکر مشکوٰۃ کا
درس پورا کیا۔ شیخ متقیؒ نے آپ کو آداب اوضاع ذکر، تقلیل طعام وغیرہ کی تعلیم دی۔ اور تصوف
کی کچھ کتابیں پڑھائیں قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ کی تعلیم آپ نے شیخ محدث کو
خاص طور سے دی۔ غرضیکہ عبدالوہاب متقیؒ نے اپنے علم حدیث کا وہ بیش بہا حصہ عنایت فرمایا
جس کی شہرت سے مصر و عرب کے علمی حلقے گونج رہے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث خود لکھتے ہیں۔
"تمام کتب احادیث اور سارے علوم دینیہ حجاز کے علماء کرام سے حاصل کئے خصوصاً حضرت
شیخ عبدالوہاب متقیؒ سے ذکر وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور انکی خدمت سے بہت سی نعمتیں
حاصل کیں اور حصول انوار و برکات اور ترقی درجات اور علوم دینی کی نشر و اشاعت میں استقامت
سے متعلق بہت سی بشارتیں سننے کے بعد بندہ وطن مالوف کو واپس ہوا۔" (۱۹) ان علوم سے فراغت
کے بعد شیخ عبدالوہاب متقیؒ نے شیخ محدث کو ہندوستان جانے کی ہدایت کی ۹۹۹ھ میں طائف
جاکر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مزار کی زیارت کی۔ ۱۰۰۰ھ میں آپ ہندوستان واپس آئے
اور دہلی میں مسند درس و ارشاد بچھادی۔ شمالی ہندوستان کا اس زمانے میں یہ پہلا مدرسہ تھا۔
جہاں سے شریعت و سنت کی آواز بلند ہوئی۔ آپ نے شریعت و سنت کی آواز اس وقت بلند کی

جب کہ اکبر کے غیر متعین مذہبی افکار نے دین الٰہی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ملک کا سارا مذہبی ماحول خراب ہو گیا تھا۔ شریعت و سنت سے بے اعتنائی عام ہو گئی تھی۔ دربار میں اسلامی شعائر کی کھلم کھلا تضحیک کی جاتی تھی۔ بادشاہ کی اس بے راہ روی نے عوام کی زندگی پر بھی اثر ڈالا حد یہ ہے کہ مدرسے اور خانقاہیں بھی ان مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں ان حالات میں آپ نے شریعت و سنت کی آواز بلند کی۔ درس و تدریس کا یہ ہنگامہ شیخ محدث نے زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھا۔ ان کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں بلکہ سارے شمالی ہندوستان میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ استفادہ کے لئے جمع ہوتے تھے۔

شیخ محدث کا یہ دارالعلوم اس طوفانی دور میں شریعت اسلام اور سنت نبوی کا سب سے بڑا پشت پناہ تھا۔ مذہبی گمراہیوں کے باد سموم چاروں طرف سے اس دارالعلوم کے بام و در سے ٹکرائیں لیکن شیخ محدث کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی اور اپنے عزم و استقلال سے وہ کارنامہ انجام دیا جو دوسرے علماء کے نزدیک ناممکن سا ہو کر رہ گیا تھا۔

شیخ محدث سلیم شاہ سوری کے زمانہ میں پیدا ہوئے آپ نے مختلف بادشاہوں کا دور دیکھا لیکن آپ نے سلاطین یا ارباب حکومت سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کیا البتہ اکبر کے انتقال کے بعد آپ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنا ضروری خیال کیا۔ محض اس خیال سے کہ دین کی صحیح تعلیم ان تک پہونچائی جائے۔ آپ نے رسالہ نورانیہ سلطانیہ تصنیف کیا اور اسمیں قواعد و ارکان سلطنت پر تفصیلی بحث کی۔ اس کے بعد آپ نے چالیس احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا جس میں رسول اللہؐ نے سلاطین کو نصیحتیں فرمائی تھیں اس رسالہ کا نام ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین" رکھا۔ ۱۰۱۹ھ میں آپ جہانگیر سے ملاقات کے لئے اس کے دربار میں بھی تشریف لے گئے۔ جہانگیر نے شیخ کی وضع توکل سے متاثر ہو کر ایک گاؤں "بکروالا" جاگیر کے طور پر شیخ کے سامنے پیش کیا۔ شیخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن بادشاہ کے پیہم اصرار پر اسکو قبول کر لیا۔ آخری زمانہ میں شیخ کے تعلقات جہانگیر سے کشیدہ ہو گئے تھے۔ آخر کار یہ آفتاب علم ۹۴ سال تک فضلائے ہند کو اپنی ضو فشانی سے منور رکھنے کے بعد ۲۱، ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو غروب ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دیتے کہ کھیلنے کا مقصد دل کو خوش کرنا ہی تو ہے میری طبیعت اس سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں۔ عربی میں کامل دستگاہ اور علم کلام و منطق پر پورا عبور حاصل کرنے کے بعد شیخ محدث نے کچھ اور علماء و فضلاء سے بھی علم حاصل کیا لیکن شیخ نے ان بزرگوں کا نام نہیں بتایا ہے۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد شیخ محدث نے درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک یہ مشغلہ جاری رکھنے کے بعد حجاز چلے گئے۔ وہاں پر ۹۹۶ھ تک آپ نے مکہ معظمہ کے محدثین سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متقیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے شیخ محدث کو علم کی تکمیل کرائی اور احسان و سلوک کی راہوں سے آشنا کیا اور آپ کی علمی صلاحیتوں کا صحیح رخ متعین کیا۔ شیخ محدث نے شیخ متقیؒ سے مشکوٰۃ پڑھی۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں آپکے ساتھ معتکف رہے۔ مناسک حج انھیں کے ساتھ ادا کئے۔ عرفات و مزدلفہ میں ان کی صحبت سے فوائد حاصل کئے۔ پھر درس میں مشغول ہوگئے ۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ متقیؒ کی اجازت سے مدینہ منورہ آگئے اور آخر رجب ۹۹۸ھ تک یہیں مقیم رہے۔ اور پھر مکہ معظمہ آکر مشکوٰۃ کا درس پورا کیا۔ شیخ متقیؒ نے آپ کو آداب اوضاع ذکر، تقلیل طعام وغیرہ کی تعلیم دی۔ اور تصوف کی کچھ کتابیں پڑھائیں قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ کی تعلیم آپ نے شیخ محدث کو خاص طور سے دی۔ غرضیکہ عبدالوہاب متقیؒ نے اپنے علم حدیث کا وہ بیش بہا حصہ عنایت فرمایا جس کی شہرت سے مصر و عرب کے علمی حلقے گونج رہے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث خود لکھتے ہیں۔

"تمام کتب احادیث اور سارے علوم دینیہ حجاز کے علماء کرام سے حاصل کئے خصوصاً حضرت شیخ عبدالوہاب متقیؒ سے ذکر وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور انکی خدمت سے بہت سی نعمتیں حاصل کیں اور حصول انوار و برکات اور ترقی درجات اور علوم دینی کی نشر و اشاعت میں تعلمت سے متعلق بہت سی بشارتیں سننے کے بعد بندہ وطن مالوف کو واپس ہوا۔" (۹) ان علوم سے فراغت کے بعد شیخ عبدالوہاب متقیؒ نے شیخ محدث کو ہندوستان جانے کی ہدایت کی ۹۹۹ھ میں طائف جاکر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مزار کی زیارت کی۔ ۱۰۰۰ھ میں آپ ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں مسند درس و ارشاد بچھادی۔ شمالی ہندوستان کا اس زمانے میں یہ پہلا مدرسہ تھا جہاں سے شریعت و سنت کی آواز بلند ہوئی۔ آپ نے شریعت و سنت کی آواز اس وقت بلند

جبکہ اکبر کے غیر متعین مذہبی افکار نے دین الٰہی کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ملک کا سارا مذہبی ماحول خراب ہوگیا تھا۔ شریعت و سنت سے بے اعتنائی عام ہوگئی تھی۔ دربار میں اسلامی شعار کی کھلم کھلا تضحیک کی جاتی تھی۔ بادشاہ کی اس بے راہ روی نے عوام کی زندگی پر بھی اثر ڈالا۔ حد یہ ہے کہ مدرسے اور خانقاہیں بھی ان مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں ان حالات میں آپ نے شریعت و سنت کی آواز بلند کی۔ درس و تدریس کا یہ ہنگامہ شیخ محدث نے زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھا۔ ان کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں بلکہ سارے شمالی ہندوستان میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ استفادہ کے لئے جمع ہوتے تھے۔ شیخ محدث کا یہ دارالعلوم اس طوفانی دور میں شریعت اسلام اور سنت نبوی کا سب سے بڑا پشت پناہ تھا۔ مذہبی گمراہیوں کے باد سموم چاروں طرف سے اس دارالعلوم کے بام و در سے ٹکرائیں لیکن شیخ محدث کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی اور اپنے عزم و استقلال سے وہ کارنامہ انجام دیا جو دوسرے علماء کے نزدیک ناممکن سا ہوکر رہ گیا تھا۔

شیخ محدث سلیم شاہ سوری کے زمانہ میں پیدا ہوئے ہوئے آپ نے مختلف بادشاہوں کا دور دیکھا لیکن آپ نے سلاطین یا ارباب حکومت سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کیا البتہ اکبر [illegible] انتقال کے بعد آپ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنا ضروری خیال کیا۔ محض اس خیال سے [illegible] صحیح تعلیم ان تک پہونچائی جائے۔ آپ نے رسالہ نورانیہ سلطانیہ تصنیف کیا [illegible] [illegible] تفصیلی بحث کی۔ اس کے بعد آپ نے چالیس [illegible] [illegible] نے سلاطین کو نصیحتیں فرمائی تھیں اس رسالہ [illegible] [illegible] الملوک والسلاطین رکھا۔ ۱۰۱۸ھ میں آپ جہانگیر سے ملاقات کے لئے [illegible] [illegible] جہانگیر نے شیخ کی [illegible] [illegible] سامنے پیش کیا۔ شیخ نے [illegible] [illegible] شیخ نے [illegible]

[illegible]

تے کہ کھیلنے کا مقصد دل کو خوش کرنا ہی تو ہے میری طبیعت اس سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں
لکھوں۔ عربی میں کامل دستگاہ اور علم کلام ومنطق پر پورا عبور حاصل کرنے کے بعد شیخ محدث
نے کچھ اور علماء وفضلاء سے بھی علم حاصل کیا لیکن شیخ نے ان بزرگوں کا نام نہیں بتایا ہے۔ تحصیل
علم سے فراغت کے بعد شیخ محدث نے درس وتدریس کا شغل اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک یہ مشغلہ
جاری رکھنے کے بعد حجاز چلے گئے۔ وہاں پر ۹۹۶ھ تک آپ نے مکہ معظمہ کے محدثین سے صحیح بخاری
وصحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متقیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے شیخ محدث کو
علم کی تکمیل کرائی اور احسان وسلوک کی راہوں سے آشنا کیا اور آپ کی علمی صلاحیتوں کا صحیح رخ
متعین کیا۔ شیخ محدث نے شیخ متقیؒ سے مشکوٰۃ پڑھی۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں آپکے
ساتھ معتکف رہے۔ مناسک حج انھیں کے ساتھ ادا کئے۔ عرفات ومزدلفہ میں ان کی صحبت سے
فوائد حاصل کیے۔ پھر درس میں مشغول ہو گئے ۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ متقیؒ کی اجازت
سے مدینہ منورہ آگئے اور آخر رجب ۹۹۸ھ تک یہیں مقیم رہے۔ اور پھر مکہ معظمہ آکر مشکوٰۃ کا
درس پورا کیا۔ شیخ متقیؒ نے آپ کو آداب اوضاع ذکر، تقابیل طعام وغیرہ کی تعلیم دی۔ اور تصوف
کی کچھ کتابیں پڑھائیں قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ کی تعلیم آپ نے شیخ محدث کو
خاص طور سے دی۔ غرضیکہ عبدالوہاب متقیؒ نے اپنے علم حدیث کا وہ بیش بہا حصہ عنایت فرمایا
جس کی شہرت سے مصر وعرب کے علمی حلقے گونج رہے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث خود لکھتے ہیں۔
"تمام کتب احادیث اور سارے علوم دینیہ حجاز کے علماء کرام سے حاصل کئے خصوصاً حضرت
شیخ عبدالوہاب متقیؒ سے ذکر وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور انکی خدمت سے بہت سی نعمتیں
حاصل کیں اور حصول انوار وبرکات اور ترقی درجات اور علوم دینی کی نشر واشاعت میں استقامت
سے متعلق بہت سی بشارتیں سننے کے بعد بندہ وطن مالوف کو واپس ہوا۔" (۹) ان علوم سے فراغت
کے بعد شیخ عبدالوہاب متقیؒ نے شیخ محدث کو ہندوستان جانے کی ہدایت کی ۹۹۹ھ میں طائف
جاکر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مزار کی زیارت کی۔ ۱۰۰۰ھ میں آپ ہندوستان واپس آئے
اور دہلی میں مسند درس وارشاد بچھادی۔ شمالی ہندوستان کا اس زمانے میں یہ پہلا مدرسہ تھا۔
جہاں سے شریعت وسنت کی آواز بلند ہوئی۔ آپ نے شریعت وسنت کی آواز اس وقت بلند کی

جبکہ اکبر کے غیر متعین مذہبی افکار نے دین الٰہی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ملک کا سارا مذہبی ماحول خراب ہو گیا تھا۔ شریعت و سنت سے بے اعتنائی عام ہو گئی تھی۔ دربار میں اسلامی شعار کی کھلم کھلا تضحیک کی جاتی تھی۔ بادشاہ کی اس بے راہ روی نے عوام کی زندگی پر بھی اثر ڈالا۔ حد یہ ہے کہ مدرسے اور خانقاہیں بھی ان مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں ان حالات میں آپ نے شریعت و سنت کی آواز بلند کی۔ درس و تدریس کا یہ ہنگامہ شیخ محدث نے زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھا۔ ان کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں بلکہ سارے شمالی ہندوستان میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ استفادہ کے لئے جمع ہوتے تھے۔ شیخ محدث کا یہ دارالعلوم اس طوفانی دور میں شریعت اسلام اور سنت نبوی کا سب سے بڑا پشت پناہ تھا۔ مذہبی گمراہیوں کے باد سموم چاروں طرف سے اس دارالعلوم کے بام و در سے ٹکرائیں لیکن شیخ محدث کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی اور اپنے عزم و استقلال سے وہ کارنامہ انجام دیا جو دوسرے علماء کے نزدیک ناممکن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ شیخ محدث سلیم شاہ سوری کے زمانہ میں پیدا ہوئے آپ نے مختلف بادشاہوں کا دور دیکھا لیکن آپ نے سلاطین یا ارباب حکومت سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کیا البتہ اکبر کے انتقال کے بعد آپ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنا ضروری خیال کیا۔ محض اس خیال سے کہ دین کی صحیح تعلیم ان تک پہونچائی جائے۔ آپ نے رسالہ نورانیہ سلطانیہ تصنیف کیا اور اسمیں قواعد و ارکان سلطنت پر تفصیلی بحث کی۔ اس کے بعد آپ نے چالیس احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا جس میں رسول اللہ ؐ نے سلاطین کو نصیحتیں فرمائی تھیں۔ اس رسالہ کا نام ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین" رکھا۔ ۱۰۱۴ھ میں آپ جہانگیر سے ملاقات کے لئے اس کے دربار میں بھی تشریف لے گئے۔ جہانگیر نے شیخ کی وضع توکل سے متاثر ہو کر ایک گاؤں سے "بکر والا" جاگیر کے طور پر شیخ کے سامنے پیش کیا۔ شیخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن بادشاہ کے پیہم اصرار پر اسکو قبول کر لیا۔ آخری زمانہ میں شیخ کے تعلقات جہانگیر سے کشیدہ ہو گئے تھے۔ آخرکار یہ آفتاب علم ۹۴ سال تک فضلائے ہند کو اپنی ضوفشانی سے منور رکھنے کے بعد ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

[illegible] نے چورانوے سال کی طویل عمر پائی اور عمر کا بیشتر حصہ تصنیف
و تالیف میں صرف کر دیا آپ اپنے عہد کے یکتائے روزگار عالم اور امام حدیث تھے۔ آپ تفسیر
حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ، نحو، فلسفہ و منطق میں عدیم المثال تھے۔ آپ کی ساری تصانیف
حقیقی و دائمی شہرت کی مالک ہیں۔ ان میں سے چند کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔
۱۔ اشعۃ اللمعات فی شرح مشکوٰۃ:۔ فارسی زبان میں مشکوٰۃ کی نہایت جامع اور مکمل شرح
ہے۔ شیخ عبد الحق محدثؒ نے یہ عظیم الشان کارنامہ ۱۰۱۹ھ میں دہلی میں شروع کیا تھا ۱۰۲۵ھ
میں چھ سال کی محنت کے بعد آپ نے مکمل کیا۔ اشعۃ اللمعات چار جلدوں پر مشتمل ہے اور مطبع
نول کشور سے شائع ہو چکی ہے۔ پہلی جلد میں علم الحدیث اور محدثین پر اتالیس صفحات کا ایک
مقدمہ ہے جس میں علم حدیث اور اقسام حدیث پر نہایت عالمانہ اور بصیرت افروز تبصرہ ہے
امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ترمذیؒ، امام سجستانیؒ، امام
نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ، امام دارمیؒ، امام دارقطنیؒ، ابن جوزیؒ وغیرہ کے حالات مختصراً لکھے گئے ہیں۔
پہلی جلد میں کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارات، کتاب الجنائز کو شامل کیا گیا ہے دوسری جلد
میں کتاب الزکوٰۃ سے کتاب المناسک تک کی شرح ہے۔ اور تیسری جلد میں کتاب البیوع سے کتاب
الطب والرقی کی شرح ہے۔ اور چوتھی اور آخری جلد میں کتاب الآداب اور کتاب الفتن کو
شامل کیا گیا ہے۔ چاروں جلدیں ۲۶۵۵ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اشعۃ اللمعات کے قلمی نسخے اسلامیہ
کالج پشاور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، برٹش میوزیم، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہ میں دستیاب
ہیں۔ آپ نے یہ کتاب اکیانوے سال کی عمر میں لکھی۔
۲۔ لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح: عربی زبان میں مشکوٰۃ کی نہایت جامع شرح ہے
یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے جب آپ اشعۃ اللمعات کی تصنیف فرما رہے تھے تو بعض مضامین ایسے
آئے جنکی تشریح فارسی میں مناسب نہ سمجھا۔ فارسی عوام کی زبان تھی اور بعض مباحث میں شیخ
محدث نے عوام کو شریک کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور ان کو فارسی کی شرح میں نظر انداز کر دیا
پھر آپ نے لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح نام کی شرح لکھی۔ اس میں آپ نے لغوی، نحوی
مشکلات اور فقہی مسائل کو نہایت عمدگی سے حل کیا۔ لمعات کے قلمی نسخے بانکی پور، رام پور

حیدرآباد، ایشیاٹک سوسائٹی، دہلی، علی گڑھ کے کتب خانوں میں موجود ہیں ۲۴ رجب ۱۰۲۵ھ کو شیخ محدث لمعات التنقیح سے فارغ ہوئے۔

۳۔ جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین:۔ اس کتاب میں چالیس ایسی احادیث جمع کی گئی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین کو نصیحتیں فرمائی ہیں۔ حکومت کے ڈھنگ سکھلائے ہیں۔ امیر کا مامور سے اور مامور کا امیر سے کیا تعلق ہونا چاہیئے اس پر آپ نے روشنی ڈالی ہے۔ اسی کتاب کو شیخ محدث نے فارسی میں ترجمہ کرکے شاہجہاں کی خدمت میں پیش کیا اور اس کا نام ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین رکھا۔

۴۔ ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ:۔ اس کتاب میں ماہ محرم سے ماہ ذی الحجہ تک ان تمام مذہبی مناسک کا ذکر ہے جو احادیث سے ثابت ہیں۔ یوم عاشورہ کے بارے میں جو احادیث صحیح ہیں ان کو نقل کیا ہے اور ان احادیث کی یکسر تردید کر دی ہے جو محرم کے سلسلے میں گھڑلی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر عاشورہ کے دن غسل کرنے والا کبھی بیمار نہیں ہوتا۔ اس حدیث کو شیخ محدث نے لغو اور باطل قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ روزہ، تراویح، عید الفطر، عید الاضحیٰ، حج وغیرہ کے سلسلے میں جو احادیث تھیں ان کو آپ نے یکجا کر دیا ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے بانکی پور، رامپور دہلی، حیدرآباد کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۵۔ شرح سفر السعادات:۔ یہ کتاب سفر السعادات مولانا مجدالدین فیروزآبادی کی تصنیف ہے اس میں احوال، معاش اور عبادات سے متعلق احادیث نبویہ کو جمع کیا گیا ہے شیخ محدث نے اس کتاب کی احادیث کے پیش نظر اس کی شرح لکھی اور اس کا نام شرح سفر السعادات رکھا۔ اس کتاب میں شیخ محدث نے ان لغزشوں اور خامیوں کی نشاندہی کر دی ہے جہاں مولانا فیروزآبادی حد اعتدال و جادۂ انصاف سے باہر چلے گئے تھے۔ یہ شرح تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مولانا فیروزآبادی کے بیان کردہ احادیث پر محدثانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مجتہدین پر بحث ہے اس حصے کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں حنفی مسلک کے اصولوں کی زبردست حمایت کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں شرعی احکام کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شرح سفر السعادات ۱۲۵۲ھ میں کلکتہ سے، ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔

[illegible] شرح کے ... [illegible] ... میں

موجود ہیں۔

۴۔ تکمیل الایمان وتقویۃ الایمان:۔ شیخ محدث نے اس کتاب میں عقائد اسلام اور قواعد ملت کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن مضمون کی تنوع اور جامعیت کے اعتبار سے یہ ۸۰۰ صفحات پر بھاری ہے۔ اس کتاب میں ایمان کی نوعیت، جبر واختیار، عذاب قبر، بعثت، معراج، شفاعت، جنت و دوزخ، توبہ، استمداد از قبور، معجزات اہل بیت وغیرہ جیسے عنوانات موجود ہیں۔ شیخ محدث نے ان عنوانات کے صحیح مذہبی نقطۂ نظر کو نہایت وضاحت اور صفائی سے [illegible]

بہت مقبولیت حاصل ہوئی ۱۸۷۲ء میں میر علی نے اس کا اردو ترجمہ سبل الجنان کے نام سے کانپور سے شائع کیا ۱۸۸۱ء میں دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ اس کتاب کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، حیدرآباد انڈیا آفس، ایشیاٹک سوسائٹی، بانکی پور وغیرہ میں موجود ہیں۔ (باقی آئندہ)

تعلیقات وحواشی

(۱) محدث دہلویؒ، عبدالحق، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی ۱۳۳۲ھ، ص ۲۹۲۔

(۲) نفس مصدر (۳) نفس مصدر، ص ۳۰۰

(۴) نفس مصدر، مصنف اسی کتاب کے صفحہ ۲۹۲ پر شیخ سیف الدین کی ان کو نصیحتوں کو قلمبند کرتا ہے۔ جو باپ نے بیٹے کو اپنے زمانے کے علماء کی بے راہ روی اور کج بحثی کو دیکھکر ارشاد فرمایا تھا۔ "چاہیئے کہ کسی علمی بحث میں جھگڑا نہ کرو اور تکلیف نہ پہونچاؤ۔ اگر یہ سمجھ کر دوسرا حق بجانب ہے تو اس کی بات مان لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو دو تین بار سمجھا دو اگر نہ مانے تو کہو کہ مجھے یہی معلوم ہے ممکن ہے کہ جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہو۔ پھر جھگڑے کی کیا بات ہے۔ فرمایا کرتے کہ علمی بحث میں جو جنگ کی جاتی ہے وہ صرف اپنے نفس کے واسطے ہوتی ہے یہ لاحاصل چیز ہے اس سے منافرت و مخالفت کے رستے کھلتے ہیں۔ علمی مسائل میں محبت والفت سے تبادلۂ خیالات ہونا چاہیئے کہ یہ محبت کا معاملہ ہے۔ جس میں محبت نہیں وہ کیا کرے گا۔" (۵) نفس مصدر، ص ۳۰۵۔

(۶) محدث دہلویؒ، عبدالحق، تالیف قلب الالیف (قلمی) بحوالہ نظامی، خلیق احمد، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۰۔

"سرسید اور علی گڑھ تحریک"

مولانا انظر شاہ کشمیری، صدر مدرس (وقف) دارالعلوم دیوبند

سلسلے رہے ہیں مہیا ہوتے رہیں گے، اور کیوں نہ ملیں گے، جب تقسیم کرنے والے نے ازل پر ... کو نقشہ اسی طرح بٹھایا، علم میں جہالت تلاش کرنے والے جہل کی اندھیری میں علم کی روشنی دیکھنے والے، تندرستی میں بیماری و رنجوری کے متلاشی، انحطاط صحت میں تندرستی کے جویا، دنیا میں دین کے طالب، دنیا کو دین کے تابع ماننے والے بالفاظ دیگر دنیا داروں میں سچے دین کے حامل اور حاملین دین میں دنیا کے پیچھے دوڑنے والے، دیکھ جایئے اور خوب غور سے دیکھئے، جائزہ لیجئے اور اندر جھانک کر جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔ قدم قدم پر دلنواز اور مہیب مناظر سامنے آتے رہیں گے۔

خونخوار ملوکیت کی تاریخ، رحمدلی کی مثالیں، رحم دوست حلقہ میں قساوت کی بھیانک تصویریں کون کہتا ہے کہے گا تو کب صحیح ہوگا کہ کوئی ایک خصوصیت کسی خاص حلقہ کی میراث بن کر رہ گئی۔

دین اور دنیا میں تفریق کے قائل اسی طرح کے مغالطہ میں مبتلا ہیں، جیسا کہ شریعت اور طریقت و حقیقت میں علیحدگی کے بیج ڈال دیئے گئے، حالانکہ بات بہت مختصر ہے سمجھنے میں نہ کوئی معمہ نہ چیستاں، شریعت مشعل ہے طریقت کی راہ اسی کی روشنی میں طے ہوگی، قطع مسافت کے بعد جب منزل مقصود پر پہونچیں گے وہی حقیقت ہوگی۔

لیجئے ان تینوں حقائق کو جو بغلگیر ہیں، دست و گریباں کرنے والوں نے ہر ایک کی کائنات علیحدہ ہی کر کے چھوڑی۔ اسی طرح سنانے والے صدیوں سے سنا رہے ہیں سناتے ہی رہیں گے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور زور ترک دنیا پر تھا گویا آپ کی رسالت کا محور اور ختم نبوت کا مرکز لے دے کر صرف ترک دنیا کی تعلیم ہے اور اسے بھول جاتے ہیں کہ آپ کے براہ راست تربیت کردہ حلقہ میں جنھیں دنیا صحابہ رضوان علیہم اجمعین کے معتبر و مزعفر نام سے جانتی ہے اس میں کچھ ایسے بھی جن کے دنیا سے گذر جانے کے بعد میراث میں موجود سونے کے ٹکڑوں کو کاٹنے کے لئے کلہاڑی سے کام لیا گیا، ترک دنیا کے ان منبری و محرابی مواعظ نے غریب مسلمانوں کو معاشیات و اقتصادیات میں

اس شرح کے قلمی نسخے انڈیا آفس حیدرآباد، کلکتہ مدرسہ پشاور اور بانکی پور کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۴۔ تکمیل الایمان و تقویۃ الایمان :۔ شیخ محدث نے اس کتاب میں عقائد اسلام اور قواعد ملت کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن مضمون کی تنوع اور جامعیت کے اعتبار سے یہ ۸۰ صفحات پر بھاری ہے۔ اس کتاب میں ایمان کی نوعیت، جبر و اختیار، عذاب قبر، بعثت، معرج، شفاعت، جنت و دوزخ، توبہ، استمداد از قبور، معجزات اہل بیت وغیرہ جیسے عنوانات موجود ہیں۔ شیخ محدث نے ان عنوانات کے صحیح مذہبی نقطۂ نظر کو نہایت وضاحت اور صفائی سے پیش کیا ہے۔ حجم میں کم اور سلجھی ہونے کی وجہ سے اس کتاب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ۱۸۷۳ء میں میر علی نے اس کا اردو ترجمہ سبیل الحنان کے نام سے کانپور سے شائع کیا۔ ۱۸۸۱ء میں دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ اس کتاب کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، حیدرآباد انڈیا آفس، ایشیاٹک سوسائٹی، بانکی پور وغیرہ میں موجود ہیں۔ (باقی آئندہ)

تعلیقات و حواشی

(۱) محدث دہلوی، عبدالحق، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی ۱۳۳۲ھ، ص ۲۹۲۔

(۲) نفس مصدر (۳) نفس مصدر، ص ۳۰۰

(۴) نفس مصدر، مصنف اسی کتاب کے صفحہ ۲۹۲ پر شیخ سیف الدین کی ان کو نصیحتوں کو قلمبند کرتا ہے۔ جو باپ نے بیٹے کو اپنے زمانے کے علماء کی بے راہ روی اور کج بحثی کو دیکھ کر ارشاد فرمایا تھا۔ "چاہیئے کہ کسی علمی بحث میں جھگڑا نہ کرو اور تکلیف نہ پہونچاؤ۔ اگر یہ سمجھ کر دوسرا حق بجانب ہے تو اس کی بات مان لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو دو تین بار سمجھا دو اگر نہ مانے تو کہو کہ مجھے ہی معلوم ہے ممکن ہے کہ جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہو۔ پھر جھگڑے کی کیا بات ہے۔ فرمایا کرتے کہ علمی بحث میں جو جنگ کی جاتی ہے وہ صرف اپنے نفس کے واسطے ہوتی ہے یہ لاحاصل چیز ہے اس سے منافرت و مخالفت کے سوتے ابلتے ہیں۔ علمی مسائل میں محبت و الفت سے تبادلۂ خیالات ہونا چاہیئے کہ یہ محبت کا معاملہ ہے۔ جسمیں محبت نہیں وہ کیا کرے گا۔ (۵) نفس مصدر، ص ۳۰۵۔

(۶) محدث دہلوی، عبدالحق، تالیف قلب الالیف (قلمی) بحوالہ نظامی، خلیق احمد، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۰۔

"سرسید اور علی گڑھ تحریک"

مولانا انظر شاہ کشمیری، صدر مدرس (وقف) دارالعلوم دیوبند

ملتے رہے ہیں، مہیا ہوتے رہیں گے، اور کیوں نہ ملیں گے، جب تقسیم کرنے والے نے ازل میں تقسیم کا نقشہ اسی طرح بٹھایا، علم میں جہالت تلاش کرنے والے، جہل کی اندھیری میں علم کی روشنی دیکھنے والے، تندرستی میں بیماری اور مجبوری کے متلاشی، انحطاط صحت میں تندرستی کے جویا، دنیا میں دین کے طالب، دنیا کو دین کے تابع بنانے والے بالفاظ دیگر دنیا داروں میں سچے دین کے حامل اور حاملین دین میں دنیا کے پیچھے دوڑنے والے، دیکھ جائیے اور خوب غور سے دیکھئے، جائزہ لیجئے اور اندر جھانکئے جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔ قدم قدم پر دلنواز اور مہیب مناظر سامنے آتے رہیں گے۔

خونخوار ملوکیت کی تاریخ، رحمدلی کی مثالیں، رحم دوست حلقہ میں قساوت کی بھیانک تصویریں کون کہتا ہے کہے گا تو کب صحیح ہوگا کہ کوئی ایک خصوصیت کسی خاص حلقہ کی میراث بن کر رہ گئی۔

دین اور دنیا میں تفریق کے قائل اسی طرح کے مغالطہ میں مبتلا ہیں، جیسا کہ شریعت اور طریقت و حقیقت میں علیحدگی کے بیج ڈال دیئے گئے، حالانکہ بات بہت مختصر ہے، سمجھنے میں نہ کوئی معمہ نہ چیستاں، شریعت مشعل ہے طریقت کی راہ اسی کی روشنی میں طے ہوگی، قطع مسافت کے بعد جب منزل مقصود پر پہونچیں گے وہی حقیقت ہوگی۔

لیجئے ان تینوں حقائق کو جو بغلگیر ہیں، دست و گریباں کرنے والوں نے ہر ایک کی کائنات علیحدہ ہی کر کے چھوڑی۔ اسی طرح سنانے والے صدیوں سے سنا رہے ہیں سناتے ہی رہیں گے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور زور ترک دنیا پر تھا گویا آپ کی رسالت کا محور اور ختم نبوت کا مرکز لے دے کر صرف ترک دنیا کی تعلیم ہے اور اسے بھول جاتے ہیں کہ آپ کے براہ راست تربیت کردہ حلقہ میں جنھیں دنیا صحابہ رضوان علیہم اجمعین کے معتبر و مزعفر نام سے جانتی ہے اس میں کچھ ایسے بھی جن کے دنیا سے گذر جانے کے بعد میراث میں موجود سونے کے ٹکڑوں کو کاٹنے کے لئے کلہاڑی سے کام لیا گیا، ترک دنیا کے ان منبری و محرابی مواعظ نے غریب مسلمانوں کو معاشیات و اقتصادیات میں

... حال کے سقیم وعقیم درجہ تک پہونچا کر چھوڑا کاش یہ خوش بیان واعظ اور سحر البیان مقرر مسلمانوں کے ... کو کِردار و دمریز کے اصول کو سامنے رکھکر دنیا گریز سبق سنانے کے بجائے دنیا میں انہماک سے رکھتے۔ یہ ظلم بھی مسلم معاشرہ پر انھیں واعظین کیطرف سے ہوتا رہا کہ پیشہ کی رذالت دماغوں اور دلوں کے رگ وریشہ میں پیوست کردی نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیئے تھا کہ بھاگ دوڑ کی اس دنیا میں دوسری قومیں بھاگم بھاگ منزل پر جا پہونچیں اور غریب مسلمان کسب واکتساب کی راہ میں صنعتوں کا انتخاب عزت و ذلت کے پیمانے سے ناپ ناپ کر کرتا رہا۔ اس مظلوم مسلمان کو کبھی یہ بھول کر نہیں بتایا گیا کہ اس کے آباء و اجداد بلکہ جہانِ علم کے مسند نشیں بزاز بھی تھے اور قفال بھی صباغ بھی تھے اور دباغ بھی عطار بھی تھے اور قصار بھی، حلوائی بھی تھے اور زعفرانی بھی، سب ہی کچھ تھے اور سب نے علم وکمال کی بلندیوں پر قدم اس مضبوطی سے جمائے کہ آج انھیں کے تذکروں سے تاریخ جگمگا رہی ہے، درسگاہیں ان کے تذکار سے بھرپور، علمی عقدے ان کے اقوال سے حل، علمی رفعتیں ان کی آراء سے بلند تر بات لمبی ہوتی جا رہی ہے کہنا یہ ہے کہ ایک حلقہ میں سرسید احمد خاں صرف اس لئے مجروح کہ مسلم معاشرہ کو دوڑتی بھاگتی دنیا سے ہمقدم بنانے کا بھیانک جرم کیوں کیا؟ دوسری جانب حضرت مولانا محمد قاسمؒ اس لئے معتوب کہ گھیر گھار کر مسلم نسل کو مدارس کی چہار دیواری میں محصور کیوں کر دیا؟

دماغی اعتبار سے معطل طبقہ جس کا علم ذرا کبھی گھسا گھسایا ہوا سرسید کی تکفیر میں پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر رہا ہے ادھر دانشور طبقہ "قل اعوذ بہ" کا طنز اور "مسجد کے بوریئے و مصلے سمیٹنے والے" کے دلآزار نشتر چبھو رہا ہے۔ کہنے دیجئے کہ دونوں خیال منزل سے بہت دور اور سوچنے کے ہر دو انداز یکسر غلط۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ دین کے ساتھ دنیا سے غافل نہ تھے اور سرسید دنیا میں دین کی جوت جگائے ہوئے تھے، تفریق کی تخم کاری ہم اور آپ کر رہے ہیں، سرسید کے مذہبی رجحانات کو جمع وتقسیم کرنے کے کاوشوں و کاہشوں کا طویل سلسلہ قائم کریں گے، مگر میرے لئے ان کا صرف ایک ہی واقعہ ان کے دینی رجحانات کو مستند کرنے میں کافی وافی بلکہ شافی ہے۔

واقعہ وقار الملک کا ہے کلکٹری میں کام کرنے کے دوران کسی اور کی جانب سے نہیں براہ راست حاکم ضلع کی وقار الملک کے اہتمام نماز پر مسلسل نکیر ہے اسی گرفت پر وقار الملک کی درخواست میں تین

اجزاء یہ ہیں۔

(۱) ادائیگی نماز کے لئے وقت دیا جائے (۲) اس وقت کی تنخواہ وضع کی جائے (۳) چھ ماہ کی رخصت دی جائے۔

غالباً اس آخری جز کا مقصد اس عرصہ میں متبادل روزگار کی فراہمی ہے، درخواست غیر مناسب رہے جا نہیں ہے عفیفہ و محصنہ عائشہؓ کا یہ مشورہ موجود ہے کہ لگے ہوئے روزگار کو نہ چھوڑو مگر جس کو کافر کہا جارہا ہے اور جسکی تکفیر کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملائے جارہے ہیں، اسی مظلوم سرسید کی غیرتِ دینی اس مناسب و متوازن درخواست کو بھی برداشت نہ کرسکی کسی اور کو نہیں وقارالملک کو تہدید آمیز لہجہ میں مخاطب کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے خرابی سے ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز مت پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہوسکتا یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی ہے میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آئی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا تڑاخ پڑاخ استعفاء دے دینا تھا اور کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی، کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ آتی فاقہ مرجاتے نہایت اچھا ہوتا"

مکتوب کا ایک ایک لفظ اس پر جوش و پر ہوش گرمی کا غماز ہے جس کا سرچشمہ دینی حمیت و دینی غیرت ہے،

میں جانتا ہوں کہ اوپر کی چند سطور پر بعض حلقے بحث کریں گے اور اپنے اسی محبوب مشغلہ تکفیر کی آبیاری میں تنقیص کے روا دار نہ ہوں گے، لیکن میرا مقصود اس جذبہ کو نمایاں کرنا ہے جو اس مکتوب کے مندرجات میں لفظ لفظ سے عیاں ہے، نماز ایسے فریضہ کی ادائیگی میں بے جا مداخلت کو دینی جذبات سے روکنے کے بے پناہ جذبہ کو خدا تعالیٰ جو رحمٰن، رحیم اور ارحم الرحمٰن ہے اور ساتھ ہی نکتہ نواز اس کی صفت مغفرت و وصف غفاریت رائیگاں نہیں جانے دے گا۔

تحقیقاتی مقالوں کا آجکل یہ بھی دستور ہے کہ جس پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا ماحول، آباء و اجداد کے افکار و عقائد، گرد و پیش کا جائزہ، گھر گھرانہ کا تجسس، مزلی حلقہ کا تفحص، سب کچھ دیکھ لیا جاتا ہے۔ شخصیت کو پرکھنے کے لئے راہیں تو یہ کارآمد حدود جاندار ہیں تاہم اس بحث و تمحیص میں بعض اوقات وہ دور کی کوڑی بھی لائی جاتی ہے جس سے متعلقہ شخصیت کا قریب و بعید میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مگر میرا خیال ہے کہ عصر حاضر کے یہ پسندیدہ مباحث مالک الملک کی اس قدرت و قادریت کو کبھی چیلنج نہیں کر سکتے کہ وہ آزر کے گھر میں ابراہیم، اور توحید کے پرچم اڑانے والے نوح کے یہاں کنعان پیدا کرتا رہا اور کرتا رہے گا۔ پھر یہ بھی تو بات ہے کہ بعض شخصیتیں اپنے حدود میں اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ وہ مذکورہ بالا تمام حصار بندیوں کو توڑ دیتی ہیں اور سرسید ایسی ہی جیتی جاگتی شخصیت کے مالک تھے اس لئے میرا خیال ہے کہ سرسید کے افکار و عقائد، نظریات و رجحانات، ماحول کے اثرات کے تحت لاکر جانچ پرکھنے کا لگا بندھا راستہ چھوڑ کر براہ راست انھیں چیزوں سے بحث کی جائے جو موصوف کے قلم سے تراوش ہوئی ہیں۔

انبہٹا ضلع سہارنپور کے ایک پیرزادہ کی وساطت سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے جو سرسید کی مراسلت ہوئی یا مولوی ممتاز علی کو اپنے ایک مکتوب میں جو کچھ لکھا یا ان کی تقاریر میں جن خیالات کا اظہار ہے وہ سرسید کو معلوم کرنے اور پہچاننے کے لئے کافی ہیں۔ یہ بحث ضرور اٹھے گی۔ اور اٹھائی جائے گی کہ سرسید اور متعارف علماء کے درمیان طریق کار سے ہٹ کر بنیادی اختلاف کیوں ہوا؟

بحث کے اسی مرکزی حصہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کچھ تفصیل ضروری ہے، جیسا کہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی طویل حکمرانی ہندوستان میں ختم ہو رہی تھی، شوکت شاہی و سطوت شہنشاہی کی وہ بساط جس پر بیٹھ کر دماغی عیاشی نے ہر صلاحیت و توانائی پر جمود و تعطل کی گہری چھاپ ڈال دی تھی، یکسر الٹ دی گئی ایک تہذیب رخصت ہو رہی تھی۔ نیا تمدن ابھی جگہ قدم جما رہا تھا اور یہ بھی سامنے دیکھ رکہ آنے والا تمدن جانے والی تہذیب کا بلاواسطہ قاتل تھا۔ اس لئے جانے والوں کے قلب و دماغ میں آنے والوں کے لئے نفرت و تنفر کا شدید جذبہ پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ہندوستان

کا اکثریتی فرقہ جو آمد آیا اور رفت گیا کا طویل دور دیکھ چکا تھا اس کو نہ کسی شہنشاہیت کے فنا پر اشک خونیں بہانے تھے اور نہ نئے نظام سے سراسیمگی کیوجہ۔ وہ ساز کا عادی تھا، سوز سے نہ آشنا ساخت و پرداخت کا خوگر، کھنڈرات پر ماتم کا عادی نہیں، ٹھیک اسی کشمکش میں دو فکر ابھر کر سامنے آئے ایک کا تمام تر خیال دین بچاؤ اور اپنی گئی ہوئی سلطنت کو واپس لانے اور لینے کے لئے جدو جہد۔ دوسرے فکر کا محور یہ تھا کہ جو کچھ ہو چکا ہو چکا۔ ماضی پلٹ کر نہیں آسکتی اس لئے اب حال سے روشن مستقبل کی تعمیر میں قومی فلاح کا راز مضمر ہے۔

اول الذکر نظریہ خانوادہ شاہ ولی اللہ سے چلا اور ہندوستان کی آزادی پر نمٹ نمٹا کر رہ گیا۔ یاد رہے دارالعلوم دیوبند اور ہزارہا ہزار ہندوستان میں پھیلی ہوئی اپنی درسگاہیں، ان کا فکری سرمایہ اور جہد مسلسل کی اساس شاہ صاحب کے افکار سے استحکام پاتی ہے۔ ثانی الذکر فکر کی گردش سرسید کی شخصیت اور انھیں کے اطراف میں گھوم جانے والی کائنات ہے۔

دینی حلقہ میں فرنگی اقتدار سے جو بغض و عناد پیدا ہو گیا تھا اس کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ اور اسے آپ کیا کہیئے گا کہ ہندوستان کے ایک لغت نویس نے "فرنگی" سے تعارف کراتے ہوئے کلمات وہ اختیار کئے جنھیں پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے لکھا ہے کہ ؛

"فرنگی یکے از حیواناتِ بحر استا کہ گاہ گاہ با ساحل نظر می آید" یعنی فرنگی ایک سمندری جانور ہے جو کبھی کبھی ساحل پر نظر آتا ہے۔ صاحب لغت کی اس علمی کاوش پر مطلع ہونے کے بعد غریب مولویوں کی عداوتی داستان کی توجیہہ بڑی آسان ہو گئی۔

مولانا محمد اسماعیل علیہ الرحمۃ جو رئیس التبلیغ مولانا الیاس صاحب کاندھلوی کے نامور باپ ہیں۔ کاندھلہ میں اپنی ہزاروں بیگہ زمین کی بربادی پر صرف اس لئے خاموش رہے کہ انگریز کی عدالت میں جانا ہوگا اور اس کی ناپسندیدہ صورت دیکھنا پڑے گی، انھیں مولانا الیاس صاحبؒ کو بچپن میں عید کے دن شیروانی پہنائی گئی جس میں ولایتی بٹن لگے ہوئے تھے مرحوم اپنے نانا کو عید کا سلام کرنے پہونچے تو بجائے جواب کے کچھ دیر بعد منظر یہ دیکھا گیا کہ نانا اپنا رخت سفر باندھ رہے ہیں پوچھنے پر بتایا کہ اب ہجرت کی نیت کر لی۔ ہمارے گھر ہی میں ولایتی سامان استعمال ہونے لگا۔

پانی پت کے مشہور محدث قاری عبدالرحمنؒ سے دارالعلوم دیوبند کا ایک فاضل اپنی سند

پر تبرکاً دستخط لینے کے لئے جا پہونچا درخواست مسموع ہوئی لیکن غضب یہ ہوا کہ طالب علم نے دستخط کے لئے قاری صاحبؒ کو جو قلم دیا وہ ولایتی فونٹین پن تھا اس جسارت و گستاخی پر پانی پت کا یہ محدث آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ فرمایا:

"دارالعلوم سے آئے ہو اس نسبت کے احترام میں تمہاری سند نہیں پھاڑتا ورنہ ولایتی فونٹین پن کے استعمال کے جرم میں تمہارے فضیلتی دفراغتی کاغذ کے پرزے کرکے تمہارے منہ پر دے مارتا۔"

پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ تشدد جو اس راہ میں برتا جا رہا تھا وہ مبنی بر مصلحت بھی تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ جو بلاشبہ خاندان ولی اللّٰہی کے گل سرسبد، علم و فضل کا بحر ذخار اور دین ودانش میں یکتا ہیں ان سے متعلق عجیب و غریب واقعہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ درس ہو رہا تھا اچانک دہلی کے چند افراد ایک ضعیف العمر شخص کو لیکر آ پہونچے عرض کیا کہ یہ بڑے میاں ایک فرنگی کے ہاں ملازم ہیں۔ انھوں نے آج اس کی جھوٹی چائے پی لی۔ شاہ صاحب نے واقعہ کی تفصیل سن کر زور سے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ پھر فرمایا:

"اوہو بڑی خطرناک بات پیش آگئی مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لئے مجھے کتابیں دیکھنا ہوں گی وقفہ ڈال کر آؤ۔"

لکھا ہے کہ آنے والے حیران و پریشان بوجھل قدموں کے ساتھ نکل گئے، دو روز کے بعد پھر بڑے میاں کو کشاں کشاں لئے مجلس درس میں پہونچے شاہ صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا:

"اوہو بڑی خطرناک بات پیش آگئی اچھا ان بڑے میاں کو غسل کراؤ۔"

غسل کے بعد تجدید ایمان اور دوبارہ نکاح پڑھا کر عہد لیا کہ آئندہ کسی فرنگی کا جھوٹا نہ کھائیں گے پیئں گے۔ موجود طلبہ اس سارے تماشہ کو حیرت کیساتھ دیکھ رہے تھے جب وہ رخصت ہوگئے تو عرض کیا کہ حضرت "اہل کتاب" کا جھوٹا تو کھایا پیا جا سکتا ہے پھر آپ نے پاپڑ کیوں بیلے؟ اس پر شاہ صاحبؒ کا جواب سننے کے قابل ہے۔ فرمایا:

"مسئلہ تو یوں ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو مگر میں اگر کچھ چھوٹ دیتا تو آئندہ خدا جانے علماء ملا کا کیا عالم ہوتا اس لئے بربنیاد احتیاط یہ سب کچھ کیا۔"

انبیٹا ضلع سہارنپور کے ایک رسمی واعظ کا قصہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے آدمی ثقہ و
دیانتدار تھے "امین و صادق القول" ہندو مسلم کسی جھگڑے میں ہندوؤں نے بطور شاہد انھیں واعظ
صاحب کو نامزد کیا انگریز حاکم عدالت کی طلبی پر اس شان سے پہونچے کہ عدالت میں داخل ہوتے
وقت اپنی پشت حاکم کی جانب کر لی گویا کہ فرنگی کا چہرہ دیکھنا بھی حرام تھا۔ حاکم اس رمز کو سمجھتا تھا اس
نے واعظ صاحب کی معصومیت پر زیر لب مسکرایا قریب ہو کر مخاطب ہوئے تو اس طرح کہ۔

"کہو بھائی کافر کیا کہے"

ہرگز نہ سمجھئے کہ یہ تنفر یا تشدد طبقہ علماء ہی میں تھا یا صرف سنیوں میں مشہور شاعر امداد امام
اثر جو شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ علی امام۔ حسن امام دونوں کے متعلق یقین رکھتے کہ مع اہل و عیال
کرسٹان ہو گئے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فرنگیوں سے نفرت و عداوت کے اس تند و تیز ماحول میں غریب
سرسید احمد کی آواز جو صرف قومی ہمدردی اور مفلوک الحال مسلمانوں کے حال زار پر اپنے فکر کے مطابق
ایک علاج تھا اور جو واقعہ "تیر بہدف" ثابت ہوا، مگر جس گرد و پیش میں سرسید جس نسخہ سے کام
لیکر زبوں حالی بلکہ بدحالی کا علاج کرنا چاہتے تھے اس تلخ گھونٹ کو پینے کے لئے تیار کون ہوتا؟
حالانکہ مسلم معاشرہ میں "چار فقے" چار مکاتب تصوف وغیرہ ہمیشہ رہے اور اسلاف نے قبول حق
کی راہیں شروع ہی سے کھلی رکھیں۔

ہم جو صدا سرسید کے نہاں خانۂ باطن سے اٹھی بے ہنگم نہ تھی بے ہنگام ضرور سمجھی گئی، پھر دوسری
طرف خود سرسید بھی اپنے تجویز کردہ علاج میں کچھ اعتدال سے ضرور ہٹ گئے تھے حالات میں دین
کو قابل قبول اور حقائق دین کو خوشگوار بنانے کے لئے جس سطح سے انھوں نے کام کیا وہ تعبیرات کے
[illegible] بعض مواقع پر انکار کی حدود میں داخل ہو گئیں۔

مثلاً مسئلہ معراج، شق صدر، حساب کتاب، میزان عمل، جنت و جہنم، ابلیس و جنات، ملائکہ اور
ان سے متعلق کچھ ایسی چیزیں ان کے قلم پر آگئیں جن کی زد طے شدہ اسلامی عقائد پر براہ
[illegible]

دوسری جانب سرسید کے قلم سے قرآن کی تفسیر متنازع فیہ مسئلہ بن گیا، عجیب بات ہے کہ قدیم

دور سے بعض ذالفین کی تفسیری محنت سب سے زیادہ زیر بحث آئی۔ ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر سے لیکر قریبی دور میں عنایت اللہ مشرقی۔ تفسیر محمد علی قادیانی تک مخالفت کا ہنگامہ برپا رہا۔ اور یہ نہ سمجھیے کہ یہ ہنگامہ دیوبند سے باہر حلقہ کی تفسیری کاوشوں سے متعلق تھا۔ نہیں ایسا نہیں۔ مولانا عبداللہ سندھی جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے مایۂ ناز شاگرد اور آپکی تحریک استخلاص وطن کے طاقتور کارکن ہیں ان کی تفسیر سے متعلق بھی علماء دیوبند کے یہاں اختلاف رائے کا غلغلہ ہے مشہور مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری جو قرآن کی تفسیر ایک خاص انداز پر کرتے اور جن کے حلقۂ تلامذہ میں علی میاں ندوی بھی ہیں ان کی تفسیر سے کسی اور نے نہیں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اختلاف کیا بات یہ ہے کہ تفسیر مذلۃ الاقدام موضوع ہے ذرا سی بے احتیاطی سے مفسر کے قدم تفسیر بالرائے کی مذموم دشت نوردی میں الجھ جاتے ہیں۔

مناسب رہے گا کہ اس موقعہ پر تفسیر بالرائے سے متعلق میں کچھ معروضات آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ میرا خیال ہے کہ تفسیر بالرائے پر سب ہی مفسرین و محققین نے گفتگو کی ہے لیکن تفسیر خازن کے مقدمہ میں تفسیر بالرائے کو سمجھانے کے لئے مختصر لیکن نہایت دلچسپ لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

"سالقہ امتیں اپنے انبیاء پر نازل کتابوں کی تفسیر بالرائے میں مبتلا ہوئیں اس پر جسارت آغاز کا انجام بد تحریف و تاویل بلکہ کتمان حق پر ہوا اس مذموم اقدام پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شدید نکیر فرمائی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پر نازل قرآن مجید میں اسی جاہلانہ بلکہ معاندانہ روش کا دروازہ ہمیشہ کے لئے یہ فرماتے ہوئے بند کر دیا" من قال فی القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار"

قرآن و حدیث کی اس وعید پر امت ایک دو راہے پر آکھڑی ہوئی جسمیں ایک نظریہ بن گیا کہ تفسیر ممکن نہیں تا وقتیکہ اس کی تائید میں کوئی حدیث نہ ہو اس نقطۂ نظر میں اس درجہ غلو برتا گیا کہ تائید احادیث کی مختلف اقسام بھی سامنے نہ رہیں، یعنی یہ امتیاز بھی چھوڑ دیا گیا کہ آیا مؤید حدیث صحیح ہے یا حسن، ضعیف ہے یا مجروح، موضوع ہے یا موقوف، مرسل ہے یا منکر، مشہور ہے یا شاذ بس حدیث کے نام پر جو کچھ ملتا رہا، اہل علم اسی کو قرآن کی تفسیر بنا کر پیش کیا جاتا رہا۔ اس کے بالمقابل ایک دوسرا نقطہ بروئے کار آیا کہ قرآن کی تفسیر اپنے مزعومات، اپنے افکار، اپنے رجحانات اپنے میلانات بلکہ

فہم کے مطابق مضامین سے کی جانے لگی اس طبقہ نے ان احادیث کو بھی نظرانداز کر دیا جو واقعۃً قرآن کی تشریح وتفسیر نہیں بلکہ اس ماحول کو پس پشت ڈالا جس میں قرآن کا نزول ہو رہا تھا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ان اقوال کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جو قرآن کی تفسیر سے تعلق رکھے۔ حالانکہ یہی قرآن کے مخاطب اول تھے اور تو اور اس زبان کے اسلوب، لطافت، نزاکت، خصوصیات سے بھی نظر ہٹالی جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا تھا۔"

سیوطی نے مقدمہ قرآن کے طور پر باقاعدہ ایک تصنیف قلمبند کی جس کا نام "الاتقان علوم القرآن" ہے۔ حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف اپنی عقل خام سے چارہ ساز حلقہ نے تفسیر قرآن میں کیسی جاہلانہ گلکاریاں کیں اس کی دلچسپ داستان سناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایک شخص قرآن کی تفسیر کرنے کے لئے بیٹھے تو ابراہیمؑ کی اس درخواست کی کہ "اے رب دکھادے تو مجھے کہ کس طرح زندہ کرے گا مردوں کو" ابراہیم ایسے موحد، صاحب یقین پیغمبر سے جب اس درخواست کا تک اس عجیب وغریب مفسر کو سمجھ میں نہ آیا تو اس کے افلاطونی علم نے شکست کھانے کے بجائے فی الفور ایک جواب تیار کر لیا کہ یہ درخواست ابراہیم کی اپنے لئے نہیں بلکہ "قلبی" نامی اپنے جگری دوست کے لئے تھی۔"

دیکھا آپ نے کہ صرف عقل کی روشنی میں قرآن کو حل کرنے والے کن گھٹاٹوپ اندھیریوں میں الجھتے رہا اور الجھاتے رہے یہ بھی لکھا کہ "میتۃ" "لحم خنزیر" ایک ناشائستہ اور ایک نابکار مرد کا نام ہے جس سے قرآن مجید نے مسلم معاشرہ کو اس وقت میل جول رکھنے سے باز رکھا تھا، خرافاتی ان قصوں کو بقول ابومسلم اصفہانی نقل بھی صرف اس لئے کیا جا سکتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ مدعیان علم میں ایسے احمقوں کی بھی کمی نہیں۔

یہی دو نقطہ نظر جب آپس میں دست وگریباں ہوئے یعنی ایک قرآن کی تفسیر کے لئے حدیث کی ضرورت ہے خواہ وہ کسی درجہ کی تفسیر ہو۔ دوسرا نظریہ کہ تفسیر کے لئے کسی حدیث کی ضرورت نہیں۔ اور خارجی خصوصیات کی تو تفسیر خازن نے بتایا کہ یہ دوسرا نظریہ تفسیر بالرائے کے مفہوم کو واضح کرتا۔ اور تفسیر بالرائے وہ ہے جس سے ضروریات دین کا انکار ہوتا ہو، یا متواترات دین کی حقیقت بدلتی ہو یا مسلمانوں کے اجتماعی عقیدہ کی تبدیلی ہوتی ہو۔

خیال یہ ہے کہ صاحب تفسیر خازن نے تفسیر بالرائے پر وہ جچی تلی بات کہدی جس سے ممنوع تفسیر

دور سے بعض زائغین کی تفسیری محنت سب سے زیادہ زیر بحث آئی۔ ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر سے لیکر قریبی دور میں عنایت اللہ مشرقی۔ تفسیر محمد علی قادیانی تک مخالفت کا ہنگامہ برپا رہا۔ اور یہ نہ سمجھیے کہ یہ ہنگامہ دیوبند سے باہر حلقہ کی تفسیری کاوشوں سے متعلق تھا۔ نہیں ایسا نہیں۔ مولانا عبداللہ سندھی جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے مایۂ ناز شاگرد اور آپکی تحریک استخلاص وطن کے طاقتور کارکن ہیں ان کی تفسیر سے متعلق بھی علماء دیوبند کے یہاں اختلاف رائے کا غلغلہ ہے مشہور مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری جو قرآن کی تفسیر ایک خاص انداز پر کرتے اور جن کے حلقۂ تلامذہ میں علی میاں ندوی بھی ہیں ان کی تفسیر سے کسی اور نے نہیں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اختلاف کیا بات یہ ہے کہ تفسیر مزلۃ الاقدام موضوع ہے ذراسی بے احتیاطی سے مفسر کے قدم تفسیر بالرائے کی مذموم دشت نوردی میں الجھ جاتے ہیں۔

مناسب رہے گا کہ اس موقعہ پر تفسیر بالرائے سے متعلق میں کچھ معروضات آپ کے سامنے پیش کر دوں، میرا خیال ہے کہ تفسیر بالرائے پر سب ہی مفسرین و محققین نے گفتگو کی ہے لیکن تفسیر خازن کے مقدمہ میں تفسیر بالرائے کو سمجھانے کے لئے مختصر لیکن نہایت دلچسپ لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

"سابقہ امتیں اپنے انبیاء پر نازل کتابوں کی تفسیر بالرائے میں مبتلا ہوئیں اس پر جسارت آغاز کا انجام بد تحریف و تاویل بلکہ کتمان حق پر ہوا اس مذموم اقدام پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شدید نکیر فرمائی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پر نازل قرآن مجید میں اسی جاہلانہ بلکہ معاندانہ روش کا دروازہ ہمیشہ کے لئے یہ فرماتے ہوئے بند کر دیا "من قال فی القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار"

قرآن و حدیث کی اس وعید پر امت ایک دو راہے پر آکھڑی ہوئی جسمیں ایک نظریہ بن گیا کہ تفسیر ممکن نہیں تا وقتیکہ اس کی تائید میں کوئی حدیث نہ ہو اس نقطۂ نظر میں اس درجہ غلو برتا گیا کہ تائیدی احادیث کی مختلف اقسام بھی سامنے نہ رہیں، یعنی یہ امتیاز بھی چھوڑ دیا گیا کہ آیا مؤید حدیث صحیح ہے یا حسن، ضعیف ہے یا مجروح، موضوع ہے یا موقوف، مرسل ہے یا منکر، مشہور ہے یا شاذ بس حدیث کے نام پر جو کچھ ملتا رہا، الم غلم اسی کو قرآن کی تفسیر بنا کر پیش کیا جاتا رہا۔ اسکے بالمقابل ایک دوسرا نظریہ بروئے کار آیا کہ قرآن کی تفسیر اپنے مزعومات، اپنے افکار، اپنے رجحانات اپنے میلانات بلکہ اپنے

فہم کے مطابق مضامین سے کی جانے لگی اس طبقہ نے ان احادیث کو بھی نظرانداز کر دیا جو واقعہ قرآن کی تشریح و تفسیر نہیں بلکہ اس ماحول کو پس پشت ڈالا جس میں قرآن کا نزول ہو رہا تھا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ان اقوال کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جو قرآن کی تفسیر سے تعلق رکھے۔ حالانکہ یہی قرآن کے مخاطب اول تھے اور تو اور اس زبان کے اسلوب، لطافت، نزاکت، خصوصیات سے بھی قطع نظر ہٹالی جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا تھا۔"

سیوطی نے مقدمہ قرآن کے طور پر باقاعدہ ایک تصنیف قلمبند کی جس کا نام" الاتقان علوم القرآن" ہے۔ حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف اپنی عقل خام سے چارہ ساز حلقہ نے تفسیر قرآن میں کیسی جاہلانہ گلکاریاں کیں اس کی دلچسپ داستان سناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" ایک شخص قرآن کی تفسیر کرنے کے لئے بیٹھے تو ابراہیمؑ کی اس درخواست کی کہ" اے رب دکھا دے تو مجھے کہ کس طرح زندہ کرے گا مردوں کو" ابراہیم ایسے موحد، صاحب یقین پیغمبر سے جب اس درخواست کا تک اس عجیب و غریب مفسر کو سمجھ میں نہ آیا تو اس کے افلاطونی علم نے شکست کھانے کے بجائے فی الفور ایک جواب تیار کر لیا کہ یہ درخواست ابراہیم کی اپنے لئے نہیں بلکہ" قلبی" نامی اپنے جگری دوست کے لئے تھی۔"

دیکھا آپ نے کہ صرف عقل کی روشنی میں قرآن کو حل کرنے والے کن گھٹاٹوپ اندھیریوں میں الجھتے رہے اور الجھاتے رہے یہ بھی لکھا کہ" میتہ"،" لحم خنزیر" ایک ناشائستہ اور ایک نابکار مرد کا نام ہے جس سے قرآن مجید نے مسلم معاشرہ کو اس وقت میل جول رکھنے سے باز رکھا تھا، خرافاتی ان قصوں کو بقول ابو مسلم اصفہانی نقل بھی صرف اس لئے کیا جا سکتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ مدعیان علم میں ایسے احمقوں کی بھی کمی نہیں۔

یہی دو نقطۂ نظر جب آپس میں دست و گریباں ہوئے یعنی ایک قرآن کی تفسیر کے لئے حدیث کی ہر حال ضرورت ہے خواہ وہ کسی درجہ کی تفسیر ہو دوسرا نظریہ کہ تفسیر کے لئے کسی حدیث کی ضرورت نہیں۔ اور نہ خارجی خصوصیات کی تو تفسیر خازن نے بتایا کہ یہ دوسرا نظریہ تفسیر بالرائے کے مفہوم کو واضح کرتا۔ اور تفسیر بالرائے وہی ہے جس سے ضروریات دین کا انکار ہوتا ہو، یا متواترات دین کی حقیقت بدلتی ہو یا مسلمانوں کے کسی اجتماعی عقیدہ کی تبدیلی ہوتی ہو۔

خیال یہ ہیکہ صاحب تفسیر خازن نے تفسیر بالرائے پر وہ جچی تلی بات کہدی جس سے ممنوع تفسیر

...ئے کی حقیقت چھن چھنا کر سامنے آگئی۔

مذکورہ بالا شرائط کے تحت اب اگر کوئی تفسیر لگے بندھے انداز میں کرتا ہے تو کون ہے جو اسے تفسیر سے
...لک دے گا اہل علم کا کام ہی ہے کہ قرآن مجید میں نت نئے پہلوؤں کا انکشاف کرتے رہیں اس کے اسرار
...ے نقاب کشائی ہو مستور حقائق کو اجاگر کیا جائے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ یہ اہم کام وہی کریں گے جنکی
...ندین و متاخرین کے علوم پر ہو، جو ہی سنی سنائی نہیں بلکہ حقیقی واقفیت ہو احادیث کا ذخیرہ
...و اقوال صحابہ پر بھرپور نظر ہو، چونکہ قرآن ایک رواں دواں چشمہ صافی ہے احادیث اس کے سوتے
...نود حدیث کی متشابہات کی جانب رجوع کئے بغیر سمجھ میں نہیں آئی اس لئے مفسر کے لئے ضروری ہوگا
...شا بھی ہو اور فقیہ بھی یا کم از کم حدیث و فقہ پر مبصرانہ نظر رکھتا ہو۔

شاہ عبدالعزیز الدہلوی نے تفسیر سے متعلق شرائط کو بڑے اختصار کیساتھ اس طرح پیش فرمایا؛
مفسر جو کچھ معنی قرآن کے بیان کر رہا ہے وہ لفظ کے حقیقی معنی ہوں یا مجاز متعارف۔
سیاق و سباق کی بھرپور رعایت ہو۔
قول رسول سے استشہاد کہ قرآن کا نزول آپ پر ہوا۔
اقوالِ صحابہ سے استشہاد کہ قرآن کے مخاطب اول وہی تھے۔

تفسیر بالرائے پر مختصراً جو کچھ عرض کر چکا ہوں اسے سامنے رکھکر سرسید احمد خان کی تفسیری کاوشوں
...ے میں فیصلہ چنداں مشکل نہ رہا خطوط و لائنیں متعین ہو چکی ہیں اہل علم و اہل نظر کسی دستگیری
...ج نہ رہے۔

...رہا مسئلہ کہ تحریک دیوبند کے اثرات کیا سامنے آئے اور تحریک علی گڑھ نے کیا اثرات چھوڑے؟
...ب اس کا یہ ہے کہ ہر دو تحریک کے اساسی مقاصد کو سامنے رکھکر کامیابی و ناکامی کا فیصلہ دشوار

...ہلی کے خانوادہ شاہ ولی اللہ سے لیکر ہندوستان کی آزادی کے نمود سپیدۂ سحر تک گئی ہوئی
...واپس لانے یا فرنگی اقتدار کو ہندوستان سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد، دین کی حفاظت کا وہ
...نا مقصد جسے فرنگی اقتدار تباہ و تاراج کرنے پر تلا ہوا تھا نتائج آج اسکے آپ سب کے
...ہا۔

ہندوستان، بنگلہ دیش بلکہ جہاں تہاں دارالعلوم دیوبند کے فضلاء پہونچے اور انھوں نے انھیں خطوط پر کام شروع کیا جو تحریک دیوبند کا مقصد تھا۔ اشاعتِ دین، اسلام سے وابستگی کا جذبہ ایمان و ایمانیات پر استقامت نیک عمل کی راہوں کا کھلنا اور مسلم معاشرہ کو اسلام سے وابستہ رکھنا سب کے سامنے ہے۔

ادھر تحریک علی گڑھ نے جو مقاصد اپنے لئے متعین کئے تھے لاریب وہ اس میں کامیاب ہے لاکھوں نوجوانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنا مسلمانوں میں علوم جدیدہ کے حصول کا شغف پیدا کرنا نئے حالات میں مسلمانوں کی پسماندگی کو پیش قدمی سے بدلنا، ترقی کی جانب رواں دواں قوموں میں مسلمانوں کو شریک کرنا ہزاروں کالجوں کا کھلنا اور اس کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ میں آسودگی و آسائش کے سامان بہم پہونچانا، تحریکِ علی گڑھ کے زرّیں کارنامے ہیں، نیز ہند، پاکستان، بنگلہ دیش اور غیر منقسم ہندوستان میں اہم عہدوں پر علیگڑھ سے فاضل نوجوانوں کا بہم پہونچنا، سرسید احمد خاں کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

اردو ادب پر بھی ان کی تحریک براہِ راست اثر انداز ہوئی۔ سیاست میں اگرچہ ابتداء میں ان کا نقطۂ نظر کانگریس کی مخالفت رہا لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس گوشہ میں منفرد تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے جملہ منتسبین خود اسی رائے کے حامل تھے۔

پھر یہ بھی ہے کہ سرسید تحریک سے وابستہ خاص افراد جن میں محسن الملک مرحوم بھی ہیں یہ بتاتے رہے کہ سرسید کا ابتدائی نظریہ وہی تھا جو سب کو معلوم ہے لیکن وہ اپنے دل و دماغ میں بالآخر فرنگی اقتدار کے استیصال کا جذبہ پنہاں رکھتے چنانچہ ڈاکٹر سید محمود جو بعد میں کانگریس کے ایک مقتدر راہنما اور مرکزی کابینہ کے رکن رہے ان کا مقالہ متعلقہ محسن الملک مرحوم بوضاحت موجود ہے۔ محسن الملک نے کانگریس سے متاثر علی گڑھ کے طلبہ سے بارہا کہا کہ نہ میں کانگریس کا مخالف ہوں اور نہ سرسید کانگریس کو "شجرِ ممنوعہ" قرار دیتے تھے، بلکہ سرسید سمجھتے کہ ابھی قوم جہادِ آزادی کے لئے تیار نہیں وقت آنے پر حصولِ آزادی کا یہ صور علی گڑھ کی فضاؤں میں بھی پھونک دیا جائے گا۔

عجب نہیں کہ ان کی یہ سیاسی روش علی گڑھ کو انگریز دشمنی سے محفوظ رکھنے کا ایک وقتی حربہ ہو اور یہ خود دیوبند میں ہو چکا۔

مولانا محمود حسنؒ المعروف بشیخ الہند نے اپنی سیاسی دلچسپیوں کے زمانہ میں مولانا حافظ احمد صاحبؒ

...الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم سے فرمایا تھا کہ:۔
"...صاحبان دارالعلوم کی علمی سرگرمیوں کو باقی رکھتے ہوئے انگریز عداوت سے
اس ادارہ کا تحفظ کریں اور مجھے اپنی سیاسی مشغولیت کے لئے آزاد چھوڑ دیں"
حافظ صاحب اور نائب مہتمم صاحب نے حضرت مرحوم ہی کی تلقین کے مطابق جو طرز اپنایا تھا اسے بھی
بعض متشدد و غلو پسندوں نے انگریزی کاسہ لیسی کا بدترین عنوان دے رکھا تھا۔
اگر محسن الملک کی وضاحت قبول کی جائے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے قبول نہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ
سرسید مرحوم کی پالیسی اپنے تعلیمی کاروبار، علیگڈھ اسکول کے حفاظتی پروگرام پر مبنی تھی، انھیں انگریز
کا کاسہ لیس قرار دینا یا فرنگی اقتدار سے مرعوب شخصیت بتانا تاریخ کو منہ چڑھانا ہے ان کے بعض مذہبی
وسیاسی افکار سے اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن اختلافات سے آدمی کی خدمات اور اسکی عظمت کی قدر
و قیمت کم نہیں ہوتی۔

سرسیّد نے نیک نیتی سے مسلمانوں کے دنیوی مستقبل کی تعمیر و ترقی کا جو پرواز ڈالا تھا آنیوالے
وقت نے اس پرواز کی اہمیت و ضرورت کو گھٹایا نہیں بڑھایا ہے یہ بات الگ ہے کہ ان کی تعلیمی پالیسی میں
خامیاں اور کمزوریاں بھی اہل نظر نے محسوس کیں مگر کسی عظیم الشان کام کو عملی جامہ پہنانے میں فطری طور
پر جو کمیاں رہ جاتی ہیں وہ اس کی دلیل نہیں ہوتیں کہ سرے سے اس کام کی نفی کردی جائے اور اسکو نشانہ بنا کر
کام کرنے والی ذات کے بارے میں زبان درازی کیجائے کسی بڑے کام میں جو خامیاں باقی رہ جاتی ہیں بعد میں
آنے والوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اگر سرسیّد کی تعلیمی راہوں پر چلنے والا
قافلہ وجود پذیر نہ ہوتا تو شاید ملک کو اوپر اٹھانے کے لئے ایک مسلمان گاندھی کی ضرورت پیش آتی اور ایک
مسلم وطن تحریک اس تیز رفتار اور راکٹ و ایٹم کے دور میں اپنا وجود نہ منوا سکتی۔ جبکہ ہندوستان کے
دونوں جانب چھوٹی ہی سہی مگر دو آزاد مسلمان ریاستوں کا وجود آج نظر آتا ہے اور خود ہندوستان کی قومی وسیاسی
جماعتوں میں بہت سے مسلمان لیڈر اسی سرسید تحریک کے آفریدہ ہیں۔ اس لئے سرسیّد کے بعض مذہبی خیالات
سے اختلاف کے باوجود سرسید کی قومی اور ملّی خدمت کی تحقیر و تخفیف کسی طرح بھی درست نہیں اور بعض
بزرگانِ دیوبند کے حوالے سے یہ بات بلا تکلّف کہی جاسکتی ہے کہ سرسید کی نیک نیتی اور ملّی اخلاص کی بناء پر
انکی نجات و مغفرت کی رب کریم سے قوی توقع ہے۔ " واللہ ذوالفضل العظیم "۔

برہان

جلد ۱۰۹ | مئی ۱۹۹۲ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۵

عمید الرحمن عثمانی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا

مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم سے فرمایا تھا کہ :-

"آپ دونوں صاحبان دارالعلوم کی تعلیمی سرگرمیوں کو باقی رکھتے ہوئے انگریز عداوت سے
اس ادارہ کا تحفظ کریں اور مجھے اپنی سیاسی مشغولیت کے لئے آزاد چھوڑ دیں"

حافظ صاحب اور نائب مہتمم صاحب نے حضرت مرحوم ہی کی تلقین کے مطابق جو طرز اپنایا تھا اسے بھی
بعض متشدد و غلو پسندوں نے انگریزی کاسہ لیسی کا بدترین عنوان دے رکھا تھا۔

اگر محسن الملک کی وضاحت قبول کی جائے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے قبول نہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ
سرسید مرحوم کی پالیسی اپنے تعلیمی کاروبار علیگڈھ اسکول کے حفاظتی پروگرام پر مبنی تھی، انھیں انگریز
کا کاسہ لیس قرار دینا یا فرنگی اقتدار سے مرعوب شخصیت بتانا تاریخ کو منہ چڑھانا ہے ان کے بعض مذہبی
و سیاسی افکار سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اختلافات سے آدمی کی خدمات اور اسکی عظمت کی قدر
و قیمت کم نہیں ہوتی۔

سرسید نے نیک نیتی سے مسلمانوں کے دنیوی مستقبل کی تعمیر و ترقی کا جو پرواز ڈالا تھا آنیوالے
دنیا سے اس پرواز کی اہمیت و ضرورت کو گھٹا یا نہیں بڑھا یا ہے یہ بات الگ ہے کہ ان کی تعلیمی پالیسی میں
خامیاں اور کمزوریاں بھی اہل نظر نے محسوس کیں مگر کسی عظیم الشان کام کو عملی جامہ پہنانے میں فطری طور
پر جو کمیاں رہ جاتی ہیں وہ اس کی دلیل نہیں ہوتیں کہ سرے سے اس کام کی نفی کر دی جائے اور اسکو نشانہ بنا کر
کام کرنے والی ذات کے بارے میں زبان درازی کیجائے کسی بڑے کام میں جو خامیاں باقی رہ جاتی ہیں بعد میں
آنے والوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں، اگر سرسید کی تعلیمی راہوں پر چلنے والا
قافلہ وجود پذیر نہ ہوتا تو شاید ملک کو دو پر اٹھانے کے لئے ایک مسلمان گاندھی کی ضرورت پیش آتی اور ایک
مسلم وطن تحریک استبزر نتا اور راکٹ و ایٹم کے دور میں اپنا وجود نہ منوا سکتی۔ جبکہ ہندوستان کے
دونوں جانب چھوٹی اسی گر دو آزاد مسلمان ریاستوں کا وجود آج نظر آتا ہے اور خود ہندوستان کی قومی و سیاسی
جماعتوں میں بہت سے مسلمان لیڈر اسی سرسید تحریک کے آفریدہ ہیں۔ اس لئے سرسید کے بعض مذہبی خیالات
سے اختلاف کے باوجود سرسید کی قومی اور ملی خدمات کی تحقیر و تخفیف کسی طرح بھی درست نہیں اور بعض
بزرگان دیوبند کے حوالے سے یہ بات بلا تکلف کہی جاسکتی ہے کہ سرسید کی نیک نیتی اور ملی اخلاص کی بناء پر
انکی نجات و مغفرت کی رب کریم سے قوی توقع ہے۔ " واللہ ذو الفضل العظیم "

کے
کے
محتا
نہید
نکرا
ام و
اسے

برہان

جلد ۱۰۹ — مئی ۱۹۹۲ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ — شمارہ ۵

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا

نظرات

افغانستان میں انقلاب

مشہور رہے کہ انقلاب اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ اس کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ حال ہی میں افغانستان میں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ وہ بھی اسی مقولہ کے حق میں شہادت دے رہا ہے۔

افغانستان سے سوویت یونین کی بیدخلی کے بعد سمجھ لیا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں وہاں اقتدار کی منتقلی کا کام پرامن ڈھنگ سے ہو جائے گا۔ اور ایک نیا آزاد افغانستان جنم لے گا۔ لیکن توقعات کے برعکس افغانستان میں ان ہی انقلاب پسند دھڑوں میں باہمی جنگ شروع ہو گئی۔ جنھوں نے مسلسل بارہ برس تک ملکی آزادی کے لئے کابل کی سوویت کٹھ پتلی حکومت اور خود سوویت یونین کی فوج سے جنگ کی تھی۔ قدرت کی عجب ستم ظریفی ہے کہ جنھوں نے حریت وطن کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں اور غلام بننا منظور نہ کیا وہ آج آپس میں برادرکشی میں مصروف ہیں۔

اقوام متحدہ کا نمائندہ مسٹر ساون کابل پہونچا ہوا تھا۔ اس دوران میں احمد شاہ مسعود کے دھڑے نے جو حریت نواز دھڑوں میں سب سے بڑا تھا کابل کے دروازہ پر اپنی فوج لا کھڑی کی۔ اس دوران میں صدر نجیب اللہ کو معزول کر دیا گیا۔ اور اقتدار ایک عبوری کونسل کے سپرد کر دیا گیا۔ جناب مجددی کو حکومت کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے پاکستان سے کابل پہونچکر اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ اس دوران میں نجیب اللہ اقوام متحدہ کے نمائندہ مسٹر ساون کے دفتر میں چھپے رہے۔ چونکہ ان پر روز بروز مقدمہ چلانے کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ ابھی یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ احمد شاہ مسعود کی فوج کابل میں داخل

ہوگئی۔ اس کے بعد دوسرے دھڑوں کی گوریلا افواج نے بھی کابل کا رخ کیا۔ ان میں سب سے بڑا گروپ گلبدن حکمت یار کا ہے۔ حکمت یار نے ابھی عبوری کونسل کو تسلیم نہیں کیا۔ کابل کے مضافات میں تادم تحریر جنگ ہورہی ہے۔ احمد شاہ مسعود کے اصل حریف حکمت یار کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ مختلف گروپوں کو متحد نہ کرسکے۔ پاکستان میں صوبہ سرحد سے لڑی جانے والی افغانستان کی جنگ آزادی کی ایک اچھا پہلو یہ تھا کہ بڑی ہمت اور حوصلہ سے یہ جنگ لڑی گئی اور اس کا ایک کمزور پہلو یہ تھا کہ سات یا آٹھ سے بھی زیادہ گوریلا حریت پسند گروپ کئی بار کی کوششوں کے باوجود آپس میں متحد نہ ہوسکے۔ نتیجہ غیر قدرتی نہیں ہے۔ اب جب آزادی بالکل سامنے ہے۔ یہ گروپ آپس میں ہی لڑ رہے ہیں اس وقت جبکہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں۔ کابل میں ان گروپوں کے درمیان جنگ بندی ہوچکی ہے۔ لیکن چار یا پانچ دنوں میں یہ جنگ بندی کم از کم تین بار ٹوٹ چکی ہے۔ افغانستان کی یہ صورت حال کب ختم ہوگی۔ اور وہاں انقلاب کی ایک نئی صبح کب طلوع ہوگی، اس کا جواب مستقبل کے پردہ میں پوشیدہ ہے۔

لیبیا کی ناکہ بندی

خلیجی جنگ میں عراق کی شکست کے بعد اور ادھر عالمی سیاسیات کے منظر سے سوویت یونین کے ہٹ جانے سے، امریکہ اب دنیا کی واحد بڑی طاقت بن گیا ہے اور روز بروز اس کا حوصلہ بڑھتا جارہا ہے۔ چنانچہ اس کا دوسرا نشانہ لیبیا ہے۔ اقوام متحدہ کی حیثیت اب ایک مغربی بلاک کی طرح ہے۔ جو کچھ امریکہ اور اس کے حلیف مغربی ممالک چاہتے ہیں وہی اقوام متحدہ میں منظور ہوتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایک ریزرولیشن پیش کیا۔ جس میں لیبیا سے فضائی تعلقات اور اسے اسلحہ کی سپلائی روکنے کی بات کہی گئی تھی۔ لیبیا کا قصور کیا تھا۔ دو برس قبل ایک پان امریکن طیارہ اسکاٹ لینڈ کی فضا میں تباہ ہوا تھا اس حادثہ میں تقریباً ۳۰۰ اشخاص ہلاک ہوگئے تھے۔ امریکہ کو شبہ ہے کہ یہ واقعہ تخریب کاری کا

نتیجہ تھا۔ اور اس میں دو لیبیائی باشندوں کا ہاتھ تھا۔ امریکہ کی مانگ تھی کہ ان دو باشندوں کو اس کے حوالے کر دے۔ تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جا سکے۔ لیبیا کے کرنل قذافی نے ان دو باشندوں کو امریکہ کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ یہ پیشکش کی کہ وہ ان دو باشندوں کو عرب لیگ کے حوالہ کر دے گا۔ لیکن اس پر امریکہ رضامند نہ ہوا۔ اب جبکہ اقوام متحدہ پندرہ اپریل سے لیبیا کے خلاف فضائی ناکہ بندی کا اعلان کر چکی ہے۔ اس معاملہ کا سلجھنا آسان نہیں۔ اگر اس ناکہ بندی کا بھی لیبیا پر اثر نہ ہوا تو اقوام متحدہ کیا کارروائی کرے گی۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ ناکہ بندی عراق جیسی ثابت نہ ہوگی۔ چونکہ کئی ممالک نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ہے یوں عرب لیگ کے دل میں بھی لیبیا کے متعلق نرم گوشے ہیں کئی عرب ممالک ان پابندیوں پر عمل نہیں کریں گے۔ یہ ناکہ بندی لیبیا کو امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کرے گی۔

لیبیا ایک چھوٹا اور کمزور ملک ہے۔ امریکہ کو اسکی اکڑ بہت بری لگ رہی ہے۔ امریکہ اب خود کو دنیا بھر کا پولیس مین سمجھتا ہے۔ جو اس سے آنکھیں چار کرے گا سزا بھگتے گا۔ دنیا بھر میں اپنی برتری کا سکہ جمانا چاہتا ہے۔ اب اس نے ہندوستان پر ڈورے ڈالنے شروع کئے ہیں۔ ادھر روس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے کہ وہ ہندوستان کو راکٹ ٹکنالوجی فراہم نہ کرے۔ روس ایک سمجھوتہ کے تحت اس ٹکنالوجی کی فراہمی کا پابند ہے۔ پارلیمنٹ میں امریکہ کے اس دباؤ پر بڑی لے دے ہوئی ہے۔ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ امریکہ تیسری دنیا کے ممالک کو دھونس دیکر اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہے۔ کیا امریکہ کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کا تدارک ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب تیسری دنیا کو تلاش کرنا ہے۔

امریکہ انصاف اور جمہوریت اور انسانی حقوق کا علم بردار بنتا ہے لیکن اس کا اصلی چہرہ اس وقت نظر آتا ہے جب بین الاقوامی معاملات میں وہ چھوٹے بڑے کمزور اور طاقتور کے درمیان امتیاز کرتا ہے۔ ہم یاد دلانا چاہیں گے کہ اسی امریکہ کا ایک مسافر بردار طیارہ سوویت یونین کی فضا سے گذر رہا تھا کہ سوویت ائر فورس نے اسے مار

گرایا۔ سوویت یونین کو شبہ تھا کہ یہ جاسوس طیارہ ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ مسافر بردار طیارہ ہے۔ اس معاملہ میں امریکہ نے سوویت یونین سے کوئی ٹکر نہیں لی۔ محض اس وجہ سے کہ سوویت یونین ایک طاقتور ملک تھا۔ اس کے مقابلہ میں لیبیا ایک معمولی ملک ہے اس لئے امریکہ اسے ایسے جرم کی سزا دینا چاہتا ہے۔ جو ابھی شبہ کے مرحلہ میں ہے۔

امریکی انصاف کا نمونہ

لاس انجلیس کا حالیہ فساد امریکی انصاف کی ایک ٹھوس مثال ہے۔ اس سے وہاں کا طرز فکر اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ لاس انجلیس میں ایک موٹر نشیں کو جو سیاہ فام تھا۔ سفید فام پولیس نے روکا۔ اور اسے کسی طرح کی خلاف ورزی پر بری طرح مارا پیٹا۔ جرم ثابت بھی نہیں ہوا تھا۔ اور سزا کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ سفید فام پولیس جس وقت اس کالے موٹر سوار کو زدوکوب کر رہی تھی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس کی فلم لے لی۔ یہ ایک ٹھوس ثبوت تھا امریکہ کی درندہ صفت پولیس کی سفاکی کا۔ خیر معاملہ جیوری میں پہنچا جیوری نے پولیس کو بری کر دیا۔ یہ واقعہ ایک چنگاری ثابت ہوا۔ اور لاس اینجلس میں امریکی تاریخ کا زبردست نسلی فساد ہوا۔ اور اس میں کالوں کا سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ امریکی سماج کی تہوں میں نسلی تعصب کا زہر موجود ہے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔

اس نسلی فساد میں کالے لوگوں کی زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ لاس انجلس کا یہ فساد دوسرے شہروں میں بھی پھیل گیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا سفید فام جیوری کیا کالوں کو انصاف دے سکتی ہے۔ اس واقعہ نے تو سارے امریکی نظام انصاف کو ہی مشتبہ بنا دیا ہے۔ چنانچہ بجا طور پر یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ جو ملک اپنے شہریوں کو ہی انصاف نہیں دے سکتا۔ وہ لیبیا کے ان دو باشندوں کو کیا انصاف دے سکتا ہے۔ جن کی حوالگی کی مانگ کی جا رہی ہے۔

امریکی انصاف اور انسانیت کا شکار ایک ملک عراق ہے جس کی اقتصادی ناکہ بندی

اقوام متحدہ کے ذریعہ کرائی گئی ہے۔ عراقی فوج جنگ میں ہار گئی۔ صدام حسین نے جنگ میں شکست کھائی ہے۔ لیکن وہ آج بھی عراق کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں۔ امریکہ انھیں برسراقتدار نہیں دیکھنا چاہتا۔ اب وہ دوسرے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔ چاہتا ہے کہ فاقوں سے اور مصائب سے تنگ آکر عراقی عوام صدام حسین کا تختہ الٹ دیں۔ لیکن امریکہ کا یہ خواب پورا ہوتا نہیں دکھائی دیتا۔

مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ
کی زندہ جاوید یادگار ندوۃ المصنفین
اور
بہی خواہوں کا فرض

مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ۱۰ رشعبان المعظم ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اور ساتھ ہی اس عظیم مشن اور نصب العین کو ہمارے کمزور کاندھوں پر چھوڑ گئے تھے۔ جس کو وہ زندگی بھر چلاتے رہے اس مشن اور نصب العین کا نام ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے بہی خواہ اور وابستگان کے تعاون سے بفضل خداوندی انکی یہ یادگار زندہ ہے۔ ہم درگاہ خداوندی میں دست بدعا ہیں کہ ان کی یہ یادگار جسے مفتی صاحب مرحوم نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ نہ صرف اسی طرح برقرار رہے بلکہ شب وروز ترقی کرے اور وہ مفتی صاحب مرحوم کے وابستگان اور عقیدتمندوں سے بجاطور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی ادارہ اور رسالہ برہان کی سرپرستی کرتے رہیں گے۔ اور اس طرح مفتی صاحب مرحوم کا مشن تکمیل کی جانب بڑھتا رہے گا۔

ادارہ برہان وادارہ ندوۃ المصنفین
جامع مسجد دہلی

نکاح کے لئے مرد اور عورت کا انتخاب

اسلامی شریعت پر ایک نظر

آخری قسط

از- مولانا محمد شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور

واقعہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کا ساتھ عمر بھر کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اخلاق و دینداری کو بنیاد نہ بنایا جائے تو ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر میاں بیوی میں رنجش پیدا ہوں اور زندگی کے مختلف موڑوں پر وہ ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکیں یا ان دونوں میں ہمیشہ کھٹ پٹ ہوتی رہے، جس کے باعث ان کی زندگی اجیرن بن جائے۔ اسی بنا پر ایک حدیث میں ایک نیک سیرت عورت کو ایک گرانمایہ شئے یا خداوند کریم کا سب سے بڑا عطیہ قرار دیا گیا ہے۔

"اَلدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ، وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ" یہ پوری دنیا ایک متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع ایک نیک سیرت عورت ہے۔[۱]

دینداری کے ساتھ ساتھ اگر کسی عورت میں مذکورۂ بالا خوبیاں بھی جمع ہو جائیں تو پھر سونے پر سہاگہ ہے۔ ورنہ بغیر دینداری کے دیگر تمام خوبیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیونکہ دینداری ہی کی بنا پر کسی عورت میں شوہر کی کامل اطاعت و فرماں برداری اور اس سے ہمدردی و وفاداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ نیز بعض روایات میں آتا ہے کہ بیاہ کسی اچھے قبیلے یا خاندان میں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ماں باپ کے عادات و اطوار عموماً بچوں میں بھی سرایت کر جاتے ہیں۔

"تَزَوَّجُوْا فِي الْحِجْزِ الصَّالِحِ، فَاِنَّ الْعِرْقَ دَسَّاسٌ" تم کسی اچھی اصل (قبیلے میں

---

[۱] مسلم رضاع ۲/۱۰۹۰، سنن نسائی ۶/۶۹، صحیح ابن حبان ۷/۳۵۱، مسند احمد (الفتح) ۱۶/۱۴۳، السنن الکبریٰ بیہقی ۷/۸۰

نکاح کرو کیونکہ (ماں باپ کے) اطوار بچوں میں بھی سرایت کرتے ہیں۔[1]

اسلام کے بعد دوسری بڑی نعمت

غرض ایک مسلمان اگر اپنی اسلامیت کے ساتھ ساتھ ایک خوبرو اور نیک خصلت بیوی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر وہ بڑا ہی خوش قسمت شخص ہے۔ جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح اس طرح آئی ہے۔

خَیْرُ فَائِدَۃٍ اَفَادَھَا الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ بَعْدَ اِسْلَامِہٖ اِمْرَأَۃٌ جَمِیْلَۃٌ، تَسُرُّہٗ اِذَا نَظَرَ اِلَیْھَا وَتُطِیْعُہٗ اِذَا اَمَرَھَا، وَتَحْفَظُہٗ فِیْ غَیْبَتِہٖ وَمَالِہٖ وَنَفْسِھَا؛

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان شخص اپنے اسلام کے بعد جو بہترین فائدہ اٹھاتا ہے وہ ایک خوبصورت عورت ہے، جس کی طرف اگر وہ نظر ڈالے تو وہ اسے خوش کر دے۔ جب وہ اسے کوئی حکم کرے تو بجالائے۔ اور اس کی غیر حاضری میں اس کے مال اور اپنے آپ کی حفاظت کرے۔[2]

خَیْرُ النِّسَاءِ الَّتِیْ اِذَا نَظَرْتَ اِلَیْھَا سَرَّتْكَ، وَاِذَا اَمَرْتَھَا اَطَاعَتْكَ وَاِذَا غِبْتَ عَنْھَا حَفِظَتْكَ فِیْ نَفْسِھَا وَمَالِكَ؛

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین عورت وہ ہے جس کی طرف اگر تو دیکھے تو وہ تجھے خوش کر دے۔ اگر تو اسے کوئی حکم کرے تو وہ تیری اطاعت کرے۔ اور جب تو گھر سے باہر ہو تو وہ خود کی اور تیرے مال کی حفاظت کرے۔[3]

قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَیُّ النِّسَاءِ خَیْرٌ؟ قَالَ: اَلَّتِیْ تَسُرُّہٗ اِذَا نَظَرَ، وَتُطِیْعُہٗ اِذَا اَمَرَ، وَلَا تُخَالِفُہٗ فِیْ نَفْسِھَا وَمَالِھَا بِمَا یَکْرَہٗ؛

---

[1] ابن عدی، کنز العمال ۱۶/ ۲۹۶

[2] کتاب السنن سعید بن منصور ۱/ ۱۲۴، طبرانی منقول از مجمع الزوائد ۴/ ۲۷۲

[3] سنن نسائی ۶/ ۶۸ مسند ابو داؤد طیالسی منقول از تفسیر قرطبی ۵/ ۱۰۰ ، نیز طبرانی، مجمع الزوائد ۴/ ۲۷۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (ایک مرتبہ) پوچھا گیا کہ کس قسم کی عورت بہتر ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ عورت جو اس کی طرف دیکھنے پر تجھے مسرور کر دے۔ اگر تو اسے کوئی حکم دے تو وہ پورا کرے۔ اور وہ اپنے نفس اور مال میں تیری ناپسندیدگی کا خیال رکھتے ہوئے تیری مخالفت نہ کرے۔ [1]

اس کے برعکس اگر کسی کو زبان دراز، بداخلاق اور جھگڑالو مزاج عورت مل جائے تو پھر اس کی زندگی دوبھر اور اس کا چین وسکون سب کچھ غارت ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس کی زندگی جیتے جی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے اس اعتبار سے کسی کو نیک اور صالح عورت کا مل جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اسے جیتے جی جنت مل گئی ہو۔

ان حدیثوں سے ضمناً اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عورت کے اصل فرائض کیا ہیں اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ چنانچہ ایک عورت اسلام کی نظر میں گھر کی ملکہ اور اپنے شوہر کے مال کی امین ہوتی ہے۔ اور اس کے اصل فرائض تین ہیں:

۱۔ اپنے شوہر کو ہمیشہ خوش وخرّم رکھنے کی کوشش کرے اور اس کی پسند و ناپسند کا خیال رکھے۔

۲۔ خدا کی اطاعت کے بعد اپنے شوہر کی اطاعت کرے اور اس کی نافرمانی نہ کرے۔

۳۔ اس کی غیر حاضری میں اس کے مال ومتاع اور اپنے ناموس کی حفاظت کرے۔ اور ان امور میں اس کی خیانت نہ کرے۔

دنیوی سعادت کی بعض چیزیں

حاصل یہ کہ جس گھر میں نیک اور صالح عورت ہو وہ جنت کا نمونہ ہے۔ اور جس گھر میں بداخلاق اور جھگڑالو عورت ہو وہ دوزخ کا نمونہ ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں جن چیزوں

---

[1] سنن نسائی کتاب النکاح ۶۸۱/۲، السنن الکبریٰ کتاب النکاح ۸۲/۷، مستدرک حاکم کتاب النکاح ۱۶۱/۲، مسند احمد، کنز ۳۰۸/۱۶، نیز ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، منقول از تفسیر در منثور ۱۵۱/۲۔

کو کس شخص کی نیک بختی میں شمار کیا گیا ہے ان میں سرفہرست نیک عورت ہے۔

"اربع من السعادۃ: المرأۃ الصالحۃ، والمسکن الواسع، والجار الصالح، والمرکب الھنی، واربع من الشقاوۃ: الجار السوء، والمرأۃ السوء، والمسکن الضیق، والمرکب السوء۔"

چار چیزیں سعادت کا باعث ہیں: نیک عورت، کشادہ مکان، اچھا پڑوسی اور دل پسند سواری۔ اور چار چیزیں بدبختی کا باعث ہیں: برا پڑوسی، بری عورت، تنگ مکان اور خراب سواری۔ [1]

من سعادۃ بن آدم المرأۃ الصالحۃ والمسکن الصالح، والمرکب الصالح، ومن شقوۃ بن آدم المرأۃ السوء، والمسکن السوء، والمرکب السوء۔

جو چیزیں آدم کے بیٹے کی خوش بختی کی ہیں ان میں اچھی عورت، اچھا مکان اور اچھی سواری بھی ہے۔ اور جو چیزیں آدم کے بیٹے کی بدبختی کی ہیں ان میں بری عورت، برا مکان اور بری سواری بھی ہے۔ [2]

کنواری لڑکیوں کی خوبیاں

اسلام ایک معتدل اور متوازن مذہب ہے، جس کے تمام قوانین نہایت درجہ عادلانہ اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں۔ اسلام میں عورت نہ تو کم تر درجے کی فرد ہے اور نہ ہی بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کا وجود منحوس مانا گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تاکید ہے کہ ایک بیوہ اور ایک بے نکاحی عورت کا بیاہ جہاں تک ہوسکے جلد سے جلد دوبارہ کرا دینا چاہیئے۔ جب کہ اس کے لئے کوئی مناسب اور موزوں رشتہ مل جائے۔

ثلاثۃ یا علی لا تؤخرھن: الصلاۃ اذا آنت، والجنازۃ اذا حضرت

---

[1] صحیح ابن حبان کتاب النکاح، حدیث نمبر ۴۰۲۱، ۱۳۵/۷

[2] مسند احمد، مسند بزار، معجم طبرانی کبیر و اوسط، منقول از مجمع الزوائد، از حافظ نورالدین ہیثمی ۲۷۲/۴

والایم اذا وجدت کفواً۔

اے علی! تم تین چیزوں میں تاخیر مت کرو۔ نماز، جب کہ اس کا وقت آجائے۔ جنازہ جب وہ حاضر ہو جائے۔ اور بے نکاحی عورت (یا مرد) جبکہ اس کے لئے کوئی موزوں رشتہ مل جائے۔ [۱]

یہ ایک عام ضابطہ ہے جس کے ذریعہ اسلامی معاشرہ میں تعمیری رجحانات پیدا کر اور معاشرتی رخنوں کو بند کرنا مقصود ہے۔ اور اس سلسلے میں دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ رشتۂ ازدواج کے لئے جہاں تک ہو سکے کنواری لڑکیوں اور دوشیزاؤں کو ترجیح دینا چاہیئے۔ کیونکہ دوشیزاؤں میں نسائیت کے اعتبار سے جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ شوہر دیدہ عورتوں میں نہیں ہوتیں۔ اور کنواری لڑکیوں کی ایک بہت بڑی صفت یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ بچے پیدا کر سکتی ہیں، جو اسلام کا ایک اہم مقصد اور نشانہ ہے۔ جیسا کہ یہ بات متعدد حدیثوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

"علیکم بالابکار، فانهن اعذب افواهاً، و انتق ارحاماً، و ارضیٰ بالیسیر"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کنواری لڑکیوں کو اختیار کرو۔ کیونکہ وہ (شوہر دیدہ عورتوں کے مقابلے میں) زیادہ شیریں زبان، زیادہ بچے جننے والی اور (جنسی یا گھریلو آسائش کے اعتبار سے) تھوڑی سی چیز پر بھی راضی ہو جاتی ہیں [۲]

اس حدیث کو کچھ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ بعض دیگر محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔ چنانچہ معجم طبرانی (اوسط) میں حسب ذیل فقرہ کا اضافہ ملتا ہے:

واقل خباً: اور وہ بہت کم فریب دینے والی ہوتی ہیں [۳]

یعنی چونکہ وہ الہڑ اور ناتجربہ کار ہوتی ہیں اس لئے ان میں دھوکا اور فریب نہیں پایا جاتا۔

---

[۱] مسند احمد بن حنبل ۱/۱۰۵، مطبوعہ بیروت۔

[۲] سنن ابن ماجہ کتاب النکاح: ۱/۵۹۸

[۳] طبرانی اوسط، بحوالہ کنز العمال: ۱۶/۲۹۴

بلکہ وہ اخلاقی اعتبار سے بھولی بھالی اور جنسی اعتبار سے گرمجوش ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بعض دیگر روایات میں اس کی تصریح موجود ہے:

"علیکم بابکار النساء، فانھن اعذب افواھاً واسخن جلوداً"، تم کنواری عورتوں کو پسند کرو، کیونکہ وہ شیریں زبان اور گرمجوش ہوتی ہیں۔[1]

علیکم بالجواری الشباب، فانھن اطیب افواھاً، واغر اخلاقاً، وافتح ارحاماً، الم تعلموا انی مکاثر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نوجوان لڑکیوں سے نکاح کرو۔ کیونکہ وہ میٹھی گفتگو والی، عادات واطوار میں بھولی بھالی اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں (قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر) فخر کروں گا۔[2]

علیکم بالابکار فانکحوھن، فانھن افتح ارحاماً، واعذب افواھاً واغر غرۃً۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم دوشیزاؤں سے نکاح کرو۔ کیونکہ ان کے رحموں کے منہ کھلے ہوئے، ان کی زبانیں زیادہ میٹھی اور وہ بھولی بھالی ہوتی ہیں۔[3]

اس موقع پر یہ حقیقت بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ شوہر دیدہ عورتوں کے مقابلے میں کنواری لڑکیوں کا زیادہ بچے جننا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے لیکن تجربہ کے اعتبار سے چونکہ عمر رسیدہ عورتوں کے مقابلے میں کم سن لڑکیوں کے رحموں کی قوتِ حرارت یا شدتِ شہوت کی بنا پر نطفہ قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اس لئے کنواری لڑکیوں میں اس کے زیادہ امکانات رہتے ہیں۔ مگر یہ اسباب و عوامل خداوند عالم کے حکم کے بغیر اثر انداز نہیں ہوتے۔[4]

---

[1] سنن سعید بن منصور: ۱/ ۱۲۸

[2] سنن سعید بن منصور: ۱/ ۱۲۸

[3] مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۱۵۹

[4] ماخوذ از مرقاۃ المفاتیح، از ملا علی قاری: ۳/ ۴۰۷، مطبوعہ بمبئی۔

خیر و برکت والی عورتیں

عورت کی سعادت و خوش بختی محض یہی نہیں ہے کہ وہ دیندار اور صاحب اخلاق و کردار ہو۔ بلکہ اس کی سعادت و خوش بختی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کم سے کم بوجھ والی ہو۔ یعنی شادی بیاہ اور مہر وغیرہ بوجھ اس سے نکاح کرنے والے مرد پر کم سے کم پڑے۔ تاکہ فضول خرچی کو رواج پانے کا موقع نہ مل سکے۔ کیونکہ فضول خرچی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ اس اعتبار سے جو شادی جتنی زیادہ کفایت شعاری کے ساتھ انجام پائے اس میں اتنی ہی زیادہ خیر و برکت ہوگی۔

اعظم النساء برکۃ ایسرھن مؤنۃ: برکت کے اعتبار سے عظیم تر عورتیں وہ ہیں جو بوجھ کے اعتبار سے زیادہ آسان ہوں۔[1]

اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ: برکت کے لحاظ سے عظیم تر نکاح وہ ہے جو اخراجات کے لحاظ سے زیادہ آسان ہو۔[2]

خیرھن ایسرھن صداقاً: بہترین عورتیں وہ ہیں جن کا مہر آسان (کم) ہو۔[3]

اعظم النساء برکۃ ایسرھن صداقاً: وہ عورتیں بڑی برکت والی ہیں جو آسان مہر والی ہوں۔[4]

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اظہار شان و شوکت یا نام و نمود کی خاطر فضول خرچی سے کام لینا اور بے دریغ پیسہ بہانا اسلام کی نظر میں نہ صرف معیوب ہے بلکہ یہ بات فساد تمدن کا بھی باعث ہے۔ اور پھر مال و دولت بھی اللہ کی ایک امانت ہے جس کا حساب

---

[1] مسند احمد ۶/۱۴۵، مسند بزار: مجمع الزوائد ۴/۲۵۵، حاکم و بیہقی: کنز ۱۶/۲۹۱۔

[2] حلیۃ الاولیاء ۶/۲۵۷، بحوالہ موسوعۃ اطراف الحدیث ۲/۲۵، بیروت۔

[3] طبرانی، کنز العمال ۱۶/۲۹۳۔

[4] مستدرک حاکم: ۲/۱۷۸، دار المعرفہ بیروت۔

حساب انسان سے لیا جائے گا کہ اس نے اسے کن کن امور میں اور کس کس طرح خرچ کیا لہٰذا اس بارے میں ہر شخص کو اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔

وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے

اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے محرمات کی بھی تھوڑی سی تشریح وتفصیل کردی جائے۔ اور محرمات سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے چنانچہ قرآن مجید کی رو سے ایسی عورتیں جن سے نکاح حرام ہے حسب ذیل ہیں:

۱۔ مائیں، ان میں دادیاں اور نانیاں بھی شامل ہیں۔
۲۔ بیٹیاں، اور ان میں پوتیاں اور نواسیاں بھی شامل ہیں۔
۳۔ سگی بہنیں۔
۴۔ پھوپھیاں اور خالائیں۔
۵۔ سگی بھتیجیاں اور بھانجیاں۔
۶۔ رضاعی ماں اور رضاعی بہن، اور اسی طرح رضاعی بھتیجی اور بھانجی وغیرہ۔
۷۔ ساس
۸۔ اپنی مدخولہ بیویوں کی وہ لڑکیاں جن کی پرورش ایک باپ کی حیثیت سے کی گئی ہو۔
۹۔ سگے بیٹے کی بیوی۔
۱۰۔ دو سگی بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا۔ اگر ایک بہن کے مرنے کے بعد دوسری سے نکاح کیا جائے تو پھر جائز ہے۔

محرمات کا یہ بیان سورۂ نساء میں اس طرح آیا ہے۔

حرمت علیکم امھٰتکم وبنٰتکم واخوٰتکم وعمّٰتکم وخٰلٰتکم وبنٰت الاخ وبنٰت الاخت وامھٰتکم التی ارضعنکم واخوٰتکم من الرضاعة وامھٰت نسائکم وربائبکم الّٰتی فی حجورکم من نسائکم التی دخلتم بھن فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم وان تجمعوا بین الاختین الا ما قد سلف۔ ان اللہ کان غفوراً رحیماً؛

تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، اور وہ دودھ شریک بہنیں، تمہاری عورتوں کی مائیں اور انکی بیٹیاں (جو دوسرے شوہروں سے ہوں) جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہے اور جو تمہاری مدخولہ عورتوں سے ہیں۔ ہاں اگر وہ مدخولہ (مجامعت شدہ) نہیں ہیں تو پھر ان پروہ لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور تمہارے سگے بیٹوں کی بیویاں بھی (تم پر حرام ہیں) اور دو بہنوں کو ایک نکاح میں اکٹھا کرنا بھی حرام ہے۔ مگر پہلے جو گذر چکا (وہ معاف ہے) اللہ یقیناً بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (نساء: ۲۳)

اور حدیث نبوی کی صراحت کے مطابق کسی عورت اور اس کی سگی خالہ یا پھوپی سے بیکوقت نکاح کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

لا یجمع بین المرأۃ وعمتها، ولا بین المرأۃ وخالتها: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت اور اس کی پھوپی کو بیک وقت جمع نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح کسی عورت اور اس کی خالہ سے بھی بیک وقت نکاح نہیں کیا جاسکتا۔ [1]

لا تنکح المرأۃ علی عمتها ولا علی خالتها: کسی عورت سے اس کی پھوپی یا خالہ کی موجودگی میں نکاح نہیں کیا جاسکتا۔ [2]

اس سلسلے میں ایک قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ کسی ایسی دو عورتوں کو ایک ہی وقت میں بذریعہ نکاح جمع کرنا حرام ہے جن میں سے ایک کو اگر مرد اور دوسری کو عورت فرض کیا جائے تو شرعی اعتبار سے ان دونوں کا آپس میں نکاح جائز نہ ہوسکتا ہو، کیونکہ اس کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان صلہ رحمی کا تعلق منقطع ہوجانے کی نوبت آجاتی ہے۔ [3]

چنانچہ اس سلسلے میں طبرانی میں ایک حدیث مذکور ہے:

---

۱ بخاری کتاب النکاح ۶/ ۱۲۸، مسلم نکاح ۲/ ۱۰۲۸، ابن ماجہ ۱/ ۶۲۱۔

۲ نسائی وابن ماجہ، منقول از کنز العمال ۱۶/ ۳۲۶

۳ ہدایہ مع فتح القدیر ۳/ ۱۲۵، مطبوعہ کوئٹہ (پاکستان)

... تقطعتم ارحامکم: اگر تم ایسا کروگے تو اپنی باہمی رشتہ داریوں ... کر رکھ دوگے۔ [1]

نیز کسی بڑی عمر والی عورت کو اپنی کم سن بیوی کی سوکن بنانا یا اس کے برعکس کسی کم سن عورت کو کسی بڑی عمر والی کی سوت بنانا بھی ممنوع ہے۔

ولا تنکح الکبریٰ علی الصغریٰ، ولا الصغریٰ علی الکبریٰ: بڑی عمر والی کو چھوٹی عمر والی کی موجودگی میں بیاہ کرکے نہیں لانا چاہیئے۔ اور اسی طرح چھوٹی عمر والی کو بڑی عمر والی کی موجودگی میں بیاہ کرکے لانا بھی ٹھیک نہیں ہے [2]

اسی طرح رضاعی (دودھ میں شرکت کے) لحاظ سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہیں جو نسبی اعتبار سے حرام ہیں۔

الرضاعۃ تحرم ما تحرم الولادۃ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دودھ پینے سے وہ سب رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں [3]

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے چچا حمزہؓ کی لڑکی سے نکاح کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ میری رضاعی بھتیجی بھی ہے۔

انہا ابنۃ اخی من الرضاعۃ: وہ میرے دودھ شریک بھائی کی بیٹی ہے [4]

نیز اسی طرح آپ نے بطور ایک ضابطہ فرمایا کہ کسی کے لئے رضاعی بھتیجی یا رضاعی بھانجی سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔

لا تحل بنت الاخ ولا بنت الاخت من الرضاع [5]

---

[1] بحوالہ فتح القدیر ۳/۱۲۵۔

[2] ابو داؤد ۲/۴/۵۵، دارمی ۲/۱۳۶، مسند احمد ۲/۴۲۶۔

[3] صحیح بخاری کتاب النکاح ۶/۱۲۵، مطبوعہ استانبول، سنن نسائی ۶/۹۹۔

[4] بخاری ۶/۱۲۵، نسائی ۶/۹۹۔

[5] طبرانی، منقول از کنز العمال ۱۶/۳۲۷۔

قرآن مجید کی مذکورۂ بالا آیت میں جن " ربائب " یعنی گود میں پرورش پائی ہوئی لڑکیوں کا تذکرہ موجود ہے اس کی تشریح وتفسیر حدیث نبوی میں اس طرح آئی ہے :

ایما رجل نکح امراۃ فدخل بھا فلا یحل لہ نکاح ابنتھا وان لم یکن دخل بھا فلینکح ابنتھا ، وایما رجل نکح امراۃ فدخل بھا اولم یدخل بھا فلا یحل لہ نکاح امھا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس سے مجامعت کر چکا تو اب اس عورت کی لڑکی (جو اس کے دوسرے خاوند سے ہو) اس کے لیے حلال نہیں رہی اگر ابھی مجامعت نہیں کی (بلکہ نکاح کے بعد مجامعت سے پہلے کسی وجہ سے طلاق ہوگئی ہو تو) پھر وہ اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے ۔ اور جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا تو اس کی ماں اس کے لئے (ہمیشہ کے لئے) حرام ہوگئی ، خواہ اس نے مجامعت کی ہو یا نہ کی ہو[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عورت ایک مرتبہ ساس بن جاتی ہے تو اس سے نکاح از روئے قرآن ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتا ہے ۔ یہ قاعدۂ کلیہ ہے ۔

اذا نکح الرجل المرأۃ ثم طلقھا قبل ان یدخل بھا فانہ یتزوج ابنتھا ولیس لہ ان یتزوج امھا :

جب ایک شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے پھر (کسی وجہ سے) مباشرت سے پہلے اسے طلاق دے دیتا ہے تو وہ اس کی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے ۔ مگر اس کی ماں سے نکاح نہیں کر سکتا[2]

واضح رہے یہ احادیث عام ہیں اور ان میں گود میں پرورش پائی ہوئی اور نہ پائی ہوئی ہر قسم کی لڑکیاں شامل ہیں ۔

غیر مسلم عورتوں سے نکاح

اب جہاں تک غیر مسلم عورتوں سے نکاح کا سوال ہے تو اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے ۔ وہ یہ

---

[1] جامع ترمذی کتاب النکاح ۳/۴۲۵

[2] السنن الکبریٰ بیہقی : ۷/۱۶۰

فانکم اذا فعلتم ذٰلک قطعتم ارحامکم اگر تم ایسا کروگے تو اپنی باہمی رشتہ داریوں کو کاٹ کر رکھ دوگے۔ [1]

نیز کسی بڑی عمر والی عورت کو اپنی کم سن بیوی کی سوکن بنانا یا اس کے برعکس کسی کم سن عورت کو کسی بڑی عمر والی کی سوت بنانا بھی ممنوع ہے۔

ولا تنکح الکبریٰ علی الصغریٰ، ولا الصغریٰ علی الکبریٰ: بڑی عمر والی کو چھوٹی عمر والی کی موجودگی میں بیاہ کر کے نہیں لانا چاہیئے۔ اور اسی طرح چھوٹی عمر والی کو بڑی عمر والی کی موجودگی میں بیاہ کر کے لانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ [2]

اسی طرح رضاعی (دودھ میں شرکت کے) لحاظ سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہیں جو نسبی اعتبار سے حرام ہیں۔

الرضاعة تحرّم ما تحرّم الولادة: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دودھ پینے سے وہ سب رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔ [3]

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے چچا حمزہؓ کی لڑکی سے نکاح کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ میری رضاعی بھتیجی بھی ہے۔

انها ابنة اخی من الرضاعة: وہ میرے دودھ شریک بھائی کی بیٹی ہے۔ [4]

نیز اسی طرح آپ نے بطور ایک ضابطہ فرمایا کہ کسی کے لئے رضاعی بھتیجی یا رضاعی بھانجی سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔

لا تحل بنت الاخ ولا بنت الاخت من الرضاع [5]

[1] بحوالہ فتح القدیر ۳/۱۲۵۔
[2] ابوداؤد ۲/۵۵۴، دارمی ۲/۱۳۶، مسند احمد ۲/۴۲۶۔
[3] صحیح بخاری کتاب النکاح ۶/۱۲۵ مطبوعہ استانبول، سنن نسائی ۶/۹۹۔
[4] بخاری ۶/۱۲۵، نسائی ۶/۹۹۔
[5] طبرانی، منقول از کنز العمال ۱۶/۳۲۷۔

قرآن حکیم کی مذکورۂ بالا آیت میں جن "ربائبہ" یعنی گود میں پرورش پائی ہوئی لڑکیوں کا تذکرہ موجود ہے اس کی تشریح و تفسیر حدیث نبوی میں اس طرح آئی ہے!

ایّما رجل نکح امرأةً فدخل بہا فلا یحلّ لہ نکاح ابنتہا. وان لم یکن دخل بہا فلینکح ابنتہا. وایّما رجل نکح امرأةً فدخل بہا اولم یدخل بہا فلا یحلّ لہ نکاح امّہا.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس سے مجامعت بھی کر چکا تو اب اس عورت کی لڑکی (جو اس کے دوسرے خاوند سے ہو) اس کے لئے حلال نہیں رہی اور اگر ابھی مجامعت نہیں کی (بلکہ نکاح کے بعد مجامعت سے پہلے کسی وجہ سے طلاق ہوگئی ہو تو) پھر وہ اس لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے۔ اور جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا تو اس کی ماں اس کے لئے (ہمیشہ کے لئے) حرام ہوگئی، خواہ اس نے مجامعت کی ہو یا نہ کی ہو۔[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عورت ایک مرتبہ ساس بن جاتی ہے تو اس سے نکاح از روئے قرآن ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدۂ کلیہ ہے۔

اذا نکح الرجل المرأة ثم طلّقہا قبل ان یدخل بہا فانہ یتزوّج ابنتہا ولیس لہ ان یتزوّج امّہا!

جب ایک شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے پھر (کسی وجہ سے) مباشرت سے پہلے اسے طلاق دے دیتا ہے تو وہ اس کی لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے۔ مگر اس کی ماں سے نکاح نہیں کرسکتا۔[2]

واضح رہے یہ احادیث عام ہیں اور ان میں گود میں پرورش پائی ہوئی اور نہ پائی ہوئی ہر قسم کی لڑکیاں شامل ہیں۔

غیر مسلم عورتوں سے نکاح

اب جہاں تک غیر مسلم عورتوں سے نکاح کا سوال ہے تو اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے۔ وہ یہ

---

[1] جامع ترمذی کتاب النکاح ۳/۴۲۵

[2] السنن الکبریٰ بیہقی: ۱۶۰/۷

حسب ذیل حکم ربانی کی رو سے کسی کافر یا مشرک مرد یا عورت سے کسی مسلمان مرد یا عورت
نکاح کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے، جب کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

ولا تنکحوا المشرکات حتیٰ یؤمنّ۔ ولامۃ مؤمنۃ خیر من مشرکۃ ولو اعجبتکم

تنکحوا المشرکین حتیٰ یؤمنوا۔ ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم

تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ بیشک ایک ایماندار
لونڈی ایک مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں فریفتہ کردے۔ اور اسی طرح (اپنی عورتوں کو)
مشرک مردوں سے مت بیاہو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ بیشک ایک مومن غلام ایک
مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ بہت بھاتا ہو۔ (بقرہ : ۲۲۱)

ہاں البتہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ کی) عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح جائز ہو سکتا
ہے۔ مگر کسی مسلمان عورت کا نکاح اہل کتاب سے نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سلسلے میں ایک شرط یہ بھی
ہے کہ ایسی "کتابی" عورتیں پاک دامن ہوں، بدکار یا فاحشہ نہ ہوں۔ اور دوسری شرط یہ
ہے کہ ایسی عورتوں کا مہر ادا کر کے علی الاعلان ان سے نکاح کیا جائے، خفیہ تعلقات قائم
نہ کئے جائیں۔

والمحصنٰت من المؤمنٰت والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم اذا
آتیتموھنّ اجورھنّ محصنین غیر مسٰفحین ولا متخذیٓ اخدان :

اور تمہارے لئے پاک دامن مسلمان عورتیں حلال ہیں اور وہ پاک دامن عورتیں بھی
جو تم سے پہلے والے اہل کتاب میں سے ہوں، جب کہ تم ان کے مہر انہیں دے دو۔ اور اس سے
تمہارا مقصود قید نکاح میں آنا ہو، نہ کہ بدکاری کرنا یا خفیہ آشنائی قائم کرنا۔ (مائدہ : ۵)

لفظ محصنات : محصنۃ کی جمع ہے، جس کے دو معنی منقول ہیں (۱) پاک دامن عورتیں
(۲) آزاد عورتیں[1] (لونڈی کے مقابلے میں) اور اس اختلاف کی بنا پر بعض فقہی اختلافات
بھی پیدا ہو گئے ہیں[2]۔ مگر جہاں تک "کتابی" عورتوں سے نکاح کا تعلق ہے اس کی اباحت

---

[1] زاد المسیر فی علم التفسیر (تفسیر ابن جوزی) ۲/۲۹۶، مطبوعہ۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ابن جریر طبری : ۶/۶۶-۶۹، بیروت۔

جو آیت کریمہ کی رو سے ثابت ہے[1] اور احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نتزوج نساء اهل الکتاب ولا یتزوجون نساءنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔ مگر وہ ہماری عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے۔[2]

عن عمر قال: المسلم یتزوج النصرانیة، ولا یتزوج النصرانی المسلمة!

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک مسلمان عیسائی عورت سے شادی کر سکتا ہے مگر کوئی عیسائی کسی مسلمان عورت سے بیاہ نہیں کر سکتا۔[3]

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے نائلہ سے نکاح کیا تھا جو ایک نصرانی عورت تھیں۔ اسی طرح حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تھا۔[4]

مگر حضرت عمرؓ صحابۂ کرام کے لئے کتابی عورتوں سے نکاح کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے نہ صرف مختلف قسم کے فتنوں میں پڑنے کا اندیشہ تھا بلکہ صحابۂ کرام کا عمل عوام کے لئے قابل تقلید بن جانے کا بھی خدشہ تھا۔ اسی بنا پر آپ صحابۂ کرام کو اس سے منع فرمایا کرتے تھے۔

عن قتادة ان حذیفة نکح یهودیة، فقال عمر: طلقها فانها جمرة۔ قال أحرام هی؟ قال لا، ولکنی اخاف ان تطیعوا الوموسات منهن:

قتادہؒ سے مروی ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسے طلاق دے دو کیونکہ وہ ایک انگارہ ہے۔ حذیفہ نے پوچھا کہ کیا وہ حرام ہے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم لوگ ان میں کی بدکار عورتوں کی فرماں برداری

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابن جوزی ۲/۲۹۶

[2] ابن جریر، منقول از تفسیر درمنثور از سیوطی: ۲/۲۶۱، بیروت۔

[3] السنن الکبریٰ ۷/۱۷۲، نیز تفسیر درمنثور ۲/۲۶۱، کنز العمال ۱۶/۵۴۷۔

[4] تفسیر ابن جوزی: ۲/۲۹۶

لوگ۔ [1]

اس کی مزید تفصیل ایک دوسری روایت میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے
حضرت حذیفہؓ بن یمان کو خط لکھا جو کوفہ میں تھے اور جنھوں نے ایک کتابی عورت سے
نکاح کیا تھا کہ تم اسے چھوڑ دو۔ یعنی طلاق دے دو۔ کیونکہ تم مجوسیوں کے ملک میں رہتے ہو
اس بنا پر مجھے خوف ہے کہ ناواقف لوگ کہنے لگیں گے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے ایک ساتھی نے ایک کافر عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ اور اس بنا پر اللہ کی عطا کردہ
رخصت کو (پوری طرح) حلال تصور کرتے ہوئے مجوسی عورتوں سے بیاہ کرنے لگیں گے۔
اس پر حضرت حذیفہؓ نے اس عورت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ [2]

یہ حضرت عمرؓ کی ایک مومنانہ فراست اور دور اندیشی تھی کہ آپ ہر چیز کے عواقب
و نتائج پر نظر رکھتے ہوئے صحیح فیصلے کیا کرتے تھے۔

اس موقع پر عقلی اعتبار سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مسلمان مرد کو ایک
غیر مسلم عورت سے نکاح کرنے کی اجازت کیوں ہے مگر اس کے برعکس ایک غیر مسلم کو کسی
مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ تو اس کا جواب حضرت ابن عباسؓ
کی زبانی سنئے۔ چنانچہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

ان اللّٰہ عزّ وجل بعث محمداً صلی اللّٰہ علیہ وسلّم بالحق لیظهرہ علی الدین
کلہ فدیننا خیر الادیان، وملّتنا فوق الملل، ورجالنا فوق نسائهم، ولا یکون
رجالهم فوق نسائنا۔

اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام دینوں
پر غالب کر دے۔ لہذا ہمارا دین سب سے بہتر دین ہے۔ ہماری ملت دوسری ملتوں سے
برتر ہے۔ اور ہمارے مرد دیگر مذاہب کی عورتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مگر دوسرے

---

[1] مصنف عبدالرزاق، السنن الکبریٰ، منقول از کنز: ۱۶/ ۵۴۷ - ۵۴۸

[2] مصنف عبدالرزاق، کنز ۱۶/ ۵۴۸

ابھی تک مرد ہماری عورتوں پر فوقیت نہیں رکھتے۔ [1]

حاصل یہ کہ ایک مسلمان مرد کے لئے ایک کتابی عورت (عیسائی یا یہودی) سے نکاح کرنے کی اگرچہ شرعاً اجازت ضرور ہے، مگر یہ چیز ضرورت ہی کے تحت ہونی چاہیئے کیونکہ اس کی وجہ سے فتنوں میں پڑنے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے اس سلسلے میں احتیاط ضروری ہے۔ [2]

امام سرخسیؒ نے بھی اس بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک قول نقل کرتے ہوئے کراہت کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر یہ بات اصلاً جائز ہے۔ [3]

غرض حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصریح کے مطابق اہل علم کے نزدیک مشرک یا مجوسی عورت سے نکاح جائز نہیں ہے۔ ہاں البتہ کتابی عورت سے نکاح جائز ہے [4]
امام ابن تیمیہؒ نے تحریر کیا ہے کہ یہ جمہور سلف و خلف اور ائمہ اربعہ کا مسلک ہے [5]

ختم شد

---

[1] السنن الکبریٰ بیہقی: ۷/۱۷۲۔

[2] خلاصہ از ہدایہ مع فتح القدیر: ۳/۱۳۵۔

[3] المبسوط: ۵/۵۰۔

[4] دیکھئے المسوّیٰ شرح الموطا ۲/۱۰۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

[5] فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۲/۱۷۸، مطبوعہ ریاض۔

یادگارِ سلف حضرتِ امیرِ شریعتؒ

محمد سعید الرحمٰن شمس، مدیر، نصرۃ الاسلام، کشمیر

علم وعمل، زہد و تقویٰ، استغناء وخودداری، شریعت وطریقت، شرافت ونجابت کا ایک اور روشن چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوا۔ یادگار سلف حضرت اقدس امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ بھی ملت اسلامیہ کو روتا بلکتا اور سوگوار چھوڑ گئے۔ امیر شریعت کا سانحۂ ارتحال موجودہ ملکی اور ملی مسائل ومعاملات کے پس منظر میں انتہائی ناقابل تلافی اور زبردست علمی اور دینی نقصان ہے، امیر شریعت کے اچانک انتقال سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر رنج وغم کی ہمہ گیر لہر دوڑ گئی آپ کے انتقال پر ملال کا صدمہ نہ صرف ملک، برصغیر ہند وپاک بلکہ عالم اسلام میں قومی وملی نقصان کے طور پر محسوس کیا گیا ؎

کم مات قوم وما تت مکارمھم　　　وعاش قوم فی الناس اموات

(یعنی کتنی قومیں مرگئیں مگر وہ اپنے مکارم اخلاق اور اعلیٰ کارنامے انجام دینے کی وجہ سے زندہ ہیں اور بہت سی قومیں زندہ ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مردوں کی مانند ہیں)۔

حضرت امیر شریعت کا سانحۂ وفات صرف ایک فرد اور شخصیت کی وفات نہیں ہے بلکہ ان روایات اور قدروں کا اٹھ جانا ہے جو فی الحقیقت انسانیت اور شرافت کے معیار ہیں۔ جو خلق ومروت کی کسوٹی اور بزرگی حلم اور تواضع کی نشانی ہے، امیر شریعتؒ کے انتقال سے ایک عہد کی تکمیل ہوگئی اور ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔

حضرت امیر شریعتؒ اپنے معاصر علماء صلحاء اور بزرگوں کی صف میں ایک ممتاز، منفرد اور اثر انگیز بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے، ایک عظیم اسلامی مفکر، دانشور اور مذہبی قائد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت حضرت امیر شریعتؒ میں وہ تمام جواہر، خصائص اور کمالات

کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے جو نہ صرف ہم عصر علماء میں باعث امتیاز تھیں بلکہ وجہ افتخار بھی دین اسلام کی سربلندی، دعوت وارشاد، اسلامی اقدار کے تحفظ اور شریعت اسلامی کے دفاع کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وہ اہم اور تاریخی نوعیت کے کام لئے جو یقیناً آپ کا ہی حصہ تھا، سچ ہے ع۔ ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں ؟ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

جلیل القدر شخصیت

حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی مرحوم ان برگزیدہ اور جلیل القدر شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کے وجود کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی بنایا تھا بلاشبہ امیر شریعت مرحوم برصغیر کے وہ ممتاز، جری اور بے باک مذہبی اور سیاسی رہنما تھے جن کے کارہائے نمایاں اور عظیم الشان دینی، علمی، تبلیغی، دعوتی، اصلاحی، ملی، سماجی اور سیاسی خدمات ملت اسلامیہ کے لئے باعث صد افتخار ہیں۔ امیر شریعتؒ کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی، ان کی حیات کا ایک ایک لمحہ ان کے اسلامی افکار و کرامات، انکی تعلیمات اور ان کا پیغام، قوم و ملت اور ملک و وطن کی مختلف جہات سے ان کی بے لوث، مخلصانہ بلند پایہ متنوع خدمات اور ملت اسلامیہ میں عمومی طور سے ان کی روح پرور اثرات ہماری دینی اور ملی تاریخ کے اہم اجزاء ہیں۔

اسلاف واکابر کا نمونہ

حضرت امیر شریعتؒ کا اپنے معرکۃ الآراء اکابر و اسلاف سرخیل علمائے دیوبند خاص طور پر قطب زماں حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ اور اپنے نامور والد قطب ارشاد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے طرز اور منہاج پر اپنا دعوتی، تبلیغی اور اصلاحی مشن کو مستحکم کرکے مزید آگے بڑھانے، مؤثر اور دلنشیں انداز بیان سے عوام الناس کو دین اسلام کا والہ وشیدائی بنانے، شریعت الٰہی اور طریقت اسلامی سے انہیں مربوط کرنے، ان کے عقائد واعمال کی تطہیر، تصحیح اور اصلاح کرنے میں قابل قدر اور نمایاں ترین حصہ رہا ہے۔ امیر شریعتؒ نے اپنے عظیم منصب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے یہ بنیادی فلسفہ اور نکتہ لوگوں کے ذہن نشین کرایا کہ۔

"مذہب زندگی کا جز نہیں بلکہ تمام انسانی زندگی پر حاوی، محیط اور اس کی روح اور اصل الاصول ہے اس کی قدرت محرکہ فہم و شعور ذکر و فکر ہے صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہے صراط مستقیم اور ہدایت کے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے والا قطب نما ہے اور مذہب زندگی کا ضمیمہ نہیں بلکہ اول راز ہے۔"

یقیناً دین اسلام ایک خاص طرز فکر، ایک خاص منہاج، ایک خاص نقطہ فکر، ایک خاص طرز عمل اور ایک خاص ذہن و فکر اور ایک زندگی کا نام ہے جو مہد سے لیکر لحد تک اور بازار سے لیکر میدان کارزار تک، عبادات، معاملات، اخلاقیات، اجتماعیات، معاشیات، اقتصادیات، سماجیات، داخلیات اور سیاسیات کے علاوہ بین الاقوامی نوعیت کے تقاضات کے بڑے بڑے مسائل کا فکری حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسلام میں دینی اور دنیوی زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن اور محال ہے۔ اسلام کی نظر میں دنیا اور آخرت دونوں ہی مسلسل زندگی کے دو گوشے ہیں اور دائرے ہیں۔ پہلا دائرہ سعی اور عمل کا ہے جبکہ دوسرا نتائج و اثرات کا۔ حضرت امیر شریعتؒ دین و دنیا کا یہی حسین امتزاج پوری زندگی اپنے کردار و گفتار اور قول و عمل سے پیش کرتے رہے۔

جامع صفات شخصیت

کہا جاتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے بیک وقت نو صفات سے نوازا تھا۔ شبلی مرحوم مقرر بھی تھے اور محقق بھی، معلم بھی تھے اور مورخ بھی، ادیب بھی تھے اور دانشور بھی، شاعر بھی تھے اور مفکر بھی۔ اسی طرح امیر شریعتؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ڈھیر ساری خوبیوں اور صفات عالیہ سے نوازا تھا۔ آپ وسیع النظر عالم بھی اور عامل بھی، عابد شب زندہ دار بھی تھے اور زاہد عن الدنیا بھی، مرشد کامل بھی تھے اور داعی حق بھی، شعلہ بیان خطیب بھی تھے اور سحر طراز ادیب بھی، مجاہد بھی تھے اور قائد بھی۔

دنیوی زندگی میں انسان جن خصائص اور اوصاف سے اپنے معاصرین میں امتیاز اور نام پیدا کرتا ہے ان میں جہاں آدمی کی اپنی خدا داد صلاحیتوں اور قابلیتوں کا دخل

ہوتا ہے وہاں کچھ روایات بھی فرد کو ابھارنے اور شرف دوام بخشنے کا سبب بنتے ہیں خاندان، تعلیم و تربیت، ذہانت و فطانت قابلیت و صلاحیت، عبادات و ریاضت جرأت و بے باکی، زہد و تقویٰ، ایثار و قربانی، اخلاص و للّٰہیت، ہمدردی و غمخواری، جذبہ و شعب ایسی چیزیں ہیں جن سے آدمی عزت و شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے الحمدللہ یہ تمام خوبیاں حضرت امیر شریعتؒ کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

امیر شریعت کو اللہ تعالیٰ نے حق گوئی، حق شناسی اور جرأت و ہمت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آداب سکھانے پر آتا ہے تو اسے جملہ آداب و محاسن کا نمونہ بھی بنا دیتا ہے بقول شاعر مشرقؒ ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

حضرت امیر شریعتؒ نے تحفظ شریعت اور اسلامی قوانین کے دفاع کے کسی بھی نازک سے نازک مرحلہ پر کسی قسم کی کوئی کمزوری یا بزدلی نہیں دکھائی۔

امیر شریعتؒ میں اسلامی قیادت کی پوری پوری شان پائی جاتی تھی اور وہ جو اقبالؒ مرحوم نے کہا ہے کہ ؎

نگہ بلند سخن دل نواز، جاں پرسوز — یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

ہو بہو یہ شعر امیر کارواں حضرت امیر شریعتؒ پر صادق آتا تھا۔

حضرت امیر شریعتؒ کا نام بچپن سے ہی کانوں میں پڑا تھا دراصل امیر شریعتؒ سے بیعت و استرشاد اور پیری و مریدی کا سلسلہ میرے خاندان سے روز اول سے تھا۔ بنگال و بہار کی اکثر مسلم آبادی کم و بیش حضرت امیر شریعتؒ سے عقیدت و ارادت رکھتی تھی۔ میرے والد مرحوم اپنے علاقہ کے رئیس اور متمول آدمی تھے۔ آبا مرحوم کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد اور لوگوں نے حضرت امیر شریعتؒ کے شباب اور جوانی کا دور دیکھا تھا اور ان کی بزرگانہ اور علمی شخصیت سے بقدر فیض اپنانے کی کوششیں کی تھیں۔ علاقہ بھر کے مرکزی مدارس اور اہم مساجد میں ہر سال حضرت امیر شریعتؒ کی زیر صدارت سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

جلسے جلوس ہوتے جس میں ملک وملت کے معروف علماء اور خطیب حضرات خطاب کرتے، نیز بہانے پورے علاقہ میں کبھی ہفتوں اور کبھی مہینوں امیر شریعتؒ کا مضافات اور شہری علاقوں میں تفصیلی دورے ہوتے، دعوتی مجالس کا اہتمام ہوتا اور بھاری تعداد میں عام دیہاتی اور سیدھے سادے مسلمانوں کے علاوہ مقامی علماء و حفاظ وغیرہ حضرت امیر شریعتؒ کے ہاتھوں پر بیعت کرتے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی آمد کی خبر جونہی علاقہ میں مشتہر ہوتی تو عام لوگوں، علماء دانشوروں اور ذمہ دار افراد کی خوشی اور مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، حضرت امیر شریعتؒ کی ایک جھلک دیکھنے، ان سے مصافحہ کرنے اور دعائیں لینے کے لئے خلق خدا کا ایک ہجوم ہر جگہ اور ہر وقت جمع ہو جاتا اور حضرت امیر شریعتؒ بھی ہر مخلص مسلمان سے اس کے مرتبہ اور مقام کے مطابق معاملہ فرماتے۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الٰہی حکم کی تعمیل موقع اور محل کے لحاظ سے بات کرنا، اور اس سلسلہ میں کسی چھوٹے بڑے فرد وشخصیت کا پاس ولحاظ نہ رکھنا، احقاق حق اور ابطال باطل امیر شریعتؒ کی زندگی کا ایک طرۂ امتیاز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے امیر شریعتؒ کو جو غیر معمولی دینی بصیرت، فقہی صلاحیت عبقریت اور بلند نگاہی عطا کی تھی اس کا اعتراف مخالف وموافق ہستیوں نے کیا ہے۔

امیر شریعت سے ربط وتعلق

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد ہے کہ راقم آثم کا نام حضرت امیر شریعتؒ ہی کا تجویز کردہ تھا بچپن سے ہی اگرچہ امیر شریعتؒ کی خصوصی توجہ رہی۔ لیکن اپنی حرماں نصیبی اور کم ظرفی کہ جو زمانہ سیکھنے اور سمجھنے کا تھا ضائع کیا اور اب اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

امیر شریعتؒ کو ہوش وخرد سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے قریب سے اپنے علاقہ کا معروف مرکزی درسگاہ مدرسہ احمدیہ کاش باڑی کے عظیم الشان سالانہ جلسہ دستار بندی کی مبارک تقریب میں دیکھا اس وقت میری عمر بمشکل ۱۴ر چودہ سال تھی، اپنے گھر کے مدرسہ

امیر الاسلام گوڈی میں استاذ و مربی حضرت مولانا محمد ذاکر حسین صاحب مدظلہ دربھنگوی کی نگرانی میں زیر تعلیم تھا۔ اسی عمر میں نعت خوانی اور شعر و شاعری سے خاص دلچسپی ہو چلی تھی اور الحمد للہ آواز بھی موزوں اور مناسب تھی مدرسہ احمدیہ کاشی باڑی کے جلسۂ عام میں صدر مدرسین استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا محمد عزیز الرحمن صاحبؒ (خلیفہ الحاج شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد المدنی قدس سرہٗ) نے حضرت امیر شریعتؒ مولانا سید اسعد مدنی مولانا محمد تسلیم القاسمی (ناظم جامعہ رحمانی مونگیر) اور دیگر مدعو علماء کی شان میں ایک زوردار استقبالیہ نظم کہی تھی، حضرت کی استقبالیہ نظم ہزاروں کے مجمع میں ترنم کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملا۔ سامعین اور حاضرین سے تو داد ملی ہی، حضرت امیر شریعت اور اسٹیج پر ذمہ دار علماء نے بھی خاص حوصلہ افزائی فرمائی۔ ذہن کے حافظہ میں ابتدائی بعض اشعار محفوظ ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ہے مژدہ حضرت ملت یہاں تشریف لائے ہیں
شریعت کے امیر کارواں تشریف لاتے ہیں

حسینی علم کے حامل دعا سجاد کے دل کی
علیؓ کے لال، فخر خانداں تشریف لائے ہیں

زباں سے کوثر و تسنیم کے چشمے ابلتے ہیں
طریق حق دکھاتے ہیں جہاں تشریف لائے ہیں

خلف نازاں ہے جنکے عزم وہمت سرفروشی پر
سنانے کو سلف کی داستاں تشریف لائے ہیں

۱۹۷۵ء کے اواخر میں جبکہ راقم مدرسہ امیر الاسلام گوڈی سے مدرسہ احمدیہ کاشی باڑی برائے تعلیم آچکا تھا علاقہ کے ایک اور قدیم درسگاہ مدرسہ فیض عام ہریانو کا سالانہ اجلاس تھا۔ اور اس کا پس منظر بھی یہ تھا کہ بنگال کے بعض علاقوں میں رضاخانی علماء اگر سیدھے سادھے عوام کو ورغلاتے ان کے عقائد بگاڑتے اور خود ساختہ عقائد اور باطل افکار و نظریات عام لوگوں میں پھیلا کر پرامن فضاء کو بگاڑنے لگے تھے۔ مدرسہ ہریانو کے ارباب انتظام

خاص طور سے حضرت مولانا محسن صاحب مرحوم اور ان کے معتقد خاص مولانا شرف الدین رحمانی نے رضا خانی علماء کے گمراہ کن عقائد اور نظریات کی تردید کے لیے حضرت امیر شریعتؒ کی سربراہی میں خصوصی طور مناظر اسلام ۔ مبلغ اعظم حضرت مولانا سید ارشاد احمد صاحبؒ رحمۃ المبلغین دارالعلوم دیوبند کو مدعو کیا گیا تھا ۔ اسی دوران اس علاقے میں رضا خانی علماء کے وکیل مولوی رفاقت حسین صاحب کانپوری بھی موجود تھے اور انہوں نے براہ راست امیر شریعتؒ کی ذات کو ہدف بنایا تھا ۔ عام جلسہ سے قبل مولوی رفاقت حسین صاحب نے امیر شریعتؒ کی خدمت میں ایک دستی مراسلہ بھیجا ۔ تو حضرت امیر شریعتؒ نے اس کا تفصیلی جواب دیا جو بعد میں حضرت مولانا سید ارشاد احمد صاحبؒ نے من وعن افادۂ عام کے لئے شائع کرایا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امیر شریعتؒ کا وہ تاریخی مکتوب ذیل میں پیش کیا جائے ۔ مکتوب گرامی کا آغاز حضرت مولانا سید ارشاد احمد صاحب قدس سرہٗ مبلغ دارالعلوم کے تمہیدی کلمات کے ساتھ یوں ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"میرا کام سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی اشاعت و تحفظ ہے"

حضرت امیر شریعتؒ بہار و اڑیسہ کا مکتوب گرامی ، بجواب

الزامات مولوی رفاقت حسین کانپوری ۔

مولوی رفاقت حسین کانپوری سے مسئلہ صلوٰۃ و سلام پر مراسلات جاری تھی حضرت امیر شریعتؒ سے اس مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن انہوں نے میرے بھی استفسارات سے گریز اختیار کیا اور اسی زمانہ میں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی دامت برکاتہم امیر شریعت بہار و اڑیسہ کی خدمت میں ایک خط لکھا اور موصوف سے میری حیثیت دریافت کی ۔ اور اپنے بعض مفروضہ شبہات کا حل بھی چاہے ۔

حضرت امیر شریعت مدظلہ نے مولوی رفاقت حسین صاحب کے جواب میں ذیل کا گرامی نامہ تحریر فرمایا جو ان کے پاس بھیج دیا گیا ۔ اب عوام و خواص کے استفادہ کی غرض سے اس کی نقل شائع کی جارہی ہے ۔ امید کہ مکتوب گرامی غور سے پڑھا جائے گا تاکہ فرقہ رضاخانی کے غلط

الزامات کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

مولانا سید ارشاد احمد
مبلغ دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم بندہ جناب مولوی رفاقت حسین صاحب!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط ملا میری اور آپ کی کبھی ملاقات نہیں ہے۔ غائبانہ بھی کوئی تعارف ایسا نہیں جس سے آپ کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرسکوں۔ میں مناظرے کا آدمی نہیں ہوں۔ میرا کام حضرت اقدس محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی اشاعت اور حسب استطاعت اس کا تحفظ ہے میں ہر اس شخص کو جو "علی ماجاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" پر ایمان رکھتا ہے مسلمان سمجھتا ہوں۔ اور قرآن مجید یا کسی حدیث متواتر میں تحریف کرنے والے یا انکار کرنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ الحمد للہ میں نسباً بھی آلِ رسول میں سے ہوں اور طریقت میں بھی مجھے کچھ حصّہ سلسلہ قادریہ سے ملا ہے جو سیدنا الشیخ غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ ہے۔ حضرت موصوف ہی اس کے امام ہیں۔ میرا عقیدہ وہی ہے جو سیدنا علیؓ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہم، سیدنا زین العابدین، سیدنا باقر امام، سیدنا جعفر صادق، سیدنا کاظم موسیٰ، سیدنا رضا اور سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ اسرارہم کا تھا۔

میں مذہباً حنفی ہوں اور فقہ حنفی کا حتی الامکان سختی سے پابند ہوں لیکن امیر شریعت ہونے کی بنا پر کسی حنفی مسئلہ پر اتنا زور دینا کہ حق اسی میں منحصر سمجھا جائے۔ مناسب نہیں سمجھتا، میں حنفی ہونے کے باوجود شافعی، مالکی، حنبلی اور اکثر و بیشتر اہل حدیث اور سلفیوں کو اہل سنت والجماعت میں داخل سمجھتا ہوں اور اپنی ہی طرح مسلمان سمجھتا ہوں۔

آپ نے تحقیق اور ثبوت کے بغیر کچھ اعلامات میری طرف منسوب کر دیئے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ صلوٰۃ و سلام افضل ترین اذکار میں سے ایک ہے، جس طرح نماز، کثرت تلاوت و نوافل، ذکر نفی

واثبات اور سلطان الاذکار وغیرہ سے تزکیۂ باطن ہوتا ہے اور رضا و قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے، اسی طرح اگر انسان منکرات سے بچتا رہے اور فرائض و واجبات، سنن موکدہ پر دوام رکھے اور صدق دل سے درود شریف کا ذکر کثرت سے کرتا رہے تو اس کو دینی فوائد حاصل ہوں گے جو کثرت نوافل، کثرت تلاوت اور سلاسل اربعہ کے اذکار و اشغال سے حاصل ہوتے ہیں ایسے لوگوں سے میں ملا ہوں جنہوں نے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پابندی کے ساتھ صرف درود شریف کو اپنا وظیفہ بنایا ہے اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے درود شریف کی رٹ لگائی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کے باطن کو جلا دی ہے اور اپنے قرب سے نوازا ہے۔

حضرت احمد صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رب العالمین ہیں۔ ہر چیز جو خوب مرغوب ہو وہ محبوب و مطلوب کر دی جاتی ہے۔ بنا بریں حق سبحانہ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتے ہیں "انک لعلیٰ خلق عظیم" نیز فرمایا "انک لمن المرسلین علیٰ صراط مستقیم" ایک جگہ فرماتا ہے "انّ ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل" اس آیت میں بھی ملت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صراط مستقیم فرمایا گیا ہے اور اس کے علاوہ تمام راستوں کو داخل سبیل کر کے ان پر چلنے سے منع فرما دیا ہے "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" میرے رب نے بڑہ راست میری تربیت کی ہے اور خوب تربیت کی ہے، تو بہر حال اتباع سنت ہر امتی پر لازم ہے اور یہی فلاح دارین کی ضامن ہے۔

میرا یہ بھی یقین ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ مخلوقات عالم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا فیضان بواسطہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے پھر کیونکر ایک مومن آپ پر درود و سلام نہ پڑھے اور شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہر مسلمان کے لئے زندگی میں کم از کم ایک دفعہ درود و سلام بھیجنا واجب ہے اور یہ عاجز جو کاہل و سست واقع ہوا ہے وہ بھی کم از کم گیارہ سو مرتبہ درود شریف پڑھتا ہے۔

میرا ایمان جیسا کہ میں نے پہلے لکھا "علیٰ ما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" پر ہے۔ میرا ایمان اردو یا عربی کی کتابوں پر خواہ وہ علمائے بریلی کی لکھی ہوں یا علمائے دیو بند کی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سب کتابیں ایسی نہیں کہ انسان اس پر ایمان لائے۔ ایمان لانے والی

کتاب تو قرآن مجید ہے جو بذریعہ وحی جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اس کی وہی تشریح و تفسیر معتبر ہے جو سرکار رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا لائق صد افتخار شاگردوں فقہائے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو یا اس کے مماثل یا قریب تر ہو یا کم از کم اس کے معارض نہ ہو۔

میرا یہ بھی یقین ہے کہ حق تعالیٰ خالق کائنات اور رب العالمین ہے اور ہمیں اور سارے انسانوں کو لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ مخلوقات میں سب سے زیادہ بلند، آپ نہ صرف انسانوں کے بلکہ انبیاء و رسل کے سردار ہیں اگر سیدنا موسیٰ علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تشریف لائیں تو ان کو بھی شریعت محمدیہ ہی کی اتباع کرنی ہوگی اور ان سب باتوں کے باوجود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، مخلوق ہیں۔ خدا کے بندے ہیں، نہ خدا ہیں نہ اللہ تعالیٰ کی صفات مخصوصہ کے ساتھ متصف ہیں۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ میں مناظر نہیں ہوں حضرت مولانا سید ارشاد احمد صاحب مدظلہ مناظر اسلام اور اہل حق کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے قادیانیوں سے اور متعدد گمراہ فرقوں سے بہت سے مناظرے کئے ہیں اور معرکے سر کئے ہیں۔ وہ ہندوستان میں بہت معروف اور اپنی مستقل شخصیت کے مالک ہیں۔ انہیں مناظرہ کرنے کے لئے مجھ جیسے گوشہ نشین کی توثیق و تصدیق کی مکمل ضرورت نہیں۔ چونکہ مجھے کچھ سیاسیات سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ اس لئے آپ کو ایک نیک مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ زمانہ ایمرجنسی کا ہے۔ مناظرہ بازی سے گروہ بندی، انتشار تفریق اور بعض دفعہ مار پیٹ کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ جو اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کے قطعی خلاف ہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ آپ تکلیف فرما کر اسلام پور جائیں اور ایس، ڈی او صاحب سے مل کر مشورہ کریں اور میرا یہ خط سنادیں اس کے بعد اگر انہوں نے آپ کو اجازت دیدی تو پھر انتشار، افتراق اور ہنگامہ خیزی کی ذمہ داری ان پر ہوگی، آپ پر نہ ہوگی اور اجازت تحریری لیجئے گا۔ زبان سے کام نہ چلے گا۔

لوگوں کا بڑا ہجوم ہے۔ اس لیے معذرت کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔

والسلام

منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار واڑیسہ) از ہریانو، ضلع مغربی دیناج پور (بنگال)

۱۸ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ

حضرت امیر شریعت رح کے اس تاریخی اور اہم مکتوب گرامی کے بعد مولوی رفاقت حسین کانپوری نے مکمل خاموشی اختیار کرلی اور چپ چاپ علاقہ خالی کرکے چلے گئے لیکن اہل حق کے جلسہ کی کارروائیاں جاری تھیں، راقم پروگرام کی نظامت کررہا تھا اور حضرت امیر شریعت کی صدارت میں حضرت مولانا سید ارشاد احمد صاحب کا مدلل، مفصل، مکمل اور مسلسل خطاب شروع ہوا۔ آپ کی باطل شکن تقریر نے علاقہ بھر میں رضاخانیت کے ڈھول کے پول کھول کران کے قلعے مسمار کردیئے۔ اسی موقعہ پر حضرت امیر شریعت نے اپنی بعض تصانیف "مکاتیب گیلانی" اور "سفر مصر و حجاز" ازراہ کرم عنایت فرمائے، میری تعلیمی احوال اور پیش رفت کے تعلق سے معلومات حاصل کرنے کے بعد بطور امتحان فقہ بعض مسائل بھی پوچھے اور مراسلت کے ذریعہ مستقل رابطہ کرنے کی تاکید فرمائی۔ اسی دور سے لیکر زندگی کے آخری ایام تک درجنوں اہم اور تاریخی مکاتیب حضرت کے احقر کے نام محفوظ ہیں ہزاروں مریدین، عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کے نام حضرت کے مکاتیب کو مستقبل قریب میں شاید کسی خاص اور باذوق کو جمع کرنے کی توفیق و سعادت حاصل ہو۔

(باقی آئندہ)

نذرانۂ عقیدت

اسلام کے بے لوث خادم مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ دہلی کی یاد میں

عتیق تو پیکر حق و صداقت تھا — عتیق تو دین کی سب سے بڑی فرد تھا
وقار قوم تھا انسانیت کی عظمت تھا — حیات دین کی تو بھاری ضمانت تھا
تو فخر قوم فخر ملت تھا — تو ہر اک عمل میں نیک سیرت تھا
خدا کے دین کی تو نے خوب حمایت کی — خدا کی قسم تو جذبۂ حمیت تھا

بعد از ختم قرآن کریم اور دعائے مغفرت کے ایصال ثواب برائے روح پاک شیخ مفتی عتیق الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ دہلی منجانب مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگ والی سوہنہ ضلع گوڑگانواہ (ہریانہ) نے حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

اس کارگاہ حیات میں افراد، اشخاص مہلت حیات لے کر آتے ہیں اور مہلت حیات پوری کرکے رخصت ہو جاتے ہیں پھر بھی اس دنیوی عالم کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے ازل سے یہ سلسلۂ وجود، عدم جاری ہے لیکن انسانی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے اور حالات و واقعات بھی اس کے گواہ ہیں کہ مخلوق خدا اور اولاد آدم میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے صدق و خلوص اور بلندیٔ کردار نیز عزم و حوصلہ اور ایثار و قربانی کے ایسے تابناک اور انمٹ نقوش صفحۂ ہستی پر ثبت کر جاتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے چراغ راہ ثابت ہوتے ہیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں میں سے ایسی ایک شخصیت ہے اللہ میاں ان کی قبر کو نور سے منور کرے جن کی شفقتوں اور نوازشوں نیز پیہم عنایات سے ملت مستفید اور فیضیاب ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا اسی لئے جب کبھی ان کی یاد آتی ہے تو بے اختیار یہ شعر پڑھا جاتا ہے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

علمی جدوجہد کے میدان میں انہوں نے ایسے آثار ونقوش چھوڑے ہیں جن سے وہ رہتی دنیا تک زندہ، پائندہ رہیں گے۔ انہوں نے خلوص ومحبت کی ایک لمبی داستان اپنے پیچھے ترکہ میں چھوڑی۔

انہوں نے یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور بے آسراؤں پر اپنا دست شفقت پھیرا تھا انہوں نے علم وعمل کی راہ میں بڑی قربانیاں پیش کی ہیں یہ سب ایسے تابندہ نقوش جن کی بنا پر وہ بجا طور پر گروہِ ملت میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں افسوس کہ اب وہ نہیں رہے۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی تمام دینی وملی وقومی خدمات کو بے حد قبول فرما کر پسماندگان میں ان کے عزیزوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمادیں آمین ثم آمین اور ان کی پوری پوری مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں مقام دیں۔

احقر

رحمت علی غفرلہٗ
مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگس والی
سوہنہ ضلع گوڑگانواہ
(ہریانہ)

وفیات

آہ! حکیم سید حسین رح

دلی کی ایک سرکردہ علمی و مجلسی شخصیت حکیم سید حسین دہلوی ۱۹ مئی ۱۹۹۲ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔ وہ جمعیۃ علماء ہند اور ادارہ ندوۃ المصنفین کے قدیم وابستگان سے تھے۔ اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کے ہم نشینوں اور عقیدت مندوں میں سے اہم تھے۔ ۱۹۳۸ء سے جب ادارہ ندوۃ المصنفین قرولباغ میں قائم ہوا تھا۔ تادم حیات وہ حضرت مفتی صاحب مرحوم سے وابستہ رہے۔ ان کی شخصیت میں خدا تعالیٰ نے کئی اوصاف بیک وقت جمع کر دیئے تھے۔ وہ بیک وقت فارسی اور اردو شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے۔

دلی، اہل دلی اور یہاں کے آثار قدیمہ کے متعلق ان کی معلومات بے مثال تھیں۔ اختلافی امور میں ان سے رجوع کیا جاتا تھا۔ موت سے آٹھ دن پہلے وہ ادارہ میں تشریف لائے تھے۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ کوئی تصور کر سکتا تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ ان کی موت میرے لئے ذاتی صدمہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔

اللہ تعالیٰ انکو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

عمید الرحمٰن عثمانی

مفکرِ ملت پیکرِ ایثار وخدمت دردمندِ قوم

مفتی عتیق الرحمن عثمانی

حیات اور کارنامے

برہان

جلد ۱۰۹ | جون ۱۹۹۲ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۶

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا

نظرات

شاہی امام اور کشمیر

جامع مسجد شاہجہانی دلی کے شاہی امام سید عبداللہ بخاری نے اپنے حالیہ دورۂ پاکستان میں، پاکستانیوں کو جتلادیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی فکر نہ کریں۔ اپنے مسائل حل کریں۔ ہندوستانی مسلمان خود اپنے مسائل حل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کشمیر کے مسلمان خود کو سیکولر ہندوستان سے وابستہ کرچکے ہیں۔

نوائے وقت کو ۹ مئی کو دئے گئے ایک انٹرویو میں شاہی امام نے تفصیلی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی حالت پر روشنی ڈالی۔ اور کہا کہ کس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ اور ہندوستان کا سیکولرازم کاغذی ہے۔ عمل میں نہیں ہے۔

ہماری رائے میں سید عبداللہ بخاری ایک حق گو اور مخلص لیڈر ہیں۔ بات چیت میں ڈپلومیٹک زبان استعمال کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اور نہ لگی لپٹی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کو پسند کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ وہاں ان کے مخالف بھی کم نہیں ہیں چونکہ اہل زمانہ آج کل صاف گوئی کے قائل نہیں ہیں۔ خاص طور پر سیاستدانوں کے دو رخ ہیں وہ جیسا موقعہ دیکھتے ہیں۔ ویسی ہی بات کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو امام صاحب کی حق گوئی بالکل نہیں بھاتی۔ امام صاحب نے دو الگ الگ باتیں کہی ہیں، ایک تو یہ کہ کشمیری مسلمان خود کو سیکولر بھارت سے وابستہ کرچکے ہیں۔ اور دوسری یہ کہ بھارت کا سیکولرازم کاغذی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں تاریخ و حقائق کی روشنی میں سچ ہیں، مرحوم کشمیری راہنما شیخ عبداللہ بڑے دور اندیش سیاستداں تھے۔ انہوں نے کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ کیا۔ یقینی طور پر اس اقدام میں کشمیری مسلمانوں اور ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل ان کے پیش نظر تھا۔ ہندوستان کے صاف ستھرے

ذہن کے سیاستدانوں نے یہاں کے لئے جو سیاسی نظام پسند کیا۔ وہ سیکولرازم پر مبنی ہے
آئینی جمہوری ہے۔ ہندوستان کا آئین دنیا کے چند منتخب دستوروں میں سے ایک ہے
یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن ان مخلص سیاستدانوں کا خواب ابھی شرمندۂ تعبیر نہیں
ہو سکا۔ یعنی ہندوستان صحیح معنٰی میں ابھی سیکولر نہیں بن سکا۔ جن سیاستدانوں نے اس ملک
کے لئے سیکولرازم کو اختیار کیا تھا۔ ان میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب شامل تھے۔ مہاتما
گاندھی، پنڈت جواہرلال نہرو، سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی، حسرت
موہانی اور بابا امبیڈکر ان سیاستدانوں میں شامل تھے۔ ان کے خیال میں سیکولر جمہوریت کا
نظام اس ملک کے کلچر اور تاریخ کے عین مطابق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیکولر جمہوریت ہندوستان کی منزل ہے۔ راستہ نہیں۔ ابھی اس
نظام کو پانا ہے۔ اس منزل تک پہونچنا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ابھی ہم اس منزل سے
بہت دور ہیں۔ ملک کے قومی راہنماؤں نے جو خواب دیکھا تھا۔ وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ بلکہ ملک
اس معاملہ میں پیچھے کی طرف گیا ہے۔ گذشتہ ۴۵ برس کی تاریخ گواہ ہے کہ سیکولرازم پر نیک نیتی
کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا
گیا۔ فوج، پولیس اور سرکاری ملازمتوں میں انہیں برائے نام رکھا گیا۔ اسی طرح اردو زبان کو
جو مسلم اکثریت کی زبان ہے۔ قدم قدم پر نظر انداز کیا گیا۔ اسے جمہوری اور آئینی حقوق سے محروم
کیا گیا۔ اسی لئے سید عبداللہ بخاری نے اگر یہ کہا ہے کہ یہ سیکولرازم کاغذی ہے تو غلط نہیں
کہا۔ امام صاحب تو اس حدیث پر عمل کرتے ہیں۔

"افضل الجہاد اعلاء کلمۃ الحق عند سلطان جائر"

ترجمہ : سب سے افضل جہاد ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا ہے۔)

پیشہ ور سیاستدانوں کو شاہی امام کی حق گوئی بری لگے گی۔ لیکن تمام دوراندیش سیاستداں
ان کی حق گوئی کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس تعمیری تنقید سے
فائدہ اٹھائے اور اس حقیقی جمہوریت و سیکولرازم کو عمل میں لانے کی کوشش کرے۔ جس کا
خواب ہمارے قومی لیڈروں نے دیکھا تھا۔

افغانستان کی صورت حال

کابل سے بڑی تشویشناک خبریں آرہی ہیں۔ عارضی جنگ بندی ہوئی ہے۔ جلد ہی بندوق کی گولیوں اور توپوں کے گولوں کی گھن گرج سے یہ جنگ بندی ٹوٹ جاتی ہے اگرچہ موجودہ افغان لیڈر کابل اور باقی ماندہ ملک کو ایک بھیانک خوں ریزی سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں افغانستان کی ۱۴ برس کی خوں ریز جدوجہد میں تقریباً ۲۰ لاکھ افغانی شہید ہوئے اور اربوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔

افغانستان کی باگ ڈور اس وقت ۵۱ رکنی کونسل کے سپرد ہے۔ اس کے صدر پروفیسر صبغت اللہ مجددی ہیں۔ آپ قاہرہ کی اسلامی یونیورسٹی الازہر سے فارغ التحصیل ہیں سالہاسال تک دینیات کے پروفیسر کے طور پر کابل یونیورسٹی میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ اس وقت کابل پر عملاً احمد شاہ مسعود وزیر دفاع کی حکومت ہے۔ افغانستان میں نجیب اللہ کی معزولی اور مجاہدین کی عبوری حکومت قائم کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ تیسرے بڑے راہنما گلبدین حکمت یار پاکستان سے کابل پہونچ چکے ہیں۔ تاہم پروفیسر مجددی اور احمد شاہ مسعود ابھی تک انہیں منانے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ احمد شاہ مسعود نے کابل کو حتی الامکان خانہ جنگی سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ گلبدین حکمت یار جنھیں پاکستان اور امریکہ کی حمایت حاصل رہی ہے۔ اس پر ناخوش ہیں کہ انہیں اقتدار میں اتنا حصہ نہیں دیا جا رہا ہے جس کے وہ مستحق ہیں یہ اس پر زور دے رہے ہیں کہ جنرل دوستم اور ۲۰ ہزار جوانوں پر مشتمل ان کی ملیشیا کو کابل سے نکالا جائے۔ اور یہ شمالی افغانستان میں اپنے مرکز کی طرف لوٹ جائے۔ بظاہر اس سے ان کا مقصد کابل کو ہر طرح کے سیاسی و فوجی دباؤ سے آزاد رکھنا ہے۔ تاہم پروفیسر مجددی اور احمد شاہ مسعود نے ایسا کرنے سے انکار کردیا ہے۔

جنرل دوستم اور احمد شاہ مسعود ایک ہیں۔ یہی بات گلبدین حکمت یار کو ناپسند ہے۔ پروفیسر بڑے صاف گو انسان ہیں، ان کا دم غنیمت ہے اہل کابل انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دیکھئے اقتدار کی اس کشمکش کا انجام کیا ہوگا۔ کیا وہ افغانستان کی موجودہ ڈانواڈول

صورت حال پر قابو پالیں گے۔ اور اسے سیاسی استحکام دے سکیں گے۔ اس کا جواب مستقبل کے پردے میں پوشیدہ ہے۔

پروفیسر مجددی نے حال ہی میں اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ مغرب نے ہمارا نام بنیاد پرست رکھا ہے۔ آخر کیوں۔ کیا اپنے مذہب کو ماننا بنیاد پرستی ہے۔ کیا دوسرے ممالک مذہب کو نہیں مانتے انہیں بنیاد پرست کیوں نہیں کہا جاتا۔ پروفیسر مجددی بڑے روشن خیال اور انتہائی تعلیم یافتہ سیاستداں ہیں اگر وہ افغانستان کی موجودہ صورت حال پر قابو پا کر اسے ایک مستحکم سیاسی نظام دینے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

افغان قوم پیدائشی طور پر بہادر قوم ہے۔ اس نے بیش بہا قربانیوں کے بعد آزادی پائی ہے۔ اس آزادی کو برقرار رکھنے اور ملک کو ترقی کی راہ پر چلانے میں ابھی وقت لگے گا۔

جامعہ کا بحران

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جس کے بانیوں میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ مولانا محمد علی، اور حکیم محمد اجمل خاں رہے ہیں۔ تادم تحریر بند ہے۔ پرووائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے ایک عاقبت نااندیشانہ اور احمقانہ انٹرویو کے بعد جو تنازعہ شروع ہوا تھا۔ وہ طول کھینچ گیا۔ وائس چانسلر مسٹر بشیر احمد نے جامعہ ملیہ کو بند کرادیا۔ طلباء سے، جو پروفیسر مشیر الحسن کے انٹرویو کے خلاف احتجاج کر رہے تھے ہوسٹل خالی کرالیا گیا۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ امتحانات کا زمانہ تھا۔ اور امتحانات کے فوری بعد داخلوں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ افسوس ہے کہ اس ساری کارروائی میں طلباء کو سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے۔

پروفیسر مشیر الحسن نے اب تک معافی نہیں مانگی۔ انہوں نے ایک اخباری انٹرویو میں سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب "شیطانی کلام" پر سے پابندی ہٹانے کی بات کہی تھی۔ گویا ان کے نزدیک شیطانی کلام پر پابندی اظہار خیال پر پابندی کے مترادف ہے جب ان کی اس رائے پر ہنگامہ شروع ہوا تو انہوں نے اگر مگر کے ساتھ بیانات دیئے جو انگریزی اخبارات چند دہ لائن کی خبر دینے میں بھی تکلف کرتے ہیں۔ وہ کالم کے کالم ان کے بیانات سے سیاہ کئے جا رہے ہیں۔

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر مشیر الحسن پکاپالیٹک آدمی ہیں۔ کیا کوئی سنجیدہ اور پڑھا لکھا آدمی، ایک ناول (شیطانی کلام) کے متعلق یہ بات کہہ سکتا ہے کہ یہ اظہار خیال کا معاملہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس انسان کو تعلیم سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ تعجب ہے کہ آپ کسی قومی لیڈر، راہنما، یا ایک عام انسان پر تو ذاتی حملے یا الزام تراشی نہیں کر سکتے۔ اس کے خلاف نقض امن، ہتک عزت اور نہ جانے کتنے قوانین حرکت میں آجاتے ہیں۔ اس وقت اظہار خیالات کی آزادی کا کوئی سوال ذہن میں نہیں پیدا ہوتا۔ یہودیوں کے ایجنٹ سلمان رشدی نے ناول میں جس طرح رمزیہ انداز میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کر کے۔ مسلمانان عالم کا دل دکھایا، کیا وہ کسی طرح کی بھی ہمدردی کا مستحق ہے؟

بہتر تو یہ تھا کہ پروفیسر مشیر الحسن اپنے اس بیان کو واپس لیتے۔ اور غیر مشروط معافی مانگ کر توبہ کرتے لیکن انہوں نے ہٹ دھرمی کا ثبوت دیا ہے۔ اور اس سے زیادہ نادانی کا ثبوت وائس چانسلر نے جامعہ کو بند کر کے دیا ہے۔ اس کا مقصد صرف دباؤ ڈالنا ہے۔ کہ امتحان اور تعلیم کے نقصان کے ڈر سے طلبا اپنا ایجی ٹیشن واپس لے لیں۔ اگر وائس چانسلر چاہتے تو غیر مشروط معافی کے ذریعہ طلبا کو مطمئن کر کے اس تنازعہ کو بہ آسانی حل کرا سکتے تھے۔ معلوم نہیں ان کے پیچھے کون ڈور ہلا رہا ہے۔

یادگارِ سلف حضرت امیرِ شریعتؒ

از: محمد سعید الرحمٰن شمس، مدیر، نصرۃ الاسلام، کشمیر

قسط ۲

دارالعلوم دیوبند حضرت امیرِ شریعتؒ ملک کے سینکڑوں چھوٹے بڑے علمی، ملی، سماجی اور اصلاحی اداروں اور انجمنوں کے بنیادی رکن اور سرپرست ہونے کے علاوہ ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی ازہرالہند دارالعلوم دیوبند کی سب سے اہم اور بااختیار کمیٹی یعنی مجلسِ شوریٰ، کے اہم ترین رکن تھے اور دارالعلوم کے جملہ تعلیمی اور انتظامی امورات ومعاملات میں آپ کی صائب رائے اور مشورے کو زبردست وقعت اور اہمیت حاصل تھی ۱۹۷۶ء میں راقم الحروف کی شدید خواہش اور والد مرحوم کے ایما رواجازت (کہ ان کے تمام لڑکے جو جدید اعلیٰ تعلیم سے آراستہ تھے اور مجھے خصوصیت سے دینی تعلیم دلوانا چاہتے تھے) اور خاندان کے دیگر اکابر اور بزرگوں سے مشورہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا، دارالعلوم کے مبلغ اعلیٰ حضرت مولانا سید ارشاد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا سید اسعد المدنی کے ساتھ تعارف کے سبب مراسلت اور مکاتبت بھی تھی اور ان حضرات کی بھی خواہش تھی کہ راقم دیوبند آجائے۔ دیوبند آتو گیا مگر یہاں سخت امتحانی ضابطوں، محدود داخلوں اور بعض جدید قوانین کے تحت داخلہ میں دشواریاں ہونے لگیں۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں شوریٰ کا اجلاس چل رہا تھا اور دیگر ممبران سمیت حضرت امیرِ شریعتؒ بھی اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لا چکے تھے، مجھے اچانک خبر مل گئی اور قیام گاہ مہمان خانہ میں حاضر ہوا، اگرچہ اساتذہ اور طلبہ کی خاصی بھیڑ تھی لیکن حضرت امیرِ شریعتؒ کی نظر جونہی پڑی پہچان گئے، حیران ہوئے اور [illegible] پاس بٹھایا۔ احقر نے دارالعلوم آنے کی غرض وغایت اور داخلہ میں حائل مشکلات عرض کیں، امیرِ شریعت کے پہلو میں حضرت مولانا ارشاد احمد

صاحب کے علاوہ دیرینہ اور قدیم استاد دارالعلوم حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاری بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا ارشاد صاحب نے میری پرزور وکالت اور حمایت کی، امیر شریعتؒ نے اسی وقت مولانا بہاری کو میرے داخلے کے تعلق سے خصوصی حکم دیا اور الحمدللہ حضرت امیر شریعتؒ کی توجہ سے احقر کا معاملہ ترجیحی بنیادوں پر حل کیا گیا۔ اس لحاظ سے دارالعلوم میں اس کم سواد کا داخلہ اور اپنی بساط کے مطابق نامور اساتذہ سے فیض واستفادہ حضرت امیر شریعتؒ ہی کا رہین منت ہے چار سالہ قیام دارالعلوم کی مدت میں درجنوں مرتبہ شوریٰ اور عاملہ کی مجلسوں میں شرکت کے لئے حضرت امیر شریعتؒ دیوبند تشریف لاتے تو ملاقات، زیارت اور خدمت میں حاضر رہنے کا موقع ملتا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیبؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، قاضی شریعت مولانا زین العابدینؒ، داعی دین حضرت مولانا منظور نعمانی مدظلہٗ، محقق زماں حضرت مولانا احمد سعید اکبر آبادیؒ اور حضرت امیر شریعتؒ کے مابین جو دینی اور علمی ارتباط باہمی احترام واکرام، ذہنی وفکری ہم آہنگی اور مجالس میں مختلف النوع موضوعات پر اکابرین ملت کی گفتگو کی بعض جھلکیاں بھی دیکھنے اور سننے کو ملیں۔

قیام کشمیر اگست ۱۹۸۱ء کے وسط میں ملازمت کے تعلق سے جب مستقل طور سے کشمیر میں رہنے لگا اور یہاں حضرت شہید ملت میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت اور رفاقت میں دینی و علمی کام کرنے کا موقع ملا، تو کل ہند مسلم پرسنل لا" اور" کل ہند مسلم مجلس مشاورت" کے جلسوں اور میٹنگوں میں ملک کے مختلف حصوں اور مرکزی مقامات خاص طور دہلی کا سال میں کئی کئی بار سفر ہوتا اور ان مجالس ونشستوں میں حضرت امیر شریعتؒ سے زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل رہتا کشمیر سے سرما کی تعطیل میں جب جب وطن یعنی بنگال کے سفر کا موقعہ ملتا تو قدرتی طور اپنے علاقہ میں ان دنوں دینی جلسوں اور سیمناروں کا جیسے موسم ہوتا۔ اکثر وبیشتر عوامی اور دینی جلوس میں حضرت امیر شریعتؒ کی صدارت میں احقر کو خطاب کرنے کا موقعہ ملتا، ۱۹۸۸ء کی جنوری و فروری میں جو کہ اپنے علاقہ کے حضرت امیر شریعتؒ کا آخری اور تفصیلی دورہ تھا طویل ترین رفاقت اور خدمت کی سعادت حاصل رہی۔ اس موقع سے حضرت امیر شریعتؒ میرے آبائی گاؤں گوتی بھی تشریف لائے، برادر اعظم جناب

حفیظ الرحمن نیر ایم، اے، میرے بڑے بہنوئی جناب ڈاکٹر عین الحق پانجی باڑہ، جناب ڈاکٹر اسیرالدین بستہ وغیرہ نے خصوصیت سے حضرت امیر شریعتؒ سے فیض اٹھانے کی کوشش کی ہر شب مختلف مقامات پر مختلف دینی عنوانات پر احقر کا خطاب ہوتا، حضرت توجہ سے سنتے مناسب اصلاح فرماتے اور مشورے دیتے، سفر کے اختتام پر راقم جب چھٹیاں گذار کر کشمیر لوٹا اور حضرت کی خدمت میں خط لکھا تو جو جواب حضرت نے عنایت فرمایا اسے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ مکتوب گرامی اصلاحی بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

عزیزم!

مولوی سعیدالرحمن شمس وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ ملا، "کل امر مرہون باوقاتھا" اب آپکی ذمہ داریاں بے حد بڑھ گئی ہیں۔ بنگال میں بھی اور کشمیر میں بھی، کشمیر جاکر کچھ زیادہ آزادی آپ میں آگئی ہے آپ کو اسے قابو میں کرنا ہوگا۔ سب سے پہلی بات نماز کا پورا اہتمام، آپ ماشاءاللہ عالم دین ہیں۔ آپ کے لئے صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں ہے آپ کو نماز پورے اہتمام سے پڑھنی ہوگی کہ اس اہتمام کو دیکھ کر دوسرے لوگ متاثر ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ اس کی طرف پوری توجہ کریں گے اور خط کے ذریعے مجھ سے آپ ایک طرح کا عہد کریں گے اس کے سوا وہ تین ہلکے پھلکے وظیفے جو میں نے بتلائے ہیں اس کی پابندی کریں گے، تعداد کم ہیں لیکن اس میں اصل چیز توجہ الی اللہ ہے۔ پس یہ خیال کہ دربار الٰہی میں حاضر ہیں۔ انشاءاللہ آپ جلد ترقی کریں گے۔ اس راہ میں بھی ذہین آدمی جلد ترقی کرتا ہے۔

شادی کا فرض بھی آپ کو انجام دے لینا چاہیئے اور جلد وہ حدیث تو آپ کے سامنے ہوگی

"یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحسن للفرج الخ

اور آپ کو کفو کے مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ فقہاء نے کفو کی اہمیت بلاوجہ نہیں بتلائی کفو کی لڑکیاں دیکھی بھالی ہوتی ہیں ان کے ساتھ نباہ سہل اور آسان ہے میں انشاءاللہ آں عزیز کے لئے برابر دعا کرتا رہوں گا۔

مولوی عبدالرحمن سلمہٗ اللہ سلام کہتے ہیں۔ مولانا مفتی ظفیرالدین صاحب زید مجدہم اس وقت خانقاہ میں موجود ہیں۔ انہوں نے کہلایا ہے کہ میری خصوصی دعا لکھدی جائے خدا آں عزیز کو تبلیغ

دعوت پر قائم و دائم رکھے۔ گھر میں سبھوں سے فرداً فرداً سلام و دعاء کہدیں"

والسلام

منت اللہ رحمانی

اسلام کا آفاقی پیغام ۱۹۸۴ء میں شہید ملت میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق رحمۃ اللہ علیہ کی بعض منتخب، گراں قدر اہم علمی اور دینی تقریروں کا مجموعہ "اسلام کا آفاقی پیغام" کے نام سے شہید ملت کی ہدایت اور نگرانی میں بڑی کاوش اور محنت کے بعد مرتب کیا گیا جس کے ابتک تین ایڈیشن ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر ریاست اور بیرون ریاست شائع ہو چکے ہیں اور جس پر ملک و بیرون ملک کے مشاہیر علماء، اہل قلم اور مفکر دانشور حضرات کے علاوہ حضرت امیر شریعت رح کے تاثرات بھی زینت کتاب ہیں حضرت امیر شریعت رح لکھتے ہیں!

" زیر نظر مجموعہ" اسلام کا آفاقی پیغام" میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق کے منتخب خطبات اور تقریروں کا مجموعہ ہے مولانا محمد فاروق نہ صرف کشمیر بلکہ ملک کی جانی پہچانی معروف شخصیت ہیں۔ علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد ہی سے آپ دینی کاموں، تبلیغ و وعظ اور رشد و ہدایت میں مشغول ہیں"۔

" مولانا محمد فاروق کشمیر کے میر واعظ خاندان کے چشم و چراغ اور اپنی خاندانی روایت کے حامل اور کشمیر کے مسلمانوں کے رہبر و رہنما ہیں"

۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۱ء میں جب علامہ غلام رسول شاہ صاحبؒ میر واعظ کشمیر رح نے "انجمن نصرۃ الاسلام" کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اولین کشمیر کے مسلمانوں کو تعلیم خاص طور دینی تعلیم سے آشنا کرنا اور جدید تقاضوں کے پیش نظر اسلامی دائرہ میں رہتے ہوئے کتاب و سنت کی اساس پر کشمیر کے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی رہنمائی کرنا ہے" انجمن نصرۃ الاسلام" کشمیر کی سب سے قدیم، متحرک، فعال اور بافیض انجمن ہے اس کے ذریعے کشمیر کے مسلمانوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور پایا ہے! آج اس زندہ انجمن کی سربراہی اور ذمہ داری مولانا محمد فاروق جیسے جواں سال اور جواں ہمت کے سپرد ہے ہمیں مسرت ہے کہ مولانا محمد فاروق اپنی اس ذمہ داری کو باحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ اور انھوں نے انجمن کے اغراض و مقاصد میں توسیع کی ہے اور اس کے دائرۂ کار کو وسعت دی ہے اور انجمن کی افادیت کو بڑھایا ہے۔

مولانا محمد فاروق نے اپنی دینی اور اسلامی جدوجہد کے سلسلہ میں مختلف مقامات پر جو خطبات دیئے ہیں اور تقریریں کی ہیں اسے ہمارے عزیز مولانا سعید الرحمٰن شمس القاسمی نے مرتب کیا ہے ان خطبات سے کشمیر اور ملک کے مسلمانوں کو دینی فوائد پہونچے ہیں اور اب اسے زیور طبع سے آراستہ کرکے ان تمام لوگوں کو بھی فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جا رہا ہے جو مولانا کے خطبات میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔

مسرت ہے کہ مجھے "اسلام کا آفاقی پیغام" سے متعلق چند سطریں لکھنے کا موقع ملا، حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق کو بہت دنوں سلامت با رادت رکھے۔ اور ان کی دینی اور اسلامی جدوجہد کو شرف قبول بخشے اور ان کی ذات سے نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ملک کے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے۔ آمین"

(دستخط: منت اللہ رحمانی)

یکم رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ

امیر شریعتؒ اور شہید ملتؒ کے مابین ربط و تعلق

یہ ایک مستقل عنوان ہے اور اس پر ایک مستقل مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے تاہم یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ حضرت امیر شریعتؒ نہ صرف آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری جنرل تھے بلکہ بورڈ کے اولین داعی اور بانیوں میں تھے۔ بورڈ اور آپ کی ذات لازم وملزوم تھی۔ ملک کے مختلف مرکزی مقامات اور شہروں میں بورڈ کا سالانہ اجلاس ہوتا تو شہید ملت میر واعظ فاروقؒ اپنی تمام تر مقامی مصروفیات کو بالائے طاق رکھکر سفر فرماتے، دہلی کلکتہ، مدراس، حیدرآباد، بنگلور، بمبئی، لکھنؤ اور کانپور وغیرہ کے سالانہ جلسوں میں بورڈ کے موقر اراکین کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے حضرت شہید ملت میر واعظؒ کا بھی خطاب ہوتا، اس کے علاوہ "کل ہند مسلم مجلس مشاورت" کی میٹنگوں میں بھی امیر شریعتؒ اور شہید ملتؒ کی خصوصی ملاقاتیں رہتیں اسی تعلق اور ربط کا اہم ترین مظہر یہ کہ ۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس کے تعلق سے حضرت امیر شریعتؒ کی قیادت میں بورڈ نے سپریم کورٹ کے غیر اسلامی فیصلہ کے خلاف پر امن ملک گیر تحریک شروع کی تو امیر شریعتؒ کے ایماء پر شہید ملتؒ نے ریاست جموں و کشمیر

میں ہفتہ تحفظِ شریعت پورے جوش و خروش، دینی حمیت اور ملی غیرت کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر ستمبر ۱۹۸۵ء میں وادی کے سرکردہ علماء، دانشور، دینی اور سیاسی تنظیمات کے سربراہان اور ذمہ داروں کے علاوہ "مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے موقر وفد کے جن اہم اور قابلِ ذکر اراکین اور اکابرین نے حضرت امیر شریعتؒ کی سربراہی میں وادی کا مفصل دورہ کیا ان میں جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، جناب جی ایم بنات والا، جناب سلطان صلاح الدین اویسی، قاضی شریعت حضرت مولانا مجاہدالاسلام القاسمی، جناب مولانا عاقل رحمانی حیدرآبادی، جناب عبدالرحیم قریشی معروف صحافی ناز انصاری اور حضرت الاستاذ مولانا سید انظر شاہ الکشمیریؒ نمایاں ہیں۔ عام لوگوں کو عوامی اجتماعات، سیمناروں، جلسوں اور علمی لٹریچر کے ذریعے پرسنل لاء کی اہمیت، ضرورت اور افادیت ذہن نشین کراتے ہوئے صاف طور پر یہ بات بتائی گئی کہ ؎

تقدیر کے پابند ہیں جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

رائے عامہ کو اس لئے بیدار کیا گیا کہ شریعت اسلامی کے دفاع کے لئے مسلمان کسی بھی قسم کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے مفید اور مثبت نتائج برآمد ہوئے اور تحفظ شریعت کی ملک گیر اور ہمہ گیر مہم پوری طرح کامیاب رہی۔

کشمیر میں ہفتہ تحفظ شریعت کے پروگراموں کی ترتیب اور قیادت راقم کے سپرد تھی۔ حضرت شہید ملتؒ کی نگرانی اور ہدایت میں مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود تمام تقاریب ہر لحاظ سے کامیاب اور بامقصد رہیں۔

شہید ملت میر واعظ فاروق کی قیادت میں حضرت امیر شریعتؒ اپنے دیگر معزز مندوبین کے ہمراہ ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود تمام منعقد تقریبوں میں ہشاش بشاش شرکت فرماتے رہے۔

کشمیر میں ہفتہ "تحفظ شریعت" کی تقریبات کی ویڈیو فلم بنانے کے علاوہ اخبارات وغیرہ کے لئے فوٹوگرافی کا بھی مناسب نظم تھا اگرچہ ان معاملات میں حضرت امیر شریعتؒ اپنے اکابر اور اسلاف کے اصولی موقف کے شدت سے حامی تھے تاہم مصالح، میڈیا اور مقاصد حسنہ

کی پبلسٹی کی خاطر بمشکل اجازت دی کہ اس سے دعوتی پہلو اجاگر ہونے کی منشا بھی ذہن میں تھا۔

اسلام کی بنیادی تعلیمات

۱۹۸۷ء کے اواخر میں شہید ملت میرواعظ مرحوم کی دعوتی اور عوامی تصنیف "اسلام کی بنیادی تعلیمات" جب مرتب کی گئی تو حضرت مرشدنا الامام، علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے دقیع مقالہ کے ساتھ حضرت امیر شریعت نے اپنے تاثرات کچھ یوں ارقام فرمائے "کشمیر حسن ظاہر کے ساتھ ساتھ حسن باطن میں بھی ممتاز رہا ہے حضرت بلبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے اسلام کا پیغام یہاں پہنچا اور میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھ آنے والے صاحب دل حضرات نے یہاں اسلام کے پیغام کو جلا بخشی اور اس پیغام کو پھیلانے اور دلوں میں اتارنے کا سلسلہ علماء و صلحاء اور اولیاء اللہ کے ذریعے برابر جاری رہا۔

میرواعظ انہی لوگوں کا لقب ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت پر بڑی محنت کی ہے، اس سلسلہ کی ایک کڑی میرواعظ مولوی محمد فاروق صاحب (مدظلہ) ہیں جو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر مضبوطی کے ساتھ قائم اور گامزن ہیں اور جن کے ہاتھوں آج کل مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت پروان چڑھ رہی ہے۔ موصوف صرف ایک اچھے واعظ اور مقرر ہی نہیں بلکہ صاحب قلم اور صاحب تصنیف بھی ہیں۔

زیر نظر کتاب "اسلام کی بنیادی تعلیمات" جو آپ کے خطبات و مواعظ کا مجموعہ ہے، اسوقت میرے سامنے ہے۔ یہ کتاب حسن ظاہر کے ساتھ حسن باطن میں بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ تقریر و مواعظ کا یہ مجموعہ حسن ترتیب کے باعث ایسا مربوط ہوگیا ہے کہ اسے تقریر و مواعظ کا مجموعہ کہنا مشکل ہے۔ نہایت سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو درج کیا گیا ہے اور جہاں تک میں مطالعہ کرسکا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اہل سنت والجماعت کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے اسلام کی ساری بنیادی تعلیمات اس میں لکھی گئی ہیں۔ ایمان و اسلام اور نماز روزہ حج و زکوٰۃ سے دعا و درود تک اس میں موجود ہے۔

حق تعالیٰ میرواعظ مولوی محمد فاروق صاحب مدظلہ کو بھرپور اجر عطا فرمائے کہ انہوں نے یہ کتاب شائع کرکے مسلمانوں کے لئے نجات اخروی و سعادت ابدی کا راستہ ہموار کردیا۔

فجزاہ عنی وعن سائر المسلمین خیر الجزآء۔

(منت اللہ رحمانی)

(خانقاہ رحمانی مونگیر)

امیر شریعتؒ کا آخری مکتوب

زندگی کا نظام معمول کے مطابق چل رہا تھا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا کہ کشمیر میں مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا اور آناً فاناً ریاست کی ممتاز دینی اور سیاسی شخصیت میرواعظ کشمیر مولوی محمد فاروق رحمۃ اللہ علیہ کو ایک منظم سازش کے تحت ۲۱ مئی ۱۹۹۰ء کو بڑی مظلومیت اور بے دردی کے ساتھ اپنی ہی رہائش گاہ میں شہید کر دیا گیا، میرواعظ مرحوم کی شہادت سے ریاستی عوام کے علاوہ ہندوستان، پاکستان اور عالم اسلام میں ایک تہلکہ مچ گیا، اور ہر طرف رنج وغم کی ایک ہمہ گیر لہر دوڑ گئی، کشمیر، برصغیر اور دنیا بھر کے اکابر علماء اور اہل فکر و اہل قلم حضرات نے تعزیتی بیانات، مضامین اور مقالے شائع کرائے، حضرت امیر شریعتؒ نے جو بیان جاری فرمایا اسے تو بعد میں ملک کے متعدد اخبارات اور "نصرۃ الاسلام" کے "شہید ملت نمبر" کے شکریہ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے۔ پہلے حضرت کا راقم کے نام آخری مکتوب ملاحظہ کریں کہ اس کے بعد ربط وملاقات کی سعادت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

عزیزم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خط ملا، میرواعظ مولوی محمد فاروق رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت بڑا اندوہ ناک حادثہ ہے میرا حال تو یہ ہے کہ جب اس واقعہ کا ذکر آتا ہے میرواعظ مرحوم سامنے کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ "نصرۃ الاسلام" کا شہید ملت نمبر نکال رہے ہیں۔ بہت اچھا خدا آپ کو کامیاب کرے میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ مضمون وغیرہ تو بعد کی چیز ہے آپ اس نمبر میں میرا وہ بیان دیدیں جو میں نے مرحوم کی شہادت پر دیا ہے۔ یہ بیان ہندوستان کے تمام اخبارات نے شائع کیا ہے میں اس وقت سے دو اگست تک بہر حال مونگیر میں ہوں اس کے بعد بورڈ کی عاملہ کا اجلاس وغیرہ ہوگا تو یہاں وہاں جانا پڑے گا۔ لیکن برسات میں اکثر و بیشتر قیام مونگیر

ہی میں رہے گا۔ اللہ کرے عزیز بہ ہمہ وجوہ باخیر ہوں۔

والسلام

(سید منت اللہ رحمانی) ۱۹؍۷؍۹۰ء

میرواعظؒ کی شہادت اور امیر شریعت کا تعزیتی بیان

اور اب ملاحظہ کیجئے حضرت امیر شریعتؒ کا تعزیتی مضمون جو حقائق پر مشتمل ہے:" میرواعظ مولوی محمد فاروق کی شہادت کشمیر کے غیر یقینی حالات اور انتظامیہ کی ناکامی کی واضح مثال ہے میرواعظ وادی کشمیر کے مقبول مذہبی رہنما اور بڑی مؤثر شخصیت کے مالک تھے اور پورے ملک میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ دہشت گردوں کا نشانہ بنے یا حکومت کی سازش کا شکار ہوئے مگر اس حادثہ کی نوعیت نے واضح کر دیا کہ کشمیر کے حکمرانوں کو وہاں کی اہم شخصیتوں کے تحفظ کا بھی خیال نہیں ہے۔ انہیں کشمیریوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ صرف کشمیر کی سرزمین پر مالکانہ قبضہ اور غاصبانہ اقتدار چاہتے ہیں۔ کشمیر میں دہشت گردی پر قابو پانے کے نام پر معصوموں کے قتل و خون اور انہیں پریشان کرنے کا سلسلہ چل رہا ہے۔ امن پسند شہریوں پر خوف و دہشت طاری ہے اور وہاں حکومت ایسے حالات پیدا کر رہی ہے جس سے صورت حال اور بگڑتی جا رہی ہے۔ اسمبلی کے توڑنے سے لیکر دہشت گردی پر قابو پانے کے نام پر معصوموں کی قتل و غارت گری تک کے سرکاری اقدامات نے کشمیر اور اس کے حکمرانوں کے درمیان دوری اور بداعتمادی کو بڑھایا ہے۔

یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ مرکزی حکومت اس میں ملوث ہوتی جا رہی ہے اور مرکزی اقتدار کے کچھ منتظم سیاسی عناصر کشمیر میں بدامنی، قتل و غارت گری کی فضا کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تاکہ مستقبل میں ان کے اقتدار کی بنیادیں مستحکم ہو سکیں اور ووٹ کی سیاست میں انہیں کامیابی حاصل رہے شاید وہ نہیں سمجھتے کہ اقتدار ملک کے مستقبل اور عوام کے اعتماد سے زیادہ قیمتی چیز نہیں۔ کشمیر میں معصوموں کے خون سے نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے جس کے اثرات پورے ملک پر پڑیں گے۔ مسٹر جگموہن اور ان کی انتظامیہ کا طریق کار کیا رہا ہے اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب میرواعظ کی نعش ہسپتال سے لائی جا رہی تھی تو پولیس کی "گولیوں

کا نشانہ بننا پڑا، بربریت، سفاکیت کی یہ ایسی مثال ہے جس میں نفرت کی بھی بُو محسوس ہوتی ہے۔

میر واعظ نے سفاکیت کا نشانہ بنکر شہادت کا درجہ پالیا اور ربّ غفور کے حضور حاضر ہوگئے مگر اس اندوہ ناک حادثہ نے معاملہ کشمیر کو پیچیدہ اور بداعتمادی کو گہرا کر دیا ہے دہشت گردی کو کبھی بھی پسند نہیں کیا جا سکتا نہ وہ مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ دہشت گردی کہیں ہو اور کسی حال میں ہو وہ ناقابل قبول ہے۔ جس کے نتیجے میں انتشار ہوگا اور ملک کا ٹکڑا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ گاندھی کے عدم تشدد اور نہرو کی امن پسندی کی دہائی دینے والوں نے بھی تشدد میں مسائل کا حل ڈھونڈنا چاہا ہے۔ اور وہ گولیوں سے عوام کا دل جیتنا چاہتے ہیں اور انہوں نے تھوڑے سے لوگوں کی دہشت گردی کو ختم کرنے کے بہانے حکومت کے زیر سایہ دہشت کی فضا رقائم کر رکھی ہے جبکہ کشمیریوں کا دل جیت کر ہی کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا کہ کشمیر میں آج تک کوئی فساد نہیں ہوا وہاں ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کی فضا برابر رہی ہے لیکن اب حکومت وہاں فرقہ وارانہ ماحول اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلا رہی ہے۔ کشمیر سے لوگوں کو لاکر جموں اور دہلی میں کیمپ لگانا اور پورے ملک میں اسے مشہور کرنا فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ و مشتعل کرنے کی منظم کوشش کا ایک حصہ ہے ووٹ کی سیاست کے لئے کشمیر جیسے سرحدی اور حساس صوبہ کو استعمال کرنا ملک کے لئے بہت خطرناک ہے مرکز کو واقعیت پسندی سے کام لینا چاہیئے۔

مسٹر جگموہن کے اقدامات کو کسی بھی طرح پسند نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے سرکاری دہشت گردی پھیلائی معصوم عوام کا خون کیا وہ میر واعظ کی حفاظت کا کوئی نظم نہیں کر سکے اور جب معاملہ بہت بگڑ گیا تو مرکزی حکومت نے انہیں چھٹی دیدی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے شہید ملت میر واعظ کی قبر سے یہ آواز آرہی ہو ؎ کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

کشمیر میں امن کے قیام کے لئے مرکزی حکومت کو اپنا رول ادا کرنا چاہیئے اور ظلم و بربریت کی جگہ اخوت و محبت کی فضا رہی کشمیر کے مسئلہ کا حل بن سکتی ہے۔"

بسا آرزو کہ خاک شدہ

خیال تھا اس دفعہ موسم سرما کی تعطیل میں وطن عزیز جانا ہوگا تو علم و حکمت اور سلوک و تصوف کے اہم مرکز خانقاہ رحمانی میں

حاضری دوں گا اور حضرت امیر شریعتؒ سے فیض یاب ہونے کی کوشش کروں گا مگر " اے
بسا آرزو کہ خاک شدہ"

اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سامنے انسان کو بھلا دم مارنے کی مجال کہاں؟ حضرت امیر
شریعتؒ نے اپنی پوری زندگی رضائے الٰہی اور اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گذار کر کما حقہ
اپنے دینی، ملی سیاسی اور دعوتی فرائض پورے کئے اور اب وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس
نہیں لوٹتا۔

" من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فمنهم من قضی نحبه ومنهم
من ینتظر وما بدلوا تبدیلا " (القرآن)

انتقال پر ملال کی خبر کشمیر ریڈیو سے سنی تو دل دھک سے رہ گیا اور آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھا گیا کہ مسلسل کئی سالوں سے اپنے مشفق بزرگوں کے سایۂ شفقت و عاطفت سے ذاتی
طور محروم ہوتا جا رہا ہوں۔ قیام کشمیر کے بعد سے سب سے پہلے والد محترم کا سایہ سر سے
اٹھا، اس کے بعد حضرت مولانا سید ارشاد احمد صاحبؒ نے وصال کیا، بعدہٗ میر واعظ مولوی محمد فاروق
شہید ہوئے اور اب حضرت امیر شریعتؒ بھی رب غفور کے حضور پہنچ گئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

اسلام کے احسانات

شہید ملت میر واعظ فاروقؒ کی آخری یادگار اور گرانقدر تالیف
"اسلام کے احسانات" کی کتابت و طباعت کے لئے دہلی کا سفر ہوا
اور حسب وصیت میر واعظ مرحوم کتاب پر پیش لفظ لکھوانے کے لئے ۲۷ اپریل ۱۹۹۱ء کو
مرشدنا الجلیل حضرت علی میاں دامت برکاتہم کی خدمت میں لکھنؤ اور رائے بریلی حاضر ہوا تو
اچانک رائے بریلی میں صاحبزادۂ محترم مولانا محمد ولی رحمانی صاحب مدظلہٗ سے ملاقات ہوگئی۔
موصوف بھی حضرت اقدس سے ملاقات کے لئے مونگیر سے تشریف لائے تھے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی طرح صاحبزادہٗ کی خصوصی توجہ اس خاکسار پر رہتی ہے۔ رائے بریلی
میں مفصل ملاقات کے لئے خاصا وقت مل گیا، امیر شریعتؒ کے آخری دنوں کے احوال، معمولات
کی پابندی اور وصال کی تفصیلات صاحبزادۂ محترم سے سننے کا موقع ملا، ان باتوں کے علاوہ ایک

اہم اور خاص بات جو صاحبزادۂ محترم نے بتلائی وہ یہ کہ ایک دفعہ آپ نے حضرت امیر شریعتؒ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ سے آپ کیا دعائیں مانگتے ہیں؟

امیر شریعتؒ نے فرمایا دو چیزیں ایک تو دنیا سے بے نیازی اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی محتاجی اور دوسری چیز اپنی مغفرت۔

یقیناً امیر شریعتؒ کی دونوں دعائیں مستجاب اور مقبول تھیں۔ بظاہر وہ پوری زندگی دیکھے برابر کسی کے محتاج نہیں رہے۔ زندگی پاکیزہ پائی۔ پاکیزہ گذاری اور وفات بھی پاکیزہ ہوئی۔ اور رہی مغفرت کی بات، سو اگر وہ مغفور نہیں ہوں گے تو پھر اور کونسی مخلوق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ امیر شریعتؒ کے درجات بلند کرے اور ہم سب کو صبر و ضبط کی توفیق دے۔

لذیز بود حکایت دراز تر گفتیم یادوں اور خیالات کا ایک طویل اور لامتناہی سلسلہ ہے اور بات بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن ایک مختصر مقالہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تاہم آخر میں مرشدنا الجلیل حضرت علی میاں ندوی مدظلہ کا یہ ذاتی تاثر جو آپ نے صاحبزادۂ محترم اور میرے سامنے فرمایا نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔

"حضرت علی میاں مدظلہ نے فرمایا کہ اپنے برادر اکبر ڈاکٹر صاحب کے سانحۂ ارتحال کے وقت جس عظیم غم و صدمہ سے میں ذاتی طور دوچار ہوا تھا تقریباً وہی کیفیت امیر شریعتؒ کے انتقال پر مجھ پر طاری رہی۔"

عشق اور اردو شاعری میں عشقیہ رجحانات

جناب سعید احمد خاں صاحب ایم، اے، ٹونک

اردو شاعری کا خمیر عشقیہ ہے۔ اس کی بنیاد عاشقانہ مضامین پر ہے۔ اگر عاشقانہ مضامین و خیالات کو اس سے خارج کر دیا جائے تو شاعری بے کیف و بے جان ہو جائے گی۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں اردو کی عشقیہ شاعری پر سخت تنقید کی ہے۔ حالی کا لہجہ تلخ تھا مگر اس میں خلوص تھا۔ ان کی تنقید اصلاحی تھی۔ اکثر لوگ عشق کو معاملہ بندی تک محدود کر کے اردو شاعری پر تنقید کرنے لگے۔ مغربی تعلیم اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اخلاقی، افادی اور سماجی حیثیت سے تنقید کی جانے لگی۔ کیا عشق لائق اجتناب ہے؟ امیر خسرو سے ناصر کاظمی تک عشقیہ شاعری کا سلسلہ ہے۔ زمانی و مکانی بُعد ہوتے ہوئے بھی ان سب نے شیوہ عشق کیوں اختیار کیا؟ کیا عشق صرف جنسی معاملات تک محدود ہے؟ بقول شیخ سعدی ؒ درایام جوانی چنانکہ افتد و دانی، اس طرح عشق "ذاتی نوعیت" میں محدود اور "ایام جوانی" میں محصور ہو جاتا ہے اور ہر شخص عمر کے ایک حصہ میں اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میر کے قول کے مطابق سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق یعنی ماسوئ عشق، عالم کچھ بھی نہیں۔ نظام عالم عشق سے ہے۔ آخر عشق کیا ہے؟ اس کے متعلق متضاد و مختلف آراء و اقوال کیوں ہیں؟ ان سب باتوں کو جاننے کے لئے عشق کی ماہیت اور لوازمات پر غور کرنا ضروری ہے۔

عشق عربی لفظ ہے۔ المنجد میں اس کے معنی لکھے ہیں، محبت کی زیادتی، پارسائی اور غیر پارسائی دونوں طرح ہوتی ہے۔

صراح میں تحریر ہے۔ عشق بالکسر از حد در گذشتن دوستی، منتخب اللباب کے مطابق، بسیار

دوست داشتن چیزی۔ صاحب غیاث اللغات نے منتخب کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ" نزد بعضے اطبا مرضیست از قسم جنون کہ از دیدن صورت حسین پیدا می شود۔" عبدالرزاق شارح ظہوری نے شرح اسباب و فتوحات الحکم سے نقل کیا ہے کہ عشق ماخوذ از عشقہ واں نباتے است کہ آنرا بعلاب گویند چوں بر درختے پیچد آنرا خشک کند ہمیں حالت عشق ست بر ہر دیے طاری شود صاحبش را خشک و زرد کند۔

فرہنگ آصفیہ میں درج ہے۔ عشق (ع) اسم مذکر (۱) کسی چیز کو نہایت دوست رکھنا از حد محبت نیہ، پیار، پریم، پریت، حُب ؎

لگا تھا زبس عشق کو اس تیر لگی کھینچنے آہ بدر منیر (میر حسن)

(۲) شوق، آرزو، چاہ، خواہش، رغبت (۳) عادت، لت، دھت

(۴) ایک قسم کا جنوں و سودا جو خوبصورت آدمی کو دیکھنے سے ہو جاتا ہے ؎

کیا کہوں تم سے میں کیا ہے عشق جان کا روگ ہے بلا ہے عشق (امیر)

مندرجہ بالا معنی و تعریفات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عشق محبت میں حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے۔ یہ میلان طبع ہے۔ عشق محبوب کے ساتھ متحد ہونے کا سخت شوق ہے۔ اگر عقل و خرد ہوش و ہواس سے بیگانہ کردے تو جنوں نام ہو جائے گا۔

ہمارے شعراء اس میلان طبع کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

عشق سے تو نہیں ہوں واقف دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے (سودا)

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے (میر)

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے (جگر)

عشق کا لفظ قرآن، حدیث اور شعرائے جاہلیت کے کلام میں نہیں آیا ہے۔ متاخرین شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اپنے تحقیقی مقالہ "اردو شاعری میں عشقیہ تصور اور روایت خسرو دہلوی سے سراج اورنگ آبادی تک" میں تحریر کیا ہے کہ شیخ ابن عربی نے کہا ہے کہ قرآن میں عشق کو محبت کی شدت قرار دیا ہے ڈاکٹر موصوف نے ابن عربی کے قول پر دو لفظ قرآن میں، اضافہ کئے ہیں، اصل مقولہ ہے۔ العشق تجاوز عن الحد فی المحبتہ۔

علامہ جلال الدین دوانی نے بھی سہواً ایک مقولہ کو اخلاق جلالی میں حدیث تحریر کیا ہے۔
"من عشق وعف وکتم مات مات شہید"؟:

عشق کی وہ خصوصیات جو فارسی شاعری میں نظر آتی ہیں ان کا تو عربی شعراء کے کلام میں وجود ہی نہیں ہے۔ اردو شاعری کو خیالات و مضامین فارسی شاعری سے ورثہ میں ملے ہیں اس لئے اجمالاً فارسی شاعری کے تناظر میں عشق کی ماہیت کیفیت اور اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

کیا جمال عشق کا مبداء ہے؟ کیونکہ عشق کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے یہ ایک قسم کا جنوں ہے جو خوبصورت آدمی کو دیکھنے سے ہوجاتا ہے۔ حسن سے عشق ہے یا عشق سے حسن۔

گلستاں باب پنجم 'درعشق و جوانی' میں شیخ سعدی نے مجنوں کی زبانی کہا ہے کہ از دریچہ چشم مجنوں بایستی در جمال لیلیٰ نظر کردن۔

اس طرح شیخ سعدی ان حکماء کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کہتے کہ حسن کا تعلق خارج سے نہیں بلکہ خارج پر نظر ڈالنے والوں کی داخلی کیفیت ہے۔ کوئی شئے بذات خود حسین نہیں بلکہ انسان کی توجہ اور نظر کشائی پر منحصر ہے۔ اس کے برعکس نوافلاطونی فلسفہ جمال سے تعلق رکھنے والے حسن کو اشیاء کی ذاتی صفت قرار دیتے ہیں۔ حسن اپنے اثبات کیلئے حسن نظر کا محتاج نہیں حُسن کا وجود مطلق ہے۔ غالب نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس نظریہ نے وحدت الوجود کا نام پایا ہے۔

حقیقت ان دونوں نظریات کے بین بین ہے۔ حسن نہ یکسر خارجی ہے اور تمام تر داخلی۔ دونوں کے ربط باہمی سے حسن کا تعلق ہے۔ حسن متناسب الاعضاء ہونے کا ہی نام نہیں اس میں حسن عمل بھی داخل ہے۔ خارجی اشیاء کے مشاہدہ سے انسانی جذبات میں تموج پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس حرکت و تموج سے حظ و لطف حاصل ہو تو حسن کہلاتا ہے۔ کوئی بھی ادا جذبات کو برانگیختہ کرکے آتش عشق کو روشن کر سکتی ہے۔ ادا ہی وہ عمل ہے جس سے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ عاشق کی نظر عرفانِ حسن و جمال اور جذبات کا تہیج پیدا ہوتا ہے جو معشوق کا احترام تکریم و توقیر سکھاتا ہے۔ اس سے شادمانی اور علم و یقین پیدا ہوتا ہے۔

فارسی شاعری میں عشق کا اہم مقام ہے۔ عباسی دور حکومت میں یونانی کتب کے کثرت تراجم ہوئے۔ یونانی مفکرین ارسطو، افلاطون وغیرہ کے خیالات سے مسلم اذہان متاثر ہوئے اور فلسفہ اشراق وجود میں آیا۔ اشراقی فلسفیوں نے عشق کو نظام عالم کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ابن عربی نے اسے نظریہ کے طور پر وحدت الوجود کی شکل میں پیش کیا۔ شعراء اور اصفیاء کو عشق مجازی اور عشق حقیقی کے مضامین مل گئے۔ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ بنا دیا گیا۔ دنیا کی بنیاد عشق و محبت پر ہے۔ یہاں علت و معلول کا سلسلہ ہے۔ ہر معلول اپنی علت سے عشق رکھتا ہے اور علت کو اس پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے۔ اس لئے ہر شئے علت و معلول ہوئی۔ اس لئے ہی قہر و مہر کی صفات ہر شے میں پائی جاتی ہیں۔ پروانہ و شمع، ماہ و کتاں، گل و بلبل سب باہم عاشق و معشوق ہیں۔ علت معشوق اور معلول عاشق۔ اسی جذب و انجذاب سے عالم قائم ہے۔ ستاروں میں کشش اور مہر و ماہ کی گردش اسی نظام عشق سے قائم ہے۔ زمین پر سب سے زیادہ اثر آسمان کا ہوتا ہے، زمین کی پیداوار موسم کا تغیر، رنگوں کا اختلاف، مزاجوں کا فرق وغیرہ اسی کا نتیجہ ہیں اس لئے زمین معلول اور آسمان علت ہے، شعراء آسمان میں قہر بتلاتے ہیں۔ اور اس کے ظلم کا بیان کرتے ہیں۔ علت میں غلبہ اور معلول میں عجز و مسکنت ہوتی ہے اس لئے عاشق میں مسکنت و عجز اور معشوق میں کبر و غرور رہتا ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ چونکہ خدا پر ختم ہو جاتا ہے اس لئے خدا اپنی ذات پر خود عاشق ہوکر معشوق ہو گیا ہے۔ حسن و جمال، محاسن و فضائل کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ اسی کے فیض کے پرتو سے کائنات روشن اور اشیاء حسین ہیں۔ خدا کا حسن ذاتی ہے جہاں کی اشیاء کا حسن مستعار ہے اس لئے عارضی ہے۔

علامہ جلال الدین دوانی نے اخلاق جلالی میں عشق کی دو قسمیں لکھی ہیں۔

(۱) عشق بہیمی۔ جس کے لئے لکھا ہے کہ عشق از جملہ امراض شہوت شمردہ اند۔ ہماری مثنویوں اور غزلوں میں بکثرت اشعار اسی عشق بہیمی کے ہیں۔ اس کو جنسی عشق بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۲) عشق نفسانی جس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ مبدأ آں تناسب روحانیت دعداد رذایل نیست بلکہ از فنون فضائل است۔ شاعری کے اعلیٰ و ارفع مضامین اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔

اکبر کے دورِ حکومت سے ہندو مذہب کے احیاء کی ابتداء ہوئی اور مغلیہ سلطنت کے زوال میں اردو شاعری کا فروغ ہوا۔ ہندوی فلسفہ و فکر کے اثرات مسلمانوں پر بڑھے اس کے ساتھ ساتھ اسالیب اور بیان پر بھی اس کا اثر پڑا۔ صنف نازک کی طرف سے اظہار محبت اسی کا نتیجہ ہے۔ فارسی شاعری میں صنفِ حجاب میں تھی اس کا تعلق تذکیر و تانیث سے نہ تھا بلکہ جذبے سے تھا جو عشق کا اظہار چاہتا تھا۔

صاحب شعرالہند مولوی عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ معتصم باللہ کے زمانہ میں ترکوں کو بکثرت فوج میں داخل کیا گیا۔ ایران میں ترک بچے جو قدرتی طور پر شہسوار، تیرانداز اور سفاک اور خوں ریز تھے۔ ابتدا ہی سے معشوق بن گئے تھے اس لئے شہسواری، تیراندازی اور سفاکی کے مضامین معشوقوں کی صفت میں داخل ہو گئے۔ اولاً تو یہ اوصاف سرے سے ہی شان محبوبیت کے منافی ہیں اردو شاعری میں آکر واقعیت سے بھی دور ہو گئے۔ تصوف کی گرم بازاری نے امرد پرستی کو عام کر دیا اس قسم کے مضامین سے شعراء کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ صوفیانہ تعشق کا اظہار مذہب سے متعلق نہیں جذبۂ عشق سے ہے اور جذبۂ عشق کا منبع حضرت دل ہیں جس کی کارفرمائی کا دائرہ وسیع ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

شاعری کیا ہے؟ دل جذبات کا اظہار ہے — دل ہی نہیں تو شاعری بیکار ہے

جن نظریات و رجحانات کا مجملاً ذکر کیا گیا ہے ان کا اثر اردو شاعری پر کیا پڑا اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

قلی قطب شاہ سے لے کر غالب تک فارسی شاعری کے روایتی رجحانات و نظریات کا وہی سلسلہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی اشراقی اور بہیمانہ (صوفیانہ اور جنسی) دونوں ہی کیفیات دل سے متعلق تھیں۔ صوفیانہ شاعری یا عشق حقیقی کے نمائندہ شاعر خواجہ میر دردؔ ہیں۔ اگرچہ دیگر شعراء کا کلام بھی اس قسم کے مضامین سے خالی نہیں ہے اردو شاعری کے دامن میں اعلیٰ عشقیہ مضامین کے موتی اپنی چمک دمک سے عجب لطف دیتے ہیں ؎

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے (میرؔ) — دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے

ہے حسن ترا ہمیشہ یکساں (دلی) — جنت سے بہار کیونکر جاوے

صبر بن اور کچھ نہ لو ہمراہ (قائم) کوچۂ عشق تنگ ہے یارو
جاتی ہے نسیم اوس گلی کو (قائم) اُٹھ سکئے تو قافلہ ہے بہتر
کچھ گریباں نہیں کہ ہر ساعت (مصحفی) چاک کر کے سلایئے دل کو
مومن کے یہاں 'غزل' سب سے محدود دائرہ میں ہے۔ یہاں عشق ہجر و وصال کی کیفیات پر مشتمل ہے۔

اب ذرا پیمانہ پہلو بھی ملاحظہ ہو پہلے پیمانہ غیر فطری عشقیہ شاعری کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تذکرہ میر حسن میں لکھا ہے کہ میاں صلاح الدین پاکباز قوال بچہ مکھن پر عاشق تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بہیں ندیاں مرے آنسو سے جو میں ہجر میں رویا
کہے ہے ساری بستی ہائے مکھن نے ہیں کھویا

صوفیہ جن نوخیزوں کو اپنا منظور نظر بناتے تھے ان کو منظہر کہتے تھے۔ یہ اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ جس سے وہ محبت کرتے ہیں وہ مظہر ذات خداوندی ہیں۔ ٹیک چند بہار نے بعینہ اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے ؎

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس
یہ عجب مظہر ہے جن کے مبتلا ہیں مرد و زن

خواجہ درد فرماتے ہیں ؎

گر دیکھئے تو مظہر آثار بقا ہوں
اور سمجھئے جو عکس مجھے محو فنا ہوں

میر کو بچپن ہی سے عشق کرنے کی نصیحت کی گئی تھی۔ ناکام عشق نے رسوا بھی کیا اور اسی کے سوز و گداز نے ناخدائے سخن بنا دیا۔ ان کی بیماری کا حال بھی سنئے ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

طباطبائی نے لکھا ہے کہ میر نے تو اس باب میں ایسی افراط کی ہے کہ جا بجا ان کے دیوان میں ولی کے لونڈے بھرے پڑے ہیں۔

ولی در مدح امرت لعل فرماتے ہیں ؎

لعل تیرے بھرے ہیں امرت سوں
نام تیرا بجا ہے امرت لعل

یہ چند اشعار بطور نمونہ غیر فطری یعنی یا جنسی تلذذ کی شاعری کے دئے گئے ہیں جس کے ڈیرے ڈانڈے تصوف نے عشق الٰہی سے ملا دئے ہیں۔ اب ذرا فطری پیمانہ عشق کا بھی

لطف لیجئے۔ خواجہ آتش فرماتے ہیں ؎

عورتوں کر مرے پاس آئیو نہ عزرائیل   مرد ہوں عشق رکھتا ہوں زنِ خوشرو سے

ان تینوں رجحانات عشق کے اعلیٰ مضامین (بقول دوانی نفسی شاعری) بہیمانہ فطری، بہیمانہ غیر فطری غالب تک ملتے ہیں، تینوں رجحانات کا تعلق دل سے ہے یا ماورائی کیفیت سے۔ حقیقتاً یہ ماورائی کیفیت بھی دل پر طاری ہوتی ہے گویا غالب تک شاعری کا رجحان دل کے تحت تھا۔ غالب کو شکست و ریخت کا زمانہ ملا۔ نئی تہذیب اپنے پیر جما رہی تھی۔ کلکتہ میں وہ اس کا جلوہ دیکھ آئے تھے۔ انہیں احساس ہوگیا تھا کہ گل و بلبل کے مضامین سے شاعری دلآویز مرقع نہیں بن سکتی نہ ہی اس روایتی داستانِ دل سے اپنی اہمیت منوا سکتے ہیں۔ غالب کی عظمت کا راز یہی ہے کہ انہوں نے زمانہ کی رفتار کو پہچانا۔ پرانی تہذیب دم توڑ چکی تھی جس سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ لیکن جو حقیقت کو نہ پہچانے وہ نظر کیا ہے؟ غالب کے کلام میں ایک فکر ہے جس کا اظہار پہلے نہیں ہوا تھا ایک ذہن ہے جو ان سے پہلے ناپید تھا اگرچہ ان کے یہاں روایتی، رسمی مضامین بھی ہیں جن کو اپنے طرزِ بیان سے جلا بخشی ہے مگر غالب کی عظمت عشقیہ شاعری میں فکری رجحان کی وجہ سے ہے۔ دل و دماغ کی حسین امتزاج غالب کے اشعار میں ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

سرسید کی تحریک سے عقلی رجحانات بڑھے گویا قدیم نظریۂ عشق کا ردِعمل تھا۔ یہ "عشق" تقلیدی، جامدانہ فکر سے خالی تھا۔ سرسید نے اصلاح کی کوشش میں تاریخی، مذہبی اور تہذیبی ورثہ کو نظرانداز کر دیا۔ یورپ کی تقلید میں عقل کی پیروی کرنے لگے۔ شبلی نے اسی لئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ انہیں اپنی تہذیبی ورثہ سے عشق تھا۔ اکبر کی مخالفت کا سبب بھی یہی تھا۔ اکبر مشرق کے دلدادہ تھے۔ ان کو مشرقی اقدار و تہذیب سے پیار تھا۔ ان کا تفکر مشرقیت کے عشق کے طابع تھا انہوں نے ان کا اظہارِ خیال کا موضوع حادثات، واقعات رہے۔ ان کے یہاں حکیمانہ نظر اور فلسفیانہ

ربط نہ تھا۔

اقبال کی شاعری میں غالب کا ذہن اور اکبر کا تفکر، شبلی کا مذہبی احساس اور حالی کا سوز ملتا ہے اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہیں ہوتے۔

اقبال کے نظام فکر وفن میں عشق کو مرکزی اہمیت ہے۔ عشق ایک نعمت الٰہی ہے۔ عشق میں عقل کے تذبذب اور چوں چرا کی گنجائش نہیں اقبال کا تصور عشق دوسرے شعراء کے متصوفانہ یا رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں عشق ایک زبردست محرک عمل ہے تقدیر پرست کر رہنے یا بے عملی کا نام نہیں۔ یہ عشق وصل پر ختم نہیں ہوتا نہ عشق قطرہ کی طرح دریا میں فنا ہونے کا نام ہے۔ دریا میں ملکر عشق کی بدولت قطرہ آبدار موتی بنتا ہے اس میں قلزم کی سی وسعت پیدا ہو جاتی ہے، اقبال کا عشق خود آگہی کا سرچشمہ ہے۔ یہ عشق عقل سے بدرجہا برتر ہے۔ اس میں جرأت اور قوت عمل ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال کے عشق کے تصور کو سمجھنے کے لئے ان کی نظم "محبت" اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کے کلام میں عشق وعقل کا جگہ تقابل ہے۔ دراصل یہ سرسید کی عقلی تحریک کا ردعمل ہے ؎

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات　　علم مقام صفات عشق تماشائے ذات

عقل ودل ونگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع ودیں بتکدۂ تصورات

غالب نے عشق کو نیا ذہن وفکر دیا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے اثر سے عشق کی جگہ عقل نے لے لی تھی۔ اقبال نے پھر عقل سے عشق کی طرف راغب کیا۔ غالب اور اقبال کی عظمت کا راز یہی ہے کہ دونوں بندھے ٹکے راستے پر نہیں چلے۔ انہوں نے اپنی راہ الگ نکالی۔ غالب کے یہاں پیش رفت ہے تو اقبال کے یہاں رجعت مگر توانائی اور قوت کے ساتھ۔ ان کا عشق حرکی ہے جبکہ میر کا عشق قنوطی تھا۔ اسی رنگ نے بعد میں فانی کے یہاں یاسیت کا روپ دھار لیا۔ حسرت کا عشق جسمانی ہے، اصغر کا عشق ماورائی کیفیت کا حامل ہے جس کا سلسلہ خواجہ میر درد سے ملتا ہے۔ اختر کی رومانویت میں قدیم داستانوی ماحول ہے۔ یہ عشق سراسر جسمانی ہے۔ یہاں تعقل پر جذبہ حاوی

ہے۔ جگر کے یہاں عشق میں سرشاری اور مستانہ ادا ہے مگر فکر اور گیرائی نہیں۔

اردو کی عشقیہ شاعری میں غالب وہ سنگ میل ہیں جہاں سے نئی عشق کو فکر کی نئی راہ ملتی ہے۔ یہ فکر کی راہ تعقل کے دروازے کھول دیتی ہے۔ تعقل جذبہ، حرکت و عمل سے محروم کرنے لگتا ہے تو اقبال عقل کو عشق کی راہ پر گامزن کردیتے ہیں۔ اقبال اور غالب کے عشقیہ رجحان صحت مندی کی علامت اور بصیرت کے حامل تھے۔ باقی غالب سے پہلے اور اقبال کے بعد کے شعراء کا کوئی نیا عشقیہ رجحان نہیں معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ پرانے رجحانات ہی ان کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ معمولی تغیر و تبدل جادہ راہ ہیں شاہراہ نہیں۔ غالب و اقبال سے بڑا شاعر اب تک اردو زبان پیدا نہیں کرسکی ہے۔ دیکھئے اردو کی عشقیہ شاعری کو نیا رجحان دینے والا کب پیدا ہو؟ انتظار ہے ظہور مہدی کا۔

(ختم شد)

محمد صہیب صدیقی

قسط (۱)

عربی ادب کا نامور شہسوار

ابوالعلاء المعرّی

جب حکومت عباسیہ میں ایران، شام، مصر اور مغرب کے گورنروں کی خود مختاری کے سبب متعدد پایۂ تخت وجود میں آگئے تو اس کا اثر عربی ادب پر بھی پڑا مجموعی طور پر اس کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں، خاص طور سے شام شعر و ادب کے فروغ اور نشر و اشاعت کے لحاظ سے زیادہ متاثر ہوا، یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری میں آل بویہ اور آل حمدان نے اس بیش قیمت سرمایۂ فن و ادب کی سرپرستی قبول کرلی چنانچہ شعر و ادب کی تقدیر چمک گئی۔

ابوالعلاء المعری ان مشہور زمانہ سپوتوں میں سے ہے جنھوں نے زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت کرکے اپنے آپ کو شاہ راہِ عام پر لا کھڑا کیا، تحقیق و مطالعہ کا بے پناہ شوق ہی تھا جس نے اس کو دور دراز مقامات پر پہونچایا، اور لائق اساتذہ کے پاس زانوئے تلمذ طے کرنے پر مجبور کیا اس کا نتیجہ تھا کہ بیس سال کی عمر میں ہی تلمذ کے احتیاج سے بے نیاز ہوگیا اور اس نے اپنے زور قلم سے شعر و نثر کی تالیفات کی شکل میں ایسی فقید المثال سوغات پیش کیں ہیں جو بلاشبہ عربی زبان کے لئے سرمایۂ افتخار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ حمدانی حکومت کے فرماں رواؤں نے جودت طبع اور سخاوت کی بنا پر شاعری کو پروان چڑھانے میں مستحسن رول ادا کیا تھا لیکن یہ حکومت بھی جنوب و شمال سے فاطمیوں اور بازنطینیوں کے حملہ کیوجہ سے اپنی شان و شوکت کھو چکی تھی۔ سوریہ جو ابوالعلاء کا وطن تھا یہ بھی انتشار و بدامنی کا مرکز بنا ہوا تھا، ان نامساعد حالات کے باوجود علم و ادب میں پیش رفت کے لحاظ سے یہ دور قابل ذکر اور دوسرے علمی ادوار سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اسی سیاسی کشمکش اور دینی و مذہبی اضطراب کے دور میں شام کے معرۃ النعمان نامی مقام پر ۳۶۳ھ میں عبداللہ

زبان وادب کا وہ فرزند جنم لیتا ہے جس نے ادب کے متعدد گوشوں میں اپنی صلاحیت واستعداد اور فنی لیاقت کی بنا پر تہلکہ مچا دیا، پورا نام احمد بن عبداللہ بن سلیمان تنوخی ہے، باپ جید عالم اور صنو کے قاضی تھے۔ زندگی کی چوتھی بہار بھی گذر رہی تھی کہ چیچک کے حملہ کی وجہ سے بائیں آنکھ کی روشنی جاتی رہی اور کچھ ہی دنوں کے بعد دائیں آنکھ میں بھی جالا پڑ گیا۔ سب سے پہلے علم حاصل کرنے کی خاطر باپ کی شاگردی حاصل کی، اس کے بعد علاقے کے متعدد علماء کی طرف رجوع کیا چند ہی برسوں میں ان کے علوم وفنون پر اس قدر حاوی ہوگیا کہ اس نے اپنے سے زیادہ کسی کو بھی تبحر علمی کا مالک نہیں پایا اور ابھی بیس ہی برس کا تھا کہ گھر واپس آکر عربی زبان وادب کے تشنگان علم کی پیاس بجھانے لگا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ چودہ سال کی عمر میں ہی وہ باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا تھا کہ ایک تو اندھے پن کی مصیبت دوسرے یتیمی کی زندگی نے ان دونوں ابوالعلاء کو پابۂ زنجیر کر دیا تھا۔

وہ انسانوں میں پیدا تو ہوگیا تھا مگر طبعاً آدم بیزار تھا، کسی عبارت کو خواہ وہ سمجھتا ہو یا نہ یاد کرلیتا تھا، گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا عاشق ہوگیا تھا، آنکھوں سے معذوری کے باوجود معقول وعمدہ تشبیہیں دیتا تھا، وہ نرم دل، وفاکیش، سخی، خواہشات نفس پر قابو پانے والا اور سریع الحفظ تھا۔

ابوالعلاء عام طور پر تمام ادیان اور خصوصاً اسلام کے سلسلے میں ایسے بے باک خیالات کا اظہار کرتا تھا جو اس کی دینی شخصیت کو مجروح کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہیں، یہ صحیح ہے کہ وہ وجود باری سے متعلق کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رکھتا ہے مگر ملائکہ، جن وشیاطین کی حقیقت سے انکار کے علاوہ ان کے وجود کو تسلیم کرنے والوں کی تضحیک اور ان پر لعن طعن کرتا ہے، بسا اوقات ان معاملات میں جن کے علم تک پہونچنے میں وہ عاجز وقاصر رہتا ہے خطا کر جاتا ہے۔ جیسے عمالین والتزام کا قائل نہیں تھا۔ اس کی شاعری میں اگرچہ ہم اس کو الحاد وزندقہ کی لعنت میں گرفتار نہیں پاتے مگر وہ دین کے سلسلے میں شک وشبہ کا شکار نظر آتا ہے، بلکہ ادیان سے نفرت، رسولوں کا انکار، ائمہ وفقہا پر لعن وطعن کا اپنا شنیع مظاہرہ کرتا ہے گویا دین اس کے سامنے بے حقیقت نظر آتا ہے۔

اگرچہ معری ایک بے مثال شاعر، نمونہ کا ناقد اور شہرت یافتہ فلسفی وادیب ہی کی حیثیت

سے دنیائے عربی میں جانا جاتا ہے لیکن اس کی کچھ باتیں اتنی گھٹیا اور مکتر ہیں کہ غور کرنے کے بعد ایک شخص کا ذہن ابوالعلار کی بلند ادبی شخصیت سے متعلق فیصلہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور بسا اوقات پوری ادبی شخصیت مجروح ہوجاتی ہے مثلاً اختلافِ ادیان اور علم بر داروں کے نفاق کو دین کے بے حقیقت ہونے کا سبب قرار دینا حالانکہ اگر کسی فکر و نظر کے ماننے والوں کے اندر کوئی کمی یا کوتاہی ہے تو انہی کی کوتاہ بینی قابل گرفت ہے نا کہ وہ اصول و فلسفہ۔ اس صورت میں علمبر دارانِ دین کی خامیوں کو دین سے منسوب کر دینا ایک طرف تو غیر جانب دارانہ اور غیر دیانت دارانہ قدم ہے اور دوسری طرف عقل و تدبر پر شدید ضرب ہے۔

ابوالعلار کی عبقری صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہی کافی ہے کہ نوعمری ہی میں مسند تدریس پر فائز ہوگیا تھا۔ علمار ادب اس کے حلقۂ بگوش ہوئے اس نے پوری جدوجہد اور ذوق وشوق کے ساتھ طلبہ کے ذہنوں میں عربی ادب کا بیج بویا، دونوں آنکھوں سے معذوری اور باپ کے سایۂ شفقت سے محرومی یہ دونوں واقعات اس کے دل و دماغ پر بجلی بن کر گرے تھے انہیں قلق انگیز حادثات کی بنار پر اس کے افکار و اسفار نے انتہائی گہرا اثر قبول کیا تھا مگر دوسری طرف اس کا حافظہ حیرت انگیز ہونے کی حد تک قابلِ رشک تھا۔ قوتِ حافظہ ہی اس کے لئے سیم و زر ثابت ہوئی جس نے اس کی تصانیف میں وسعت و تنوع پیدا کرنے میں بڑا مستحسن رول ادا کیا۔

حصول علم کی خاطر اس نے کئی جگہوں پر کوشش کی طرابلس اور شام کے بعد بالآخر بغداد جا پہونچا۔ اس کے بعد علم و فن کے میدان میں زبردست ماہر بن کر نکلا۔ فن و ادب کے میدان میں اس کی چابکدستی کا اندازہ تو اس کے منظوم و منثور کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔ مزید براں اس کے حلقۂ تلامذہ کی وسعت اور مشرقی و مغربی علمار کے تاثرات قلبی اس کی منفرد شخصیت کو سمجھنے میں اور بھی مددگار ہوتے ہیں۔ جناب گولڈن زھیر نے عہد عباسی کی سرگرمیوں کے ضمن میں اہم شعرائے عرب کا تذکرہ کرتے ہوئے المعری کے بارے میں کہا ہے:

"عہد عباسی کے عظیم شعرار کا سلسلہ ابوالعلا المعری پر ختم ہوگیا یہ عربی ادب کی نمایاں شخصیتوں میں سے تھا اس کی شخصیت کو دانشمندی سے پُر قرار دیتا ہے۔

(باقی آئندہ)

تبصرے

ہندو دھرم : گورو نانک کی نظر میں (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

مرتبہ و ناشر: جناب ایس۔ ایم شریف قریشی (ایم۔ اے)

ضخامت : ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۱۸ روپے صرف

ملنے کا پتہ (۱): المحمد پبلیکیشنز۔ ۲۷۳۹۔ نیاریان اسٹریٹ جی بی روڈ دہلی ۶

(۲) مکتبہ ثناء اللہ امرتسری اکیڈمی ۳۳۴۳ نئی سڑک دہلی۔

(۳) مکتبہ ترجمان ۴۱۱۶۔ اہلِ حدیث منزل اردو بازار دہلی۔

(۴) اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۸۵۴۔ گلی نل والی جامع مسجد دہلی۔

(۵) دار الکتاب ۱۴۸۸۔ پٹودی ہاؤس دریا گنج۔ نئی دہلی۔

(۶) الدار العلمیہ۔ ۳۸۰۵۔ موری گیٹ۔ دہلی ۶

(۷) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

زیرِ تبصرہ کتاب گورمکھی زبان کے ماہر و عالم عباد اللہ گیانی کی تصنیف ہے جسے جدید تقاضوں کی ضرورتوں کے ساتھ ملت کے ایک دردمند لائق و ہونہار قابل ترین نوجوان جناب ایس۔ ایم شریف قریشی ایم۔ اے نے بڑے خوب صورت انداز میں ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

ایسے موضوعات پر کتابیں شائع کرنا مالی منفعت کی خواہش قطعاً نہیں ہوتی ہے بلکہ سراسر خدمتِ دین سلجھے ہوئے انداز میں کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کوشش میں جناب ایس۔ ایم شریف قریشی نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ ہند کی طرف سے شکر و تحسین و ستائش کے قابل بھی ہیں۔

کتاب میں مصنف نے اس بات کا ہر طرح لحاظ رکھا ہے کہ اس کے کسی بھی ماخذ سے کسی بھی فرقہ یا مذہب کی دل آزاری یا تحقیر نہ ہونے پائے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

گورونانک جی جو کہ سکھ مذہب کے بانی تھے اور سکھ مذہب کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ ہندو مذہب کا یا تو حصہ ہے یا اس میں سے نکلا ایک مذہب ہے حقیقت جو بھی ہو اس کا تو فیصلہ تاریخ داں ہی کریں گے بوقت ضرورت' لیکن یہاں تو گورونانک جی نے ہندو دھرم کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے اسی کا اندراج ہے یعنی گورونانک جی ہندو دھرم کے ۳۳ کروڑ خداؤں کے مشرکانہ نظریئے کے سراسر خلاف تھے ان کے نزدیک خدا تعالیٰ کی توحید ہی اس عالم کائنات کے قیام کی ضامن ہے اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو سارے جہاں میں کہرام مچ جاتا۔ دنیا کی ہر چیز اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے واحد ہے اور اس میں توحید الٰہی جلوہ گر ہے۔ اگر کوئی دو انسان ایک ہی شکل اور عقل کے ہوتے تو دنیا میں اندھیر گردی ہو جاتی' ایک کے بدلہ میں دوسرا دھر لیا جاتا۔ ایک جگہ ایک سکھ عالم کی یہ بات درج ہے۔

"گورونانک کا مذہب خدا کی وحدانیت کا مذہب ہے سکھ اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔"

مورتی پوجا۔ سناتن دھرمی ہندوؤں کے مندروں اور گھروں میں دن رات مورتی پوجا کی جاتی ہے۔ ان سب کے بارے میں گورونانک جی کے اقوال بڑے سلیقے سے تحریر کیے ہیں۔ تبلیغ وہ ہوتی ہے جو موثر ہو کسی کی دل آزاری سے پاک ہو' عیسائی مشنریاں اسی پہلو کو اپنائے ہوئے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف عمل ہیں۔ اسلامی تبلیغ کے لیے اسی طرز پر کوشش کا ایک نمونہ زیر تبصرہ کتاب "گورونانک کی نظر میں ہندو دھرم" قابل دید ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر مصنف تو میں ہی قابل ستائش' لیکن سب سے زیادہ مبارک باد اور شکریہ و ستائش کے مستحق ہیں جدید تقاضوں کی ضرورتوں کے ساتھ کتاب کو ایڈٹ کرنے والے جناب ایس۔ ایم شریف قریشی۔ اپنی معلومات کے اضافہ کے لیے ہر پڑھے لکھے مسلمان کو چاہیئے اس کتاب کو خرید کر پڑھے اور اپنے پاس محفوظ رکھے۔

بُرہان

شمارہ ۱	جولائی ۱۹۹۲ء مطابق محرم الحرام ۱۴۱۳ھ	جلد ۱۱۰

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا

لیبیا:

خلیجی۔

پرانے حریف لیبیا کے گرد

کر مسئلہ پیدا کیا گیا۔ یہ لاکر بی کیس

کے علاقہ لاکربی میں تباہ ہو گیا تھا۔ اس

طیارہ کی تباہی سبوتاژ کا نتیجہ تھا۔ دو لیبیائی باشندوں [illegible] کاروائی

کی تھی۔ امریکہ نے اقوام متحدہ میں یہ معاملہ اٹھا کر ان دونوں لیبیائی باشندوں کی حوالگی کی

مانگ کی۔ جو لیبیا نے رد کر دی تھی۔ اقوام متحدہ میں لیبیا پر پابندیوں کا ریزولیوشن پیش

کیا گیا۔ یہ پابندیاں ۱۵ اپریل سے نافذ کر دی گئی تھیں۔ لیبیا کو جانے والی ہوائی [illegible]

لیبیا کا گلا گھونٹنے میں امریکہ ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔ اقوام متحدہ کی قرارداد کو کسی ملک [illegible]

دل سے نہیں مانا تھا۔ عراق، شام اور دوسرے کئی ملک اسے نہ ماننے کا اعلان [illegible]

اور بحری راستوں پر ان پابندیوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ راستے کھلے ہیں، لیبیا کے [illegible]

جاری ہے۔ اب چین نے پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے [illegible] اسلحہ کا [illegible]

ٹریپولی (طرابلس) بھیجا ہے۔ یہ اسلحہ ایک چینی جہاز لے کر پہونچا ہے۔ جس کا پتہ [illegible]

والے امریکی مصنوعی سیاروں نے لگا لیا تھا۔ امریکی صدر جارج بش چین کے اس [illegible]

تلملا کر رہ گئے۔ اور کوئی کارروائی نہ کر سکے۔

کرنل قذافی نے لیبیا پر اقوام متحدہ کی ان پابندیوں کو [illegible] دنیا کے لئے ایک

چیلنج قرار دیا ہے۔ انھوں نے پابندیوں سے پہلے یہ پیش کش کی کہ اگر [illegible]

نظرات

لیبیا کی ناکہ بندی ناکام

خلیجی جنگ میں فتح کے بعد دنیا کی واحد بڑی طاقت امریکہ نے چاہا تھا کہ اب اپنے پرانے حریف لیبیا کے کرنل قذافی سے بدلہ چکایا جائے۔ اس لئے ایک پرانے کیس کا سہارا لے کر مسئلہ پیدا کیا گیا۔ یہ لاکر بی کیس کہلاتا ہے۔ پان امریکن ائرلائنز کا ایک طیارہ سکاٹ لینڈ کے علاقہ لاکر بی میں تباہ ہو گیا تھا۔ اس میں ۲۰۰، مسافر تھے۔ امریکہ کا دعویٰ ہے کہ اس طیارہ کی تباہی سبوتاژ کا نتیجہ تھا۔ دو لیبیائی باشندوں نے بم کے ذریعہ یہ تخریبی کارروائی کی تھی۔ امریکہ نے اقوام متحدہ میں یہ معاملہ اٹھا کر ان دونوں لیبیائی باشندوں کی حوالگی کی مانگ کی۔ جو لیبیا نے رد کر دی تھی۔ اقوام متحدہ میں لیبیا پر پابندیوں کا ریزولیوشن پیش کیا گیا۔ یہ پابندیاں ۱۵ اپریل سے نافذ کر دی گئی تھیں۔ لیبیا کو جانے والی ہوائی سروسز بند ہیں لیبیا کا گلا گھونٹنے میں امریکہ ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔ اقوام متحدہ کی قرارداد کو کئی ملکوں نے دل سے نہیں مانا تھا۔ عراق، شام اور دوسرے کئی ملک اسے نہ ماننے کا اعلان کر چکے تھے، بری اور بحری راستوں پر ان پابندیوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ راستے کھلے ہیں۔ لیبیا کے تیل کی بکری جاری ہے۔ اب چین نے پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چھوٹے اسلحہ کا بڑا ذخیرہ ٹریپولی (طرابلس) بھیجا ہے۔ یہ اسلحہ ایک چینی جہاز لے کر پہونچا ہے۔ جس کا پتہ جاسوسی کرنے والے امریکی مصنوعی سیاروں نے لگا لیا تھا۔ امریکی صدر جارج بش چین کے اس اقدام پر تلملا کر رہ گئے۔ اور کوئی کارروائی نہ کر سکے۔

کرنل قذافی نے لیبیا پر اقوام متحدہ کی ان پابندیوں کو پورے عرب دنیا کے لئے ایک چیلنج قرار دیا ہے۔ انہوں نے پابندیوں سے پہلے یہ پیش کش کر کے کہ اگر عرب چوٹی کانفرنس

دو لیبیائی باشندوں کی حوالگی کا فیصلہ کرے گا۔ ایک طرف امریکہ نواز عرب لیڈروں کو اور دوسری طرف خود امریکی حکومت کو ایک پیچیدہ صورت حال میں مبتلا کر دیا۔ اس پیش کش کے اچھے ہونے میں کسے شبہ تھا۔ امریکہ نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس لئے کہ اس کا اصل مقصد انصاف کا حصول نہیں بلکہ کرنل قذافی سے ذاتی انتقام لینا ہے۔ امریکہ یوں تو بڑی طاقت بنتا ہے۔ لیکن اس کے سربراہ میں جو بردباری ہونی چاہیئے۔ وہ جارج بش میں نہیں نظر آتی۔ جارج بش نے، صدر صدام حسین کو بھی اپنا ذاتی مسئلہ بنالیا تھا۔ اب وہ کرنل قذافی کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان دونوں لیڈروں کو عرب عوام میں ہیرو بنانے میں امریکہ کا خاص رول ہے۔ عرب رائے عامہ امریکہ کے خلاف ہوتی جارہی ہے۔ عرب لیگ میں شامل عرب ممالک نے بھی لیبیا کے معاملہ میں کھل کر امریکہ کی حمایت نہیں کی۔

جہاں تک اقوام متحدہ کا تعلق ہے، اسے عالمی رائے عامہ محض امریکہ کا ایک آلۂ کار ادارہ سمجھنے لگی ہے۔ دنیا کے ممالک کی نگاہ میں اقوام متحدہ کا کوئی وقار نہیں رہ گیا۔ دیکھئے دنیا پر غلبہ کی امریکی خواہش کہاں جاکر تھمے یہ سب اسی خواہش کا نتیجہ ہے امریکہ لیبیا کے معاملہ میں قطعی ناکام رہا ہے۔ اور روز بروز اس کی پوزیشن خراب ہوتی جارہی ہے۔

بابری مسجد؟

ایسا شبہ کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ یو۔ پی سرکار بابری مسجد کا ڈھانچہ ڈھانے کے خفیہ پلان پر عمل کر رہی ہے۔ رام مندر کی تعمیر کے سلسلے میں ایک بڑی دیوار کی تعمیر شروع ہو چکی ہے اور مسجد کے آس پاس زمین کی کھدائی جاری ہے۔ کیا اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسجد کی بنیاد کو اس حد تک کمزور کر دیا جائے کہ وہ برسات میں یا اس کے بعد خود گر جائے۔ ہمارے اس شبہ کی تصدیق مسلم مجلس یو۔پی کے سکریٹری مسٹر قمر کاظمی نے اپنی ایک حالیہ پریس کانفرنس میں کی۔ حال ہی میں نئی دلی میں مسلم مجلس یو۔پی کے زیر اہتمام آل انڈیا بابری مسجد کنونشن میں پاس کردہ ایک ریزولیوشن میں یو۔پی کے وزیر اعلیٰ مسٹر کلیان سنگھ کے اس بیان پر کہ رام مندر، بابری مسجد تنازعہ بات چیت کے ذریعہ حل نہ ہونے کی صورت میں

حکومت قانون بناکر بابری مسجد کو اپنی تحویل میں لے لیگی سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔
مسلم مجلس ملک کا دورہ کرکے ایک آل انڈیا بابری مسجد برائے بازیابی مسجد کمیٹی کی تشکیل کرے۔ مسلم مجلس کے ذمہ داران ۱۵ اگست سے کاروان انصاف و نیائے کے نام سے یو۔ پی کا دورہ کرکے ہندو بھائیوں کو آگاہ کریں گے کہ کوئی مسلمان رام مندر کی تعمیر کا مخالف نہیں ہے۔ ہاں بابری مسجد کا تحفظ ان کے لئے ایک مسئلہ ہے۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر بابری مسجد کے سلسلہ میں مرکز نے کوئی عملی اقدام نہ کیا تو مسلم مجلس ۲ اکتوبر سے ڈائرکٹ ایکشن پلان کا پہلا مرحلہ شروع کردے گی۔ ادھر آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے جس کی میٹنگ مسٹر صلاح الدین اویسی کی صدارت میں ہوئی تھی۔ تمام مسلم ممبران پارلیمنٹ واسمبلی سے اپیل کی ہے کہ اگر صدارتی چناؤ میں حصہ لینے والی پارٹیوں نے بابری مسجد کے تحفظ کے متعلق اپنے ایکشن پلان کا اعلان نہیں کیا تو وہ صدارتی چناؤ میں حصہ نہ لیں۔

رام مندر بابری مسجد کے تنازعہ کو بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد روز بروز پیچیدہ بناتی جارہی ہیں۔ ان کے عزائم کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ مسجد گراکر مندر بنانے کے خواہاں ہیں۔ ادھر یو۔ پی کی بھاجپا سرکار، یقینی طور پر ان ہی کی سنے گی۔ اس لئے اب یہ مرکز کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ دیکھے اس سلسلہ میں کیا کارروائی ہوسکتی ہے، مرکز کی گومگو کی پالیسی ہی نے نوبت یہاں تک پہونچائی ہے۔ حال ہی میں مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل نے مظفر نگر کے نزدیک کسانوں کی ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے یو۔ پی کی کلیان سنگھ حکومت کو وارننگ دی ہے کہ اگر وہ بابری مسجد کا تحفظ کرنے کے اپنے وعدہ سے مکر گئی تو مرکزی سرکار جو بھی مناسب سمجھے گی کارروائی کرے گی۔
مرکز کی جانب سے مسٹر ارجن سنگھ اور وزیر داخلہ مسٹر چوہان کئی بار یو۔ پی سرکار کو دھمکیاں دے چکے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں اب تک عملاً کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس سے مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مرکز محض ان کو طفل تسلیاں دیتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں، یو۔ پی کی بھاجپا حکومت من مانی کرتی رہے گی۔ مرکز کو یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا ہندوستان کی حکومت

اپنی تاریخ میں فرقہ پرستوں کے سامنے اس حد تک جھکی تھی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد نے چناؤ رام مندر کے نام پر لڑا تھا۔ اب وہ بابری مسجد کو گرا کر یا اس کا راستہ روک کر رام مندر بنانے کے پلان پر عمل کر رہے ہیں۔ تاکہ ووٹروں کو منہ دکھا سکیں۔ ہم سیکولرازم کا ڈھول پیٹتے رہیں گے۔ اور وہ اپنا کام کرتے رہیں گے۔

الجزائر میں سیاسی بے چینی

حال ہی میں الجزائر کے صدر ابو ضیاف کے قتل نے اس ملک کو جہاں ایک برس سے سیاسی بے یقینی چھائی ہوئی ہے ہلا کر رکھ دیا۔ صدر ابو ضیاف الجزائر کے ایک شہر میں کسی تقریب میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ وہاں اچانک مشین گنوں سے گولیوں کی بوچھار کر کے انہیں ختم کر دیا گیا۔

گذشتہ جنوری میں چناؤ کے بعد سے الجزائر میں سیاسی بے چینی پائی جاتی تھی چناؤ میں مسلم نجات دہندہ محاذ جیت گیا تھا۔ لیکن اقتدار پر قابض گروپ کی نیت خراب ہو گئی۔ اور اس نے حکومت محاذ کے سپرد کرنے کی بجائے ایک فوجی کونسل کے سپرد کر دیا۔ مسٹر ابو ضیاف کو ملک کا سربراہ بنایا گیا۔ اگرچہ اصل طاقت فوج کے ہاتھ میں رہی۔ اس وقت حکمراں کونسل میں طاقتور ترین ممبر جنرل خالد نظر آتے ہیں جو وزیر دفاع ہیں۔ جنرل خالد نے عہد کیا ہے کہ وہ رجعت پسندوں کے خلاف زبردست جنگ کرے گا۔ اور ان کی گوریلا سرگرمیوں کا نشان مٹا دے گا۔

جب بھی کسی ملک میں فوج برسراقتدار آئی ہے ہم نے اس ملک کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھا۔ فوج ہر بات طاقت کی زبان میں کرتی ہے اس لئے عوام فوجی حکومت کو کبھی دل سے پسند نہیں کرتے۔ الجزائر نے فرانس کے خلاف سات برس تک آزادی کی جنگ لڑی تھی اس کے بعد ہی آزادی حاصل ہوئی تھی۔ اب یہی الجزائری آپسی جنگ کے باعث نہ صرف ملک کو کمزور کر رہے ہیں، بلکہ دشمنوں کی نگاہ میں مذاق کا موضوع بھی بن رہے ہیں، ہمیں معلوم نہیں

کہ آنے والے دنوں میں الجزائر میں کیا کچھ ہونے والا ہے۔ ظاہری طور پر حکومت اور سیاسی نظام پر فوجی کونسل کی گرفت مضبوط معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں کی اندرونی صفوں میں موجود بے چینی ایک خونی انقلاب کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ الجزائر، تیونس اور مراکش میں اسلام کی لہر آئی ہوئی ہے۔ انہیں اہل مغرب نے مذہبی انتہا پسندی کا نام دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان ممالک کے عوام اپنی مرضی سے اپنے لئے کوئی نظام پسند کر سکتے ہیں یا نہیں۔ روشن خیال اہل مغرب انہیں ان کا یہ حق دینے کو تیار نہیں، چونکہ جوں ہی اسلامی لہر آئے گی۔ ان کے مکر و فریب کا جال بھی ٹوٹ جائے گا۔ مغرب کی سحر کاری کا دارومدار ہی اس پر ہے کہ اسلام زندہ نہ ہو۔ چونکہ زندہ اسلام سے باطل کی ساری قوتوں کو خطرہ ہے۔

اہل مغرب اور ان کے اندھے مقلد کتنی ہی چالیں چلتے رہیں۔ تاریخ اپنا کام کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فاروقی دہلی یونیورسٹی

محمد مقدسی بیت المقدس کے باشندے تھے اور مراکش سے تاشقند تک سفر کر کے ایک سفرنامہ "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" مرتب کیا زیر نظر کتاب اسی کے اہم حصوں کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں ممالک اسلامیہ کی تجارت، جغرافیہ، معاشرت، رسوم و رواج، عقائد، فرقے، زبانیں، فیشن، وغیرہ غرض اسلامی زندگی و حکومتوں کے ان تمام گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے جو اور کتابوں میں تاریک چھوڑ دیئے گئے تھے۔

تقطیع متوسط ۸/۱۲×۱۸ صفحات ۳۱۰

قیمت: ۲۵/ مجلد: ۴۰/ روپے

مغل شہنشاہوں کی ولادت، سال جلوس اور وفات کے قطعات

قسط اول

از:- جناب عبدالرؤف خاں صاحب اودی کلاں راجستھان

یہ بات باوثوق طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ تاریخی قطعات کی ابتدا کس عہد میں ہوئی اور سب سے پہلا قطعہ کس شاعر نے موزوں کیا۔ تاہم ہندوستان میں یہ فن مغل عہد میں اپنے عروج پر تھا شعراء جو بالعموم مغل دربار یا کسی امیر سے وابستہ ہوتے تھے، بات بات پر قطعات نظم کرتے تھے تاکہ اُس واقعہ کا سالِ سنوح محفوظ رہے۔ اکثر قطعات بروقتِ وقوعِ واقعہ ہی نظم کئے جاتے تھے لیکن ایسی مثالیں بھی بہت سی ملتی ہیں جب قطعات سالِ سنوح سے بہت بعد میں کہے گئے۔ بہرحال اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اصل موضوع پر آتے ہیں اور یہ سلسلہ امیر تیمور گورگاں صاحبقران اول سے شروع کرتے ہیں۔

امیر تیمور[۱] شب سہ شنبہ ۲۵ شعبان ۷۳۶ھ/ ۸ اپریل ۱۳۳۶ء کو ایران کے خطۂ کش کے شہر سبز میں پیدا ہوا اور چہارشنبہ ۱۲ رمضان ۷۷۱ھ، ۹ مارچ ۱۳۷۰ء کو سریر آرائے سلطنت ہوا۔ تقریباً ۳۶ سال حکومت کرکے شب چہارشنبہ ۱۷ شعبان ۸۰۷ھ/ ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء کو اپنے رخش حیات کو اس فسحت سرائے جہاں سے ملک بقا کی طرف مہمیز کیا۔ کسی موزوں طبع شاعر نے صنعت

۱؎ ترکی زبان کے رسم الخط میں ضمہ، فتحہ اور کسرہ کو علی الترتیب واؤ، الف اور "یا" کی صورت میں لکھا کرتے ہیں۔ لہٰذا تیمور کا تلفظ تمِر کرنا چاہیئے۔ ہمارے یہاں تیمور کو واؤ معروف سے پڑھتے ہیں جو درست نہیں۔ تمِر بمعنی فولاد یا آہن۔

ظہوری میں قطعہ کہا جس میں سال پیدائش و جلوس و انتقال کو حسن و خوبی نظم کیا ہے؛

سلطان تمر آنکہ مثل او شاہ نبود

درہفصد و سی شش در آمد بوجود — سال پیدائش ۷۳۶ھ

درہفصد و ہفتاد و یکے کرد جلوس — " جلوس ۷۷۱ "

درہشتصد و ہفت کرد عالم پدرود[۲] (وداع) — " وفات ۸۰۷ "

ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر متضاد صفات اور گوناگوں اوصاف کا حامل انسان تھا جو کبھی عیش کوش و مے نوش دکھائی دیتا ہے اور کبھی بلند پایہ سوانح نگار و عظیم شاعر نیز کبھی جانباز مجاہد اولوالعزم غازی اور کبھی ولی صفت عامل و کامل کی صورت میں تاریخ کے صفحات میں نمایاں ہوتا ہے، کبھی اپنے عزم بالجزم سے معرکۂ کنواہہ کو سر کرتا ہوا جلوہ گر ہوتا ہے تو کبھی دلی سلطنت کے پانچ سلاطین کے خزانۂ عامرہ کو اہل حاجت اور اپنے اعزا و اقربا میں تقسیم کرتا ہوا حاتم کی گور پر لات مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ طاقتور اتنا کہ اپنی بغلوں میں دو جوان آدمیوں کو دبا کر قلعہ کی اونچی فصیل پر دوڑنے کا مشق کرتا تھا تیر اک ایسا کہ عین طغیانی کے عالم میں جمنا کو ایک ہی دفعہ میں ادھر سے اُدھر تیر کر پار کرتا ہے۔ جفاکش، برداشت کرنے کا یہ حوصلہ کی شدید برفباری میں اپنی سپاہ کے ساتھ آسمان کے نیچے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے اور اندر غار میں تنہا جانے کو بے غیرتی پر محمول کرتا ہے۔ یہ بابر (شیر) جس کا ظہیر الدین محمد نام حضرت ناصر الدین خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا، مغلوں کی زبان پر نہ چڑھ سکا اور وہ اسے بابر کہنے لگے یہی بابر جس کی اولاد نے ہندوستان پر سوا تین سو سال حکومت کی۔ چھ محرم ۸۸۸ھ/۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو فرغنہ (اندجان) میں پیدا ہوا قطعۂ سال ولادت منیر بخاری نے کہا جس کے تاریخی شعر سے سال پیدائش اور تاریخ، دونوں برآمد ہوتی ہیں۔

چوں در شش محرم آمد شہ مکرم

تاریخ سال او ہم آمد "شش محرم"[۳] : ۸۸۸ھ

---

[۲] اکبر نامہ ص ۷۷، ۸۷، پبلشر رام نرائن الہ آباد ۱۹۱۳ء

[۳] ملاحظہ ہو سرفراز نامہ ڈاکٹر پروفیسر عبدالرب عرفان صاحب صدر شعبۂ اردو فارسی کامٹی دانشگاہ ناگپور بنام راقم الحروف (راقم الحروف)

یہ مادہ حسن تاریخ کا بہترین نمونہ ہے۔ ابوالفضل اسے مولانا جامی قراکولی سے منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "ہر چند ایں تاریخ از غرائب، اتفاقاً نسبت و فکر را دراں گنجائش نیست اما غریب تر آنکہ ایں تاریخ از شش حرف کہ نزد اہل حساب عدد خیریست فراہم آمدہ ..." اور شعر کی قرائت یہ لکھتا ہے:

چوں در شش محرم زاد آں شہ مکرم   تاریخ مولدش ہم آمد شش محرم[1]

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب مصنف تاریخ ہندوستان نے بھی مذکورہ قرائت ہی ارقام فرمائی ہے اور مولانا جامی سے ہی منسوب کیا ہے۔[2] صاحب تاریخ نوشتہ اس شعر کی املا بتغیر خفیف یہ لکھتا ہے:

اندر شش محرم زاد آں شہ مکرم   تاریخ مولدش ہم (آمد) شش محرم[3]

بابر نے ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء میں لاہور و سیالکوٹ کو فتح کیا تو کسی با کمال نے "فتح بدولت" سے سال فتح برآمد کرتے ہوئے حسب ذیل قطعہ موزوں کیا:

ظہیر الدین محمد شاہ بابر   سکندر دولت و بہرام صولت

بدولت کرد فتح کشور ہند
کہ تاریخ آمدش "فتح بدولت"[4]

۸ رجب ۹۳۲ھ/۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء بروز جمعہ بابر نے جنگ پانی پت میں سلطان ابراہیم لودی پر فتح حاصل کی تو ایک شخص نے جو اس معرکہ میں حاضر تھا تمام واقعہ جنگ کو ہندی زبان کے ان دو اشعار میں پیش کیا (شخصے کہ دراں معرکہ حاضر بودہ تمام واقعہ جنگ را بزبان ہندی در یں شعر بیان نمودہ است[5]) جن میں سال، تاریخ اور دن کی وضاحت بحسن و خوبی کی گئی ہے:

مکتوبہ ۲۳ھ[6] مرزا حیدر دوغلت مصنف تاریخ رشیدی نے بھی اس مادہ کو مولانا منیر مرغنانی سے ہی منسوب کیا ہے جو الغ بیگ مرزا (ش ۸۵۳ھ) کے دربار کے جید علماء میں تھے۔ دیکھئے ظہیر الدین محمد بابر از سید صباح الدین عبد الرحمن ص ۱۹۶۔

[1] اکبر نامہ ایضاً ص ۸۵ [2] ظہیر الدین محمد بابر ص ۲۰۳ [3] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۵۶۲ ترجمہ عبد الحی خواجہ ص[1]

[4] ظہیر الدین بابر ص ۶۵ [5] تاریخ داؤدی ص ۱۰۳ از عبد اللہ بتصحیح شیخ عبد الرشید ۱۹۶۹ء

نوسے اوپر تھا بتیسا — پانی پت میں بھارت دلیا
انٹھیں رجب تھا شکوارا — بابر جیتا براھم ہارا[۱]

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ اس دوہرے پر فارسی و اردو کے بہت سے قطعات کو قربان کیا جاسکتا ہے۔

یہ بادشاہ غازی اڑتیس سال تک تخت و تاج کی زینت بنکر بعمر پچاس سال[۲] ۶ جمادی الاول ۹۳۷ھ/۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو بروز چہار شنبہ (بدھ) اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو ہمایوں کو دیگر امور کے ساتھ یہ وصیت کرتا ہوا رخصت ہوا۔

جہاں اے پسر ملک جاوید نیست — ز دنیا وفاداری امید نیست

کسی نے قطعۂ وفات نظم کیا جس کا تاریخی شعر بد و طور (حسن تاریخی) یہ ہے:-

بتاریخ وفات شاہ بابر — در نہصد و سی و ہفت بودہ[۳] ؛ ۹۳۷ھ
۱۷ + ۴۸۵ + ۶ + ۱۲۹ + ۲۰۴

لطف اس مادہ میں یہ ہے کہ صوری ہوتے ہوئے بھی معنوی اعتبار سے بھی سال وفات برآمد ہو رہا ہے۔ ایسی تاریخیں بہت کمیاب ہیں۔ بقول ابوالفضل بہت سے فضلائے عہد نے تواریخ و مراثی اور قصائد و تراکیب کہے۔ جو راقم الحروف کی دسترس سے فی الوقت باہر ہیں۔ مولانا شہاب معمائی نے درج ذیل مصرع سے تاریخ برآمد کی۔

"ہمایوں بود وارث ملک وے"۔ ۹۳۷
۱۶ + ۹۰ + ۷۰۷ + ۱۲ + ۱۱۲

اس سے ہم ہمایوں کے سالِ جلوس کا مادہ بھی کہہ سکتے ہیں جیسے ہمایوں کے سالِ جلوس کے ذیل میں دیکھئے۔ دوسرا مادہ "ہشت روزی باد" (۹۳۷ھ) نیز کسی نے "شش محرم" (تاریخ پیدائش) کی رعایت سے "شش شوال" سے سالِ سنوح برآمد کیا مگر ماہ کے اعتبار سے یہ درست نہیں۔

۱؎ داستانِ تاریخ اردو از پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم ص ۲۱ مطبوعہ ۵۶ ۱۹ء

۲؎ گلبدن بیگم، نظام الدین اور فرشتہ ۵ جمادی الاول (۲۵ دسمبر) اور ابوالفضل ۶ جمادی الاول (۲۶ دسمبر) لکھتا ہے اس سلسلہ میں بارے تفصیلات ملاحظہ ہو دی والا ہسٹاریکل اسٹڈیز ان مغل نیومسمیٹکس ص ۳، ۲۶۲۔

۳؎ مفاوضۂ گرامی پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب مکتوبہ ۲۳ مئی ۸۹ء ص ۲ بنام راقم سکہ اکبر نمبر ۱، ۱۱۶

خواجہ کلاں بیگ سامانی نے اس فردوس مکانی کے مرثیہ میں ایک شعر یہ کہا:

بے تو زمانہ و فلکِ بیمدار حیف ‏ ‏ ‏ باشد زمانہ و تو نباشی ہزار حیف

جو مولانا کے رنج و الم کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

بابر کے سب سے بڑے شہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں مرزا کی پیدائش شب سہ شنبہ (منگل) چہارم ماہ ذیقعدہ ۹۱۳ھ/ ۶ مارچ ۱۵۰۸ء کو قلعۂ کابل میں ماہم بیگم کے بطن سے ہوئی۔ اس شادمانی کے موقعہ پر خواجہ کلاں بیگ سامانی نے بطریق تخرجہ نہایت خوبصورت قطعۂ سالِ ولادت نظم کرکے بابر کے حضور پیش کیا جو دعائیہ بھی ہے۔

سالِ مولودِ ہمایونش ہست ‏ ‏ ‏ زادک اللہ تعالیٰ قدرا = ۹۱۴

‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ۳۰۵ + ۵۱۱ + ۶۶ + ۳۲

بردہ ام یک الف از تاریخش ‏ ‏ ‏ تاکشم میل دو چشم بدرا ‏ ‏ $\frac{1}{913}$ھ

یعنی اس مولودِ خجستہ کا سالِ پیدائش " زادک اللہ تعالیٰ قدرا " (جس سے ۹۱۴ برآمد ہوتے ہیں) لیکن شاعر کو ۹۱۳ عدد درکار تھے لہٰذا وہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ ایک عدد کا تخرجہ کرتے ہوئے کہتا ہے) اس لیے میں نے مولود مسعود کی تاریخ (مادّہ) میں سے ایک الف (جس کی عددی قدر ایک ہوتی ہے اور جو سلائی کے ہم شکل ہوتا ہے) لے لیا تاکہ اس سلائی (الف) کو بُری نظر والے کی دونوں آنکھوں میں پھیر کر اسے معدوم البصر کردوں تاکہ یہ مولودِ مبارک نظرِ بد سے مامون و مصؤن ہو جائے۔ (مقصد ایک عدد کا تخرجہ کرکے ۹۱۳ھ برآمد کرنا تھا۔)

مولانا مسندی نے "سلطان ہمایوں خاں" سے سالِ پیدائش مستخرج کیا[1] کابل کے کسی دوسرے شاعر نے مصرع " شاہ فیروز قدر" سے تاریخ" سے اعداد برآمد کیے افسوس کہ پورے قطعہ تک اس کوتاہ دست کی رسائی نہ ہوسکی نیز کسی شاعر نے "خوش باد" سے بھی مکمل اعداد برآمد کیے[2]۔

ہمایوں ۹ جمادی الاولی ۹۳۷ھ/ ۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء کو دارالخلافہ آگرہ میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ کسی نے "خیر الملوک" سے سالِ جلوس ۹۳۷ھ برآمد کیا۔ اس موقع پر مولانا شہاب الدین احمد معمائی متوفی ۹۴۲ھ نے، جنہیں تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، یہ قطعہ کہا:

---

[1] ایضاً ص: ۱۱۹ ‏ ‏ [2] ایضاً ص: ۱۱۹

سرِ خسرواں شاہ بابر کہ داشت | دو صد بندہ مانند جمشید و کے
شد آرام گاہش بہشت بریں | چو طومار عمرش اجل کرد طے
محمد ہمایوں بجائش نشست | کہ ملکش زچیں باد تا روم و رے
چو پرسند تاریخش اے دل بگوے
"ہمایوں بود وارثِ ملک وے" : ۹۳۷ھ
(بزم تیموریہ ۱: ۸۰۔۷۷، از سید صباح الدین عبدالرحمن)

جنگِ بلگرام (قنوج، ۱۷ مئی ۱۵۴۰ء) عہد وسطیٰ کا با زاندوختہ (REFLEXIVE ACTION) نقطہ ہے جس نے مغلوں کی حکمرانی ختم کر کے افغانوں (شیر شاہ) کے سر پر تاجپوشی کی اور ہمایوں اپنے بختِ برگشتہ کو لیے پندرہ سال تک در بدر مارا مارا پھرتا رہا۔

بختِ بد با کسے کہ یار بود | سگ گزد گر شتر سوار بود

بالآخر ہمایوں کا بختِ خفتہ بیدار ہوا اور جنگ سرہند (۲۲ جون ۱۵۵۵ء) میں سکندر شاہ سور کو شکست دیکر ۲۳ جولائی ۱۵۵۵ء کو دوبارہ ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث ہوا، بیرم خاں نے اس فتح کی تاریخ پر یہ رباعی کہی؛

منشیٔ خرد طالعِ میموں طلبید | انشار سخن زطبع موزوں طلبید
تحریر چو کرد فتح ہندوستاں را
تاریخ ز شمشیر ہمایوں طلبید[1] : ۹۶۲ھ
۸۵۰ + ۱۱۲

لیکن اس مرتبہ ہمایوں کو دستِ اجل نے حکومت کرنے کی زیادہ مہلت نہ دی۔ ایک دن وہ دین پناہ (جسے بعد میں شیر منڈل[2] بھی کہا جاتا تھا) میں اپنے دار المطالعہ کی چھت پر بیٹھا ہوا اپنے خصوصی امراء اور ماہرین نجوم سے کچھ صلاح مشورہ کر رہا تھا کہ اس کے قریب ہی ایک مسجد میں مسکین نامی موذن نے مغرب کی اذان دی، اس وقت ہمایوں نے ایک زینہ طے کر لیا تھا اور دوسرے زینہ پر

---

[1] تاریخ فرشتہ ۱: ۶۷۸ ترجمہ عبدالحیٔ خواجہ

[2] رائے شیر منڈل ملاحظہ ہو آثار الصنادید ا : ۲۳۶ مرتبہ خلیق انجم ۱۹۹۰ء

اذان سنکر تعظیماً بیٹھ گیا ختم اذان پر وہ اپنی چھڑی کے سہارے کھڑا ہوا کہ قضائے الٰہی سے چھڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پوستین کا ایک سرا اس کے نیچے دب گیا اور اس طرح بادشاہ زینے سے سر کے بل گر پڑا جس سے داہنی کنپٹی میں شدید ضرب آئی۔ بیہوشی کی حالت میں اسے محل میں لایا گیا، علاج شروع ہوا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا آخر کار گیارہویں ربیع الاول ۹۶۳ھ/۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء[1] کو وہ بقول لین پول اُفتاں و خیزاں قید حیات سے آزاد ہو گیا ٹھیک اسی طرح تمام زندگی بھر افتاں و خیزاں چلتا رہا تھا: قاسم کاہی نے قطعۂ وفات کہا:

ہمایوں پادشاہ آں شاہ عادل   کہ فیضِ خاص او بر عام افتاد
بنائے دولتش چوں یافت رفعت   اساسِ عمرش از انجام افتاد
چو خورشیدِ جہاں تاب از بلندی   بپایاں در نماز شام افتاد
.... پئے تاریخ او کاہی رقم زد

"ہمایوں پادشاہ از بام افتاد"[2] ۹۶۲ھ بکمی یک عدد

مذکورہ مادہ میں تقریباً ڈھائی ماہ کا فصل زمانی ہے یعنی ۹۶۲ھ کو گزرے ہوئے نہایت قلیل مدت ہوئی تھی ایسی صورت میں تاریخ گو حسب واقعہ مادہ سے سالِ صنوح گذشتہ یا آئندہ سال کے برآمد کر سکتا ہے گو حساب جمل کی رو سے ایک سال کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ بہر کیف واقعات پر بعینہٖ منطبق مادے خال خال ہوتے ہیں۔ میر عبد الحیٔ نے "ایوا بادشہ من از بام او فتاد"[3] سے بھی ہمایوں کا سال ارتحال ۹۶۳ھ برآمد کیا، جو مکمل مادہ ہے۔ لیکن اس میں لفظ "ایوا" جو "اے وائے" کا مخفف ہے، کی غرابت کے سلسلہ میں ڈاکٹر عبد الرب عرفان صاحب فرماتے ہیں کہ "ایوا بادشہ من از بام او فتاد"

---

[1] ہمعصر مورخین میں ہمایوں کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں اختلافات ہیں۔ طبقات اکبری، منتخب التواریخ، فرشتہ وغیرہ حادثہ کی تاریخ ۱۵ ربیع الاول روز جمعہ ۹۶۳ھ بتلاتے ہیں لیکن انتقال کی تاریخ میں کچھ دنوں کا فرق بتلاتے ہیں جو بعید از قیاس نہیں کیونکہ اس کے انتقال کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ برائے تفصیل دیکھئے اکبر نامہ ۱: ۳۶۳-۳۶۴، طبقات اکبری، منتخب التواریخ ۱: ۴۶۵-۴۶۶، ہمایوں از الشوری پرشاد ص ۳۶۵، ہمایوں از سنرش ۲: ۵۰۸-۵۰۷ اکبر دی گریٹ از اے۔ ایل سری واستوا جلد ۱: ۸، ۱۷ وغیرہ۔ [2] سیر المتاخرین ص ۴۴ از غلام حسین طباطبائی انتخاب بابر تا جہانگیر بہ تصحیح قاضی تصدق حسین ریاضی قریشی لاہور۔ [3] دیکھئے لغات ہیرا مؤلفہ منشی چمن لال لفظ "ایوا" کے تحت۔

کے بارے میں . . . قیاس ہے کہ: "واسے بادشاہِ من الدہام ادفتاد" قرینِ صحت ہے اگر اس کے شروع میں دو حرفی امر مثلاً "گو" یا کوئی اور لگا دیا جائے تو مصرع مکمل ہو جائے گا، اس طرح "ایطا" کی قباحت کا بھی ازالہ ہو سکتا ہے"۔[1]

عنوان اور ترتیبِ زمانی کے برخلاف اگر یہاں قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے شیر شاہ سوری کی وفات کا قطعہ بھی سپردِ قرطاس کر دیا جائے، جو حسبِ حادثہ ہے، تو نامناسب نہ ہوگا۔

نومبر ۱۵۴۴ء میں شیر شاہ نے ہندوستان کے مشہور و معروف اور مضبوط ترین قلعہ کالنجر پر حملہ کیا، جس پر راجہ کیرت سنگھ کی حکمرانی تھی۔ اس حصار کو تقریباً چھ ماہ تک شیر شاہ فتح نہ کر سکا بالآخر اس نے ساباط[2]، سرکوب (دمدمے) اور برج تعمیر کرنے کے احکام صادر کئے۔ ایک برج اتنا بلند تعمیر کیا گیا کہ یہاں سے قلعۂ کالنجر کا اندرونی حصہ بآسانی اور صاف نظر آتا تھا۔ اس پر بادشاہ خود کھڑا ہوا اور اپنی سپاہ کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ باروت کے گولے (حقہ ہائے باروت) قلعے کے اندر اور قلعہ کی فصیل کو توڑنے کے لئے پھینکے جا رہے تھے۔ دفعتاً ایک گولہ قلعہ کی فصیل سے ٹکرا کر اس برج کے نیچے جہاں گولہ بارود کو آگ لگ گئی اور شیر شاہ مع اپنے مرشد شیخ خلیل خاں، مولانا نظام دانشمند اور دریا خاں شیروانی کے جل گیا۔ اور بقولِ مولانا محمد حسین آزاد "شیر شاہ کا یہ عالم ہوا کہ جلس کر ٹیمہ (جھلس) ہو گیا"[3] مگر اس حالت میں بھی شیر نیستاں مورچہ پر ڈٹا رہا، کبھی بیہوشی طاری ہو جاتی اور جب ہوش آتا تو بلند آواز سے لشکر کو معرکہ آرائی کی تاکید کرتا اور اپنے خاص امراء کو بڑے اہتمام و تاکید کے ساتھ دشمن سے نبرد آزمائی کے لئے روانہ کرتا۔ اسی دن یعنی دس ربیع الاول ۹۵۲ھ/ ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کی شام کو شیر شاہ نے قلعے کے فتح ہونے کی خبر سنی لہٰذا اس کے چہرہ پر خوشی و اطمینان کے آثار

---

[1] مفاوضۂ گرامی بنام راقم الحروف مکتوبہ ۲ اپریل ۱۹۹۱ء کامٹی۔ [2] ساباط سے مراد وہ دو دیواریں ہوتی ہیں جن میں ایک تفنگ انداز کا فاصلہ ہوتا ہے۔ مزدور لکڑی کے تختوں اور گاؤ کی کھال سے بنے ہوئے ٹوکروں کی پناہ میں یہ کھران دیواروں کی تعمیر کرتے ہیں، تاکہ محصورین قلعہ کا گولہ معماروں کو گزند نہ پہنچا سکے، معماران ساباط کو قلعہ کی دیواروں تک پہونچاتے ہیں جب ساباط تیار ہو جاتی ہیں تو قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے برائے تفصیل ملاحظہ ہو فرشتہ (اردو) ۲/ ۱۱۔

[3] دیکھیے دربارِ اکبری ص ۷۱۶۔ شیر شاہ کے جل جانے پر لفظ "ٹیمہ" کا استعمال مولانا محمد حسین آزاد کے وقار کے منافی ہے جبکہ وہ بات بات پر ملا عبدالقادر بدایونی کو کوستے ہیں۔

کاملہ جستہ اطماس کی روح حصار جسم سے آزاد ہوکر جنت الفردوس کو روانہ ہوگئی۔ کسی نکتہ سنج نے حسب واقعہ درج ذیل قطعہ نظم کیا:

شیر شاہ آں کہ از صلابت او — شیر و بز آب را بہم می خورد
چوں برفت از جہاں بدار بقا — گشت تاریخ او ز آتش مرد[1] ۹۵۲ھ

۲۴۴ + ۷۰۱ + ۷

جلال الدین محمد اکبر ۵ رجب کی شب یکشنبہ ۹۴۹ھ/ ۱۵ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو قلعہ امرکوٹ میں پیدا ہوا شہزادہ کی ولادت کا مژدۂ جانفزا سنکر مجلس نشینان ہمایونی نے جو عیارگاہ جوہر انسانی کو پہونچے ہوئے تھے، قصائد تہنیت کہے۔ مولانا نورالدین ترخان نے یہ تاریخ ولادت ذیل کی۔

چوں کلک قضا شاں تقدیر نوشت — آیات ابد را ہمہ تفسیر نوشت
از بہر ولادت شہنشاہ جہاں — تاریخ شہنشہ جہانگیر نوشت[2] ۹۴۹ھ

۲۸۹ + ۶۶۰

ایک دوسرے فاضل نے بھی صنعت معنوی میں قطعہ تاریخ ولادت نظم کیا جو حسن تاریخ کا نادر نمونہ ہے اس قطعہ میں وقت پیدائش، دن، تاریخ اور ماہ کا تعین کرتے ہوئے معنوی اعتبار سے سال برآمد کر دیا گیا ہے نیز نام و لقب کی صراحت بھی کی گئی ہے:

للہ الحمد کہ آمد بوجود — آنکہ از کون و مکاں منتخب است
بادشاہے کہ ز شاہان جہاں — اکبرش نام جلالش لقب است

شب و روز مہ و سال میلاد
"شب یکشنبہ پنج رجب است"[3] ۹۴۹ھ

۳۰۲ + ۳۸۷ + ۵۵ + ۲۰۵

ستر دن تک ہمایوں کے انتقال کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا[4] اس درمیان جب فوج کو کچھ شک

۱۔ انتخاب سیر المتاخرین ص ۳۶ ۲۔ اکبر نامہ ۱/ ۴۹

۳۔ اکبر نامہ ۱/ ۴۹ مذکورہ مادہ کے علاوہ میں محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ "تاریخ کیا ہے! لطیفۂ غیبی ہے سنہ، مہینہ، دن، تاریخ، وقت سب موجود ہے"! دربار اکبری ص ۱۰۵ مطبوعہ ۱۹۱۰ء

۴۔ اکبر نامہ ۱/ ۳۴۴ نیز ضمیمہ ہمایوں نامہ (اردو) حاشیہ ص ۴۳ مترجمہ پروفیسر سید ابن حسن شارق۔

۵۔ یہ قطعہ اکبر کے تخت نشین ہونے کے بعد کہا ہوگا رؤف

شب ہوا تو ملا بیکسی نامی شخص کو جو ہمایوں کا ہم شکل تھا شاہی لباس و لوازمہ کے ساتھ اس جگہ بٹھایا گیا جہاں ہمایوں اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ اس سے فوج اور عوام کو یقین ہو گیا کہ بادشاہ زندہ ہے۔ ان ایام میں اکبر پنجاب کے کلانور نام کے مقام پر تھا، وہاں بیرم خاں نے اطلاع ملتے ہی اینٹوں کا ایک چبوترہ بنوا کر ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء (۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ) کو اکبر کی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا (کہتے ہیں کہ یہ چبوترہ کلانور میں تاحال موجود ہے) لیکن دہلی میں ۳۰ فروری ۱۵۵۶ء (۲۸ ربیع الثانی ۹۶۳ھ) کو ہی اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس موقعہ پر میر عبدالحی صدر نے یہ شعر کہا جس سے اکبر کے تخت نشینی کا سال برآمد ہوتا ہے!

اگر نوروز عالم رفت برباد ۔ "گلے صد برگ سوری البقا باد" ۹۶۳
۶+۱۳۳ + ۲۰۱ + ۲۶۶ + ۲۲۲ + ۹۴ + ۴

خواجہ حسین ثنائی نے شہزادہ سلیم کی پیدائش (۹۷۷ھ / ۱۵۶۹ء) کے موقعے پر ایک قصیدہ تہنیت بادشاہ کے حضور پیش کیا جس کے ہر شعر کے پہلے مصرعے سے اکبر کی تخت نشینی کا سال اور دوسرے مصرعے سے شہزادہ سلیم کی پیدائش کا سال برآمد ہوتا تھا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں!

للہ الحمد از پئے جاہ و جلال شہریار ۹۶۳ھ ۔ گوہر مجد از محیط عدل آمد در کنار ۹۷۷
۲۱۱ + ۵۰ + ۴۴ + ۶ + ۹ + ۱۲ + ۸ + ۸۳ + ۶۵ ۔ ۲۱۱ + ۲۰۰ + ۲۳۵ + ۱۰۴ + ۹۲۷ + ۸ + ۴۷ + ۲۳۱

طائرے از آشیانِ جاہ و جود آمد فرود ۔ ۔ کز کیے از اوجِ عز و ناز گردید آشکار ۔

شاد شد دلہا کہ باز از آسمانِ عدل و داد ۔ ۔ باز دنیا زندہ شد کز مہر ایام بہار ۔

آں ہلالِ برجِ قدر و جود و جاہ آمد بروں ۔ ۔ واں نہال از روئے جانِ شاہ آمد بار ۔

---

۱ مغل سلاطین ہمایوں از پروفیسر ہری شنکر شریواستو ص ۲۹۸ میں ۱۹۸۵ اور مولانا محمد حسین آزاد نے اس کا نام شکیبی لکھا ہے جو شاعر تھا اور یہی نام درست معلوم ہوتا ہے، دربار اکبری ص ۱۱ ۲ ایضاً ص ضلع گورداسپور

۳ یہ وہی میر عبدالحی ابن شیخ فضل اللہ عرف مولانا جمالی کنبوہ ہیں جن کی شیر شاہ نہایت قدر و منزلت کرتا تھا۔ جب حاکم مالوہ مسمی ملو خاں نے ۹۴۹ھ میں شیر شاہ سے بد عہدی کی تو شیر شاہ نے برسر اجلاس فی البدیہہ یہ مصرع پڑھا ع با ما چہ کرد دیدی ملو غلام گیدی" اور شیخ کی جانب تبسم فرمایا۔ لہذا شیخ عبدالحی نے غلام کی سرشت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حدیث "لیست مصطفیٰ الا خیر فی العبید" سے مطلع مکمل کر دیا۔ فرشتہ ۱۴۴۲ لیکن تاریخ داؤدی ص ۱۴۶ پر پہلے مصرع کی قرأت یہ ہے تا دیدی چہ کرد آخر ملو غلام گیدی

۴ ہمایوں نامہ شارق ص ۱۴۴

شاہِ اقلیم وفا سلطانِ ایوان صفا ۹۶۳ھ　شمع جمع بے دلاں کام دل امیدوار ۹۷۷ھ
عادل کامل محمد اکبرِ صاحب قِراں "　بادشاہِ نامدارِ کام جوی و کامگار "
کاملِ دانائے قابل اعدلِ شاہاں بدیر "　عادلِ اعلیٰ عاقل بے عدیلِ روزگار "
سایۂ لطف الٰہ آں لائق تاج و نگیں "　بادشاہِ دیں پناہ آں عادل عالم مدار "
نیّرِ برجِ وجودی گوہرِ دریائے جود "　از ہوائے اوج دلہا شاہبازِ جاں شکار "
مصرعۂ اول زروی سال جلوس بادشاہ "　از دُوِیم مولود نورِ دیدۂ عالم برآر "

شاہِ ما پاینده بادو باقی شہزاد ہماں ۹۶۳ھ
روز ہائے بے حساب و سالہائے بےشمار ۹۷۸ھ

مصرعۂ آخر میں کسی حرف کی کمی یا زیادتی سے ۹۷۷ عدد بھی برآمد ہوسکتے ہوں گے۔

بالآخر تقریباً اکیاون سال حکومت کرنے کے بعد اکبر شب چہارشنبہ ۱۲[۲] جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ/۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو انتقال کر گیا۔ قطعہ تاریخ وفات درج ذیل ہے:

جلال الدین محمد شاہ اکبر　　زدنیا گشت سوئے خلد راہی
چو رضواں دید حیراں شد کہ ایں کیست　ندا آمد زیکے ظلِ الٰہی[۳] ۱۰۱۴ھ
۴۰ ۹۹۳۰ ۴۳۰ ۴۴

آصف خاں جعفر نے اس شعر سے سال وفات متخرج کیا:

فوت اکبر شہ از قضائے الٰہ　گشت تاریخ "فوتِ اکبر شہ"[۳] ۱۰۱۴ھ
۳۰۵ ۲۲۳ ۴۸۶

صاحب دربارِ اکبری نے اس شعر کا املا یہ لکھا ہے:

فوت اکبر شد از قضائے الٰہ　گشت تاریخ فوتِ اکبر شاہ (ص ۱۰۵) ۱۰۱۵ھ

اور فرمایا ہے کہ اسمیں ایک عدد زیادہ ہے۔ کسی نے تخرجہ خوب کیا ہے ع

الف کشیده ملائک ز فوت اکبر شاہ

۱؎ بزم تیموریہ ا ۲۶۸، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن مطبوعہ ۱۹۷۲ء دار المصنفین اعظم گڈھ
۲؎ دربار اکبری ص ۱۰۳ نیز انتخاب سیر المتاخرین ص ۱۱۷ ۳؎ فرشتہ (اردو) ۱/ ۳۱۷
۳؎ انتخاب سیر المتاخرین ص ۱۱۸ لیکن مصرع مادہ میں "اکبر شاہ" لکھا ہوا ہے۔ جو بہ لحاظ ایک عدد ہے۔

یعنی ملا تکے نے اس غم میں فقیری و قلندری اختیار کی۔ اس لئے ملتے پر الف اللہ کا کھینچا، دال آسمان پر انھوں نے وہ الف کھینچا، یہاں اعداد میں سے الف کا ایک شاعر نے کھینچ لیا۔ ۹۷۲ پورے ہو گئے الف کشیدن بمعنی قلندری اختیار کردن ہے[۱]۔۔۔"

شہزادہ سلیم ۱۷ ربیع الاول روز یک شنبہ ۹۷۷ھ/۳۰ اگست ۱۵۶۹ء بوقت چاشت سیکری میں پیدا ہوا۔ معاصر شعراء نے استادانہ کمال کے ساتھ قصائد کہے۔ مرد کے خواجہ حسین ثنائی کا قصیدہ سب پر فوقیت لے گیا۔ جیسا کہ اکبر کی تخت نشینی کے سلسلہ میں عرض کیا گیا، کہ اس قصیدہ کے ہر شعر کے مصرع اولیٰ سے اکبر کی تخت نشینی کا سال اور مصرع ثانی سے شہزادہ کی ولادت کا سال برآمد ہوتا تھا، چنانچہ انہیں دو لاکھ ٹنکہ انعام میں دیا گیا۔

"شہزادہ سلیم کی شادی ۲۲ صفر ۹۹۳ھ/۱۳ فروری ۱۵۸۵ء کو امبیر کے راجہ بھگونت داس کی راجکماری مان بائی سے ہوئی۔ اس موقع پر سینکڑوں کی تعداد میں قصائد و قطعات تاریخ کہے گئے مگر ملک الشعراء ابوالفیض فیضی فیاضی متوفی ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء کا قصیدہ سب پر فوقیت لے گیا، جس کے ہر مصرعے سے اس شادی کی تاریخ نکلتی ہے۔ اس قصیدے کے دو شعر یہ ہیں۔

نہے عقد دُرِ پاش سلطان سلیم ۹۹۳ھ — کہ پرتو دہد سال امید را ۹۹۳ھ
[illegible] آفتاب [illegible] دو دل [illegible] — قرآن [illegible] شش ماہ تا بید را

(ترجمہ تیمور بہار ۱۳۶۲)

علامہ شبلی نعمانی متوفی ۱۹۱۴ء نے اس جشن عروسی کی جو تصویر اپنی مشہور نظم بعنوان "تیم انگیز یاں عطر محبت کی" میں کھینچی ہے اسے یہاں دوہرانا نا مناسب نہ ہوگا کہ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را — کبھی گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی — کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرمانروا ئے پور نے نسبت کی خواہش کی — اگرچہ آپ بھی خود صاحب دیہیم ولشکر تھا
ولی عہد حکومت اور خود شاہنشہ اکبر — گئے امبیر تک جو تخت گاہ و ملک کشور تھا

---

[۱] دربار اکبری ص ۲۵۔

ادھر وہ حور دیدہ گھر میں جلوہ آرا تھی　　ادھر شہزادہ پر چتر عروسی سایہ گستر تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے　　کہ کوسوں تک زمین پر فرش دیبائے شجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کاندھے پر جو لائے تھے　　وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی　　کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا

تمہیں لے دیکے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

وہ ۱۹ ، جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ / ۲۳ ، اکتوبر ۱۶۰۵ء کو جمعرات کے روز باضابطہ طور پر قلعۂ آگرہ میں تخت نشین ہوا اور نور الدین محمد جہانگیر بادشاہِ غازی کا لقب اختیار کیا۔ اٹھاون سال (بحساب شمسی) کی عمر میں ۲۷ ، صفر ۱۰۳۷ھ / ۲۹ ، اکتوبر ۱۶۲۷ء کو بوقت چاشت اپنی حکومت کے بائیسویں سال اس کا انتقال ہو گیا۔ ملا کشفی نے تاریخ برآمد کی؛

جو تاریخ وفاتش جست کشفی　　خرد گفتا " جہانگیر از جہاں رفت "[1]

مادہ سے ۱۰۳۶ھ نکلتے ہیں ممکن قطعہ بطور تخرجہ کیا ہو۔ ورنہ ۱۰۳۶ھ کو گذرے ہوئے ابھی ایک ماہ اور ستائیس یوم ہی ہوئے تھے ۔

ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں شہنشاہ والا شان صاحبقران ثانی ، جس کے بچپن کا نام سلطان خرم تھا ۳۰ ، ربیع الاول ۱۰۰۰ھ / ۵ ، جنوری ۱۵۹۲ء بوقت شب بروز جمعرات جبیۂ موٹا راجہ (اودے سنگھ جودھپور ویرت) کے بطن سے شہر لاہور میں اس نیک ساعت میں پیدا ہوا جو ستارۂ زہرہ و مشتری کے اقتران کی گھڑی تھی۔ ابطالب کلیم کاشانی نے جو بعد ازاں ملک الشعرائے شاہجہانی ہوا پانچ اشعار پر مشتمل قطعہ ولادت کہا۔

للہ الحمد کہ از پرتو خورشید قدم　　سایۂ مرحمتی بر سر عالم آمد
عالم افروز دری زینت دوراں گردید　　کہ بخورشید دریں بزم مقدم آمد

---

[1] انتخاب سیر المتاخرین ص ۱۴۳۔ طباطبائی صاحب نے غالباً مادہ کی رعایت سے سال وفات بھی ۱۰۳۶ھ بتلایا ہے ، " وقت چاشت روز یکشنبہ بیست وہشتم صفر سنہ یکہزار و سی و شش ہجری ۔۔ " سلاطین دشمال کا بعد منصری عہد بد " ص ۱۴۳ ۔

مژدۂ از فلکِ پادشہی کرد طلوع | کہ بتاج فلکش جام مسلم آمد
ہر کہ نظارۂ آں طالع مسعود کند | ہر کجا بد نظری سعد فراہم آمد (کلیم)

برزبانِ قلم از غیب پئے تاریخش

"شاہِ شاہانِ جہاں قبلۂ عالم آمد" ۱۰۰۰ھ

۳۰۶ + ۳۵۰ + ۵۹ + ۱۳۰ + ۱۴۱

"شاہِ روئے زمیں وشاہ جہاں" نیز "لمعۂ آفتاب عالمگیر" سے بھی سال پیدائش برآمد کئے گئے [1] نیز مادہ "زجود شاہ جہاں بادشہ ملک آرائے" [2] سے بھی یہ بے مثال سال (۱۰۰۰ھ) برآمد ہوتا ہے۔

۸۔ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ بروز دوشنبہ ۴ر فروری ۱۶۲۸ء کو شاہ جہاں کی تاجپوشی ہوئی۔ اس مبارک موقع پر بطور تہنیت درج ذیل قطعہ تاریخ مسیح کاشی نے پیش کیا جسے بارہ ہزار روپے کے انعام سے سرفراز کیا گیا:

بادشاہِ زمانہ شاہ جہاں | خرم وشاد و کامراں باشد
حکم او بر خلائق عالم | ہمچو حکم قضا رواں باشد

بہر سال جلوس او گفتم

"در جہاں بادشاہ جہاں باشد" [3] ۱۰۳۷ھ

۲۰۴ + ۵۹ + ۲۱۱ + ۵۹ + ۳۰۴

شاہ جہاں کا سال جلوس میر الٰہی خوشنویس نے اس طرح موزوں کیا:

تا بود از عالم و آدم نشاں | شاہِ جہاں بادشاہِ جہاں

کلک قضا سالِ جلوسش نوشت

"شاہ جہاں باشد شاہ جہاں" ۱۰۳۷

۳۶۵ + ۳۰۷ + ۳۶۵

۱۔ "مقالہ ابوطالب کلیم کے چند قطعات تاریخ" از محترم ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب ڈائرکٹر، صدر شعبۂ اردو فارسی انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز دانشگاہ ناگپور مشمولہ ماہنامہ جامعہ ص ۲۷ بابت جون ۱۹۸۹ء

۲۔ تاریخ شاہ جہاں مترجمہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص ۴۱ ۳۔ مقالہ لغت ابجد شمار از سید احمد صاحب مشمولہ ماہنامہ آجکل نئی دہلی ص ۲۲ قسط نمبر ۲ بابت جنوری ۱۹۸۲ء اور ۴ ۔ کے لئے ملاحظہ ہو مقالہ "اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں" از محترم پروفیسر عبدالرب عرفان صاحب مشمولہ ماہنامہ معارف ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

سیدائے گیلانی المخاطب بہ بے بدل خاں نے درج ذیل مصرع سے سال اورنگ آرائی برآمد کیا :-

" جلوس شاہ جہاں دادہ زیب ملت و دین " ۱۰۳۷ھ
۹۹ + ۳۶۵ + ۱۴۰ + ۱۹ + ۴۷۰ + ۹ + ۶۴ + ۶۴

" زینت باشرع " اور خدا حق بحق دار داد سے بھی ۱۰۳۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ صاحب بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری نے عدد روز نام روز و ماہ جلوس، " دوشنبہ بیت و ہفتم بہمن " سے سال تخت نشینی شاہ جہاں برآمد کیا۔ یہ مادہ لفظی و معنوی تاریخ کے بہترین نمونوں سے ہے جس طرح بابر کی ولادت کا سال " شش محرم " اور وفات " شش شوال " برآمد کی ہے ۔

ابھی جلوسِ شاہجہانی کو تقریباً ساڑھے تین سال (تین سال پانچ ماہ دس دن) ہی ہوئے تھے کہ شاہ جہاں کی رفیقۂ حیات ملکہ نواب ارجمند بانو بیگم مخاطب بہ ممتاز محل نے ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ ، ۷ جون ۱۶۳۱ء روز چہارشنبہ کو برہان پور میں شہزادی حسن آرا بیگم کی ولادت کے دوران راہی جنت ہوئی ۔ جلد اس سانحہ سے سارے دربار پر غم واندوہ کی فضا طاری ہوگئی ، اور شدت غم سے چند دن میں بادشاہ کے بال سفید ہو گئے نیز بینائی کمزور ہوگئی چنانچہ بادشاہ کو عینک لگانی پڑی۔ اس حادثہ کی تاریخ لفظ " غم " (۱۰۴۰ھ) سے نکالی گئی ۔ سیدائے گیلانی نے مصرع " جا ئے ممتاز محل جنت باد " سے سال برآمد کیا جو متوفیہ کے حق میں دعائے حسن عاقبت بھی ہے ۔ ابو طالب کلیم نے درج ذیل رثائیہ رباعی کہی !

از حق چو نداشنیدہ ممتاز محل	زود از ہمگی بریدہ ممتاز محل
رضوان در خلد بہر تاریخش گفت	" فردوس محل گزیدہ ممتاز محل " ۱۰۴۰ھ

۳۵۰ + ۷۸ + ۲۶۴ + ۲۸۸ + ۷۸

(جاری)

اثاث کے لئے ملاحظہ ہو مقالہ " اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں " از محترم پروفیسر محمد ارب عرفان صاحب مشمولہ ماہنامہ معارف ص ۱۰۴ ، ۱۰۵ ء سے برائے تفصیلات ملاحظہ ہو " ہسٹری آف شاہ جہاں آف دہلی ص ۳۱۰ از ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ مطبوعہ ۱۹۵۸ء

قسط (۱)

امام ابوالحسن علی کسائی

محمد الیاس الاعظمی ایم۔ اے

امام ابوالحسن علی کسائی تبع تابعین میں سے ہیں نحو اور لغت و عربیت اور خاص طور پر قرأت میں ان کا مرتبہ اس درجہ بلند ہے کہ وہ ان کے امام کہلاتے ہیں قراء سبعہ کے یہ سب سے آخری ساتویں یعنی پہلے قاری ہیں یہ جب تک زندہ رہے قرآن پاک کی خدمت کی ان سے بے شمار طالبان علم نبوی نے اپنی علمی و دینی پیاس بجھائی اس لئے ان کی زندگی کے حالات و واقعات اور مختلف النوع خصوصیات و امتیازات کو قدرے تفصیل سے قلمبند کیا جاتا ہے۔

نام و نسب علی نام، ابوالحسن کنیت، کسائی لقب و نسب اور شجرۂ نسب مندرجہ ذیل ہے:۔ سیدنا ابوالحسن علی بن حمزہ بن عبداللہ بن قیس (بہمن) بن فیروز اسدی کوفی نحوی کسائی۔ [۱]

نسبتیں: امام ابوالحسن علی کسائی کسائی اسدی، نحوی اور کوفی کی نسبتوں سے مشہور ہیں کسائی سے مشہور ہونے کی چار وجہیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ عالم جوانی میں کمبل کی تجارت کرتے تھے اور کمبل کو عربی زبان میں کسا کہتے ہیں چنانچہ کسا کی خرید و فروخت کی بنا پر کسائی سے مشہور ہو گئے۔

۲۔ حج بیت اللہ شریف میں احرام کسا یعنی کمبل کا باندھا تھا اس لئے کسائی سے مشہور ہوئے علامہ شاطبی اپنے قصیدہ میں فرماتے ہیں:

واما علی فالکسائی نعتہ　　لما کان فی احرام فیہ تسربلا

ترجمہ:۔ امام ابوالحسن علی کسائی جو ہیں ان کی صفت کسائی ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے وقت احرام میں کمبل پہنا تھا۔

۱؎ تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۱۳ و شجرہ سبعہ قرأت ص ۱۴ و شرح سبعہ قرأت ص ۲۱ و دائرۃ معارف اسلامیہ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) ج ۱۷، ص ۲۶۵۔

عبدالرحمٰن بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے کسائی سے پوچھا کہ آپ کو کسائی کیوں کہا جانے لگا تو انھوں نے فرمایا لانی احرمت فی کساء میں نے احرام کمبل میں باندھا تھا [۱]

۲۔ وہ امام حمزہ کے شاگرد ہیں ان کے درس میں کسا یعنی کمبل اوڑھ کر بیٹھتے تھے امام حمزہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کمبل والے کو میرے پاس لاؤ، امام اہوازی کا بیان ہے کہ میرے نزدیک اشبہ بالصواب یہی ہے۔ [۲]

۳۔ کسائی جہاں مقیم تھے اس جگہ کا نام کسا تھا اس لئے کسائی کے نام سے مشہور ہوئے مولانا اسحاق صاحب لکھتے ہیں۔

"انھیں کسائی اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ایک خاص قسم کے لباس اور حلے سے آراستہ و پیراستہ رہتے تھے۔ ۔ ۔ ایک قول یہ ہے کہ جس گاؤں کے رہنے والے تھے اس کا نام کسا تھا اس لئے کسائی کہلائے۔" [۳]

ان دونوں وجہوں کو لکھنے کے بعد مولانا اسحاق صاحب نے لکھا ہے کہ پہلی توجیہ زیادہ صحیح ہے [۴] علامہ ابن القاصح بغدادی تحریر فرماتے ہیں۔

قیل لہ الکسائی من اجل انہ احرم فی کساء [۵]	ان کو کسائی اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک چادر میں احرام باندھا تھا۔

اسدی کوفی نحوی اس بنا پر کہے جاتے ہیں کہ بنو اسد کے آزاد کردہ غلام کوفہ کے رہنے والے اور فن نحو کے امام بلکہ اس فن کے بانی تھے۔

ولادت و وطن امام ابوالحسن علی کسائیؒ کی ولادت ۱۱۹ھ میں بزمانہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک اموی کوفہ میں ہوئی [۶] اور یہیں پرورش و پرداخت بھی ہوئی اصلاً فارسی النسل

---

[۱] تذکرۃ النحاۃ ص ۱۵ [۲] ابراز المعانی ص ۲۴، ۲۵

[۳] مولانا اسحاق مضمون چند قراء ماہنامہ المعارف لاہور رجب ۱۹۶۹ء ص ۲۹ [۴] ایضاً [۵] سراج القاری المبتدی ص ۱۲ [۶] المؤسس النحویہ ص ۱۸۲ کسائی کا سنہ پیدائش تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں نہیں ملتا بعض کتابوں میں انکی عمر ستر سال بتائی گئی ہے اس لحاظ سے ان کا سنہ پیدائش ۱۱۹ھ ہوتا ہے۔

سواد عراق کے باشندے اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے خالہ زاد بھائی تھے۔

تحصیل علم کوفہ میں امام حمزۃ الزیات کوفی سے قرأت قرآن کی تعلیم حاصل کی بعد ازاں علم نحو کے حصول میں سرگرداں ہوئے تو کوفہ میں ابوجعفر رواسی سے، بصرہ میں امام نحو خلیل بن احمد اور معاذ بن الہراء سے اس علم کی تحصیل و تکمیل کی امام حمزۃ سے چار مرتبہ قرآن کریم کی قرأت کی اور قرأت قرآن کریم میں ایک طرز خاص کے موجد ہوئے اور قراء سبعہ میں شمار ہوا بعد ازاں نحو اور قرأت دونوں میں بڑا کمال پیدا کیا۔

اساتذہ و شیوخ امام ابوالحسن علی کسائی کو جن حضرات سے شرف تلمذ حاصل تھا ان کا شمار وقت کے مشاہیر میں ہوتا ہے امام حمزۃ الزیات کوفی (قراء سبعہ میں چھٹے قاری) ان کے شیخ ہیں کسائی نے ان سے قرأت سیکھی مذاکرہ کیا وہ کسائی پر مکمل اعتبار کرتے تھے اور اپنے درس میں شریک لوگوں سے فرماتے تھے کہ اس صاحب حلہ ولباس کی طرف رجوع کرو اور ان سے پوچھو امام حمزہ کوفی کی وفات کے بعد کوفہ میں قرأت قرآن کی امامت و پیشوائی انھیں کو حاصل ہوئی علامہ دانیؒ کا بیان ہے کہ امام کسائی کی قرأت کا ماخذ و سرچشمہ امام حمزہ کی قرأت ہے۔

ان کے معلوم و مشہور اساتذہ و شیوخ مندرجہ ذیل ہیں:۔

شیوخ قرأت: امام حمزہ کوفی، قاضی محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ انصاری، عیسی بن عمر ہمدانی اعمش، ابوبکر بن عیاش الاسدی، طلحہ بن مصرف، اسماعیل بن جعفر انصاری، زائدہ بن قدامہ اور امام اعظم ابوحنیفہ [۱]

شیوخ حدیث: امام ابوالحسن علی کسائی نے حدیث پاک کا بھی سماع کیا تھا اس سلسلہ میں جن سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

امام سفیان بن عیینہ، سلیمان بن ارقم، امام جعفر الصادق، اور العرزمی وغیرہ [۲]

شیوخ نحو: امام نحو خلیل بن احمد نحوی، ابوجعفر رواسی اور معاذ بن الہراء وغیرہ [۳]

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۱۳ و سوانح قراء سبعہ ص ۱۴، شرح سبعہ قرأت ص ۴۱
[۲] ایضاً و المدارس النحویہ ص ۱۷۳ و طبقات النحویین [۳] ایضاً

سلسلۂ قرأت امام ابوالحسن علی کسائی نے امام حمزۃ الزیات کوفی کے علاوہ عیسیٰ بن عمر المعروف سے بھی سند لی جن کا سلسلہ ابراہیم نخعی علقمہ بن قیس اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے واسطوں سے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے [۱]

تلامذہ امام ابوالحسن علی کسائیؒ کے تلامذہ ناموران ائمہ اور خلیفہ بھی شامل ہیں خلیفہ ہارون رشید ان کے شاگرد تھے خلیفہ کے صاحبزادوں امین اور مامون کو بھی انھوں نے علوم قرآنیہ کی تعلیم دی تھی ان کے علاوہ بغداد میں ان کا فیض عام تھا ان کے جن نامور تلامذہ کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں ؛

ابوالحارث لیث بن خالد، ابوعمر حفص داری، نصیر بن یوسف، قتیبہ بن مہران، احمد بن سریج ابوعبید القاسم بن سلمان، یحییٰ بن زیاد الفرار، خلف بن ہشام یحییٰ بن معین وغیرہ [۲]

کسائی کے اول الذکر دونوں شاگردوں سے کسائی کی قرأت کی اشاعت و ترویج ہوئی۔

قرأت میں درجہ و مرتبہ فن قرأت میں قدر و منزلت کے اعتبار سے وہ امام القراء تھے ابن معین کا بیان ہے کہ "میں نے اپنی آنکھوں سے امام کسائی سے زیادہ عمدہ پڑھنے والا نہیں دیکھا۔

ابن الانباری کا بیان ہے کہ "قرأت عربی ادب اور لغت میں اعلم الناس تھے علامہ سیوطیؒ نے امام ابن حجر مکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابوعمرو اور کسائی کی قرأت سب قرأتوں سے زیادہ فصیح ہے صاحب تہذیب کا بیان ہے کہ کسائی بغداد میں علم قرأت و تجوید کے امام تھے" [۳]

امامت و مرجعیت امام ابوالحسن علی کسائی کی شخصیت اپنے گوناگوں امتیازات و کمالات کی بنا پر مرجع خلائق بن گئی تھی کوفہ کے منبر پر بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے اور ایک جم غفیر ان سے اخذ قرأت قرآن کیا کرتا تھا اپنے استاذ امام حمزۃ الزیات کوفی

---

[۱] سراج القاری المبتدی ص ۱۲ [۲] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۱۳ و مضمون چند قرار ماہنامہ المعارف لاہور مارچ ۱۹۶۹ء ص ۲۹ و شرح سبعہ قرأت ص ۴۲ و نزہۃ الالباء۔

[۳] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۱۳۔

کی وفات کے بعد مسند کوفہ پر متمکن ہوئے امام القرار اور امام النحو کے القابات سے نوازے گئے ابن مجاہد کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں قرأت میں لوگوں کے امام تھے " ۱؎ ابوطیب لغوی کا بیان ہے کہ :۔ " کسائی اہل کوفہ کے عالم اور ان کے امام تھے اہل علم کا مرجع اور ان کے معلم تھے " ۲؎

قرأت اور نحو تذکرہ نگاروں نے نحو اور قرأت کا ذکر ایک ہی جگہ کیا ہے قرن اول میں ہر قاری نحوی ہوتا تھا درحقیقت قرأتوں کے اختلافات ہی نے قاریوں کے اندر یہ جذبہ و حوصلہ پیدا کیا کہ وہ نحو کے اصول و ضوابط منضبط کریں تاکہ قرار کرام قرآن پاک کی تلاوت میں کلمات قرآن اصلیت محل اور اعراب سمجھ سکیں قابل ذکر امر یہ ہے کہ بصرہ کے وہ تمام نحوی جو ابن اسحاق کے بعد کے ہیں ان سب کا تعلق قرار سے تھا یعنی وہ قاری تھے قرار سبعہ کے اکثر قاری نحوی ہیں مثلاً کسائی کے علاوہ ابوعمرو زبان بن العلار امام حمزۃ الزیات کوفی، امام عاصم کوفی وغیرہ۔

قرار سبعہ کے علاوہ اور بھی بہت سے قرار نحوی تھے جیسے ابن ابی اسحاق حضرمی، عیسیٰ بن عمر، خلیل بن احمد، یونس بن حبیب وغیرہ یہ سب قرار سیبویہ بھی قرأتوں کے ماہر تھے اپنی تصنیف الکتاب میں وہ اکثر قرأتوں سے بحث و تعرض کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

۱؎ کتاب التبصرہ ص ۱۲۴　　　۲؎ بحوالہ الرشاد مئی جون ۱۹۷۰ء ص ۶۹

دوسری اور آخری قسط

عربی ادب کا نامور شہسوار
ابوالعلاء المعرّی

محمد حبیب صدیقی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ودن ہمیر اسکو ابو تمام بحتری متنبی کے ساتھ شمار کرتا ہے اور مزید برآں لائق تعظیم شاعر کا مقام دیتا ہے وون کریمر اس کے دیوان "لزومیات" کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد ابوالعلاء المعری کو عظیم ترین ماہر اخلاقیات قرار دیتا ہے۔ فارسی شاعر وسیاح ناصر خسرو مصر کا سفر کرتے ہوئے معرہ سے گذرا اور اسکو معری سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا چنانچہ وہ اس کو شہر کی ممتاز شخصیت دولت وثروت کا مالک اور باشندگان شہر کی نظر میں لائق احترام اور قابل تعظیم قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے ارد گرد ۲۰۰ سے زائد تشنگان علم وادب زانوئے تلمذ طے کئے ہوئے تھے۔ ان ماہرین ادب اور علمائے یورپ کے تاثرات کو پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ بلاشبہ مشرق کے علاوہ مغرب کے خطۂ ارض میں بھی معری نے اپنی لیاقت و مہارت کا لوہا منوالیا تھا۔

اس کے دو مشہور دو دیوان ہیں سقط الزند اور لزومیات۔ آیئے ہم ان کا الگ الگ جائزہ لیں۔

سقط الزند : اس دیوان میں ابوالعلا کے عہد شباب کی جھلکیاں دکھائی پڑتی ہیں، کثرت مبالغہ انداز بیان تقلیدی، زبان و بیان کے اصول سے انحراف کرکے اپنے جذبات کو بیانگ دہل بیان کرنا یہ اوصاف نظر آتے ہیں مگر یہ دیوان شکایات، ہجویات، عشقیہ جذبات سے بالکل خالی ہے اس میں معری اپنے زمانہ میں پائے جانے والے شعراء عرب سے مقابلہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس دیوان کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ متعدد شارحین نے اس کی شرح لکھنے کو باعث سعادت سمجھا ہے۔ مثلاً تبریزی بطلیوسی، قاسم بن حسین الخوارزمی، ابو یعقوب، یونس ظاہر ان سب نے اس دیوان پر شروحات لکھی ہیں اور اس کو قابلِ فخر و انبساط سمجھا ہے۔

اللزومیات :۔ یہ دراصل المعری کی دورِ کہولت کی سعی و کاوش ہے اور فکر و نظر کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے یہ دیوان اس کے ان اشعار پر مشتمل ہے جن میں ہر شعر کو مالا یلزم سے تطابق دیا گیا ہے اس کی وجہ سے اس میں تصنع و تکلف پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس بارے میں تاویل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے اس میں تکلف سے اس لئے کام لیا کہ اس کے خیالات مخفی رہ جائیں۔ بلاشبہ ابوالعلا اس دیوان میں ایک مفکر، مصلح سماج اور بہی خواہ انسانیت نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ متلاشیانِ علم و فن المعری کو اللزومیات کے صفحات پر دیکھتے ہیں تو اس کے کچھ مخصوص افکار کے علاوہ پیش کئے گئے دیگر احساسات و نظریات کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

روایت شعر کے لحاظ سے بہت سارے ادبا و علماء اس کے حلقۂ احباب کی فہرست میں آتے ہیں مثلاً ابوالقاسم التنوخی، خطیب ابوالزکریا التبریزی، ابوالمکارم عبدالوارث، ابوتمام غالب بن عیسٰی خلیل بن عبدالجبار الغزدمینی۔ اور ابوطاہر محمد بن احمد یہ وہ بلند پایہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے ابوالعلاء کے اشعار کی روایت کو انہ دیا دشان اور قابلِ تعریف سمجھا۔

جس طرح شاعری کے ذریعہ اپنے افکار کی ترویج و اشاعت میں وہ ایک بہترین نمائندہ دکھائی دیتا ہے بعینہٖ نثر میں بھی وہ ایک بے مثال ترجمان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور شاعری کی طرح نثر میں بھی دو عہد ہیں۔ عہدِ شباب میں مبالغہ کی کثرت، غریب الفاظ کی بھرمار سے بے جا تکلفات کو دخل دینا، مسجع بندی کرنا اور علمی اصطلاحات کے استعمال کی فراوانی نظر آتی ہے لیکن جب بعد میں وہ اپنے پیش کردہ فلسفہ کی وضاحت کے لئے تیار ہوا تو مبالغہ آرائی کم ہو گئی عقل و استدراک نمایاں طور پر نظر آنے لگا اور جملوں میں تسلسل و روانی نظر آنے لگی۔

اس کی بہت ساری تصانیف تو صلیبی جنگوں کی نذر ہو گئیں تاہم متعدد ایسی نثری تالیفات و تصنیفات باقی ہیں جو اس ادیب و ناقد کے فلسفۂ زندگی کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ تفکر عقلی کا پتہ دیتی ہیں۔

۱۔ کتاب الفصول والغایات :۔ ان متعدد مکتوبات کے مجموعہ کا نام ہے جو ابوالعلاء نے مختلف موقعوں پر لکھے۔ (۱) رسائل ابی العلاء (۲) رسالۃ الغفران (۳) رسالۃ الملائکۃ [illegible]

ابوالعلاء المعری نے ملوک و رعیت قضاۃ و حکام فقراء و اغنیاء اشتراک و ڈیموکریسی، اہل افکار

صوفیاء، لغویین، فقہا، قرآء، محادثین، ادباء و خطباء، ارباب الحل والعقد اور نیز فلاسفہ و حکماء پر تنقید کا بیڑا اٹھایا ہے۔ مثلاً اس کی نظر میں ادباء کذب و بطلان کی طرف بلاتے ہیں اس کے نزدیک علماء و واعظین شکاری کا پھندا ہیں جو ملک میں لوگوں کو اپنے طویل خطبوں کے ذریعہ دام تزویر میں گرفتار کرکے دندناتے پھرتے ہیں معری فلاسفہ پر تنقید کرنے میں جس بیباکی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ اصلاح و معاشرہ کے علمبردار ہونے پر بین ثبوت ہے۔ اس کی نظر میں ان کے پاس کوئی یقینی و حتمی بات نہیں ہوتی ہے وہ یقین و اعتماد کے وصف سے محروم ہوتے ہیں بالخصوص دین کے مسائل مشاکل کی طرف انگشت نمائی کرتے ہیں۔ جن کا تعلق حشر و نشر سے ہے اور اس سلسلہ میں انکی آراء بہت مبہم و ناقص ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ معری نے اپنے اس دیوان میں جو عہد شباب کے بعد لکھا ہوا ہے بغیر کسی پس و پیش و تذبذب کے معاشرے میں رائج برُے خیالات پر تنقید کی ہے اور سماجی زندگی حکومت وقت اور اہل مذہب کو سدھارنے و سنوارنے میں خاموش مفکر سے لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ طرابلس، شام اور پھر بغداد کے علماء ادب فضلاء اور فلسفہ کے ماہرین سے یہ فیض حاصل کرلیا تو ایک طرف تو وہ دنیائے عرب میں عزت و توقیر اور شہرت و احترام کی شاہ راہ عام پر کھڑا ہوا لیکن دوسری طرف اپنے منثور اور منظوم سرمایوں میں کچھ ایسے افکار و خیالات کی تشہیر کی ہے جس کی روشنی میں اس اظہار حقیقت کا نوبت نہیں آتی کہ وہ ایک خاص فلسفۂ زندگی کا علمبردار تھا یہی وجہ تھی کہ اس فلسفۂ زندگی کے تحت تمام لذتوں سے دوری کو، قناعت پسند قرار دیتا تھا جائز نفسیاتی خواہشات کو مرجھا دیا تھا حیوان کا گوشت تر و تازہ دودھ وغیرہ سے پرہیز کرتا یہ تمام ثمرات تھے اس فلسفۂ زندگی کے جس کا عنوان عزلت نشینی تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت ہی معمولی چیزوں پر اکتفا کیا کھردرے لباس روئی ٹھنڈک میں۔ چین اور گرمی میں فرش ہی اثاثہ زندگی تھا۔ اس انقلاب کی وجہ اس کی زندگی میں پیش آمدہ سنگین و قلق انگیز واقعات کی فہرست میں سے ہر واقعہ اور ہر حادثہ اس کی عزلت نشینی و گمنامی و بے سروری کی زندگی کا موجب بن سکتا ہے۔

اس کے مذہبی تصورات سے قطع نظر اگر عربی زبان و ادب میں گرانقدر خدمات پر ... زبان اس اعتراف حقیقت سے چنداں گریز نہیں ہوگی کہ اسکی تحریریں

کے آئینہ میں ایک ماہر و مشاق نقاد یگانہ روزگار ادیب ایک بے مثال فلسفی اور اعلیٰ درجہ کے
ایک معلم اخلاق کے رخ زیبا کی جھلک نظر آتی ہے جو خود ابوالعلار کی ذات ہے۔

نثر ہو یا نظم دونوں صنفوں میں مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرکے اور حلقۂ شاگرداں
کے علمی کشکول کو بھر کر ایسا لائق تحسین و قابل فخر سرمایہ چھوڑا ہے جس کی عربی زبان ہمیشہ قدر داں
رہے گی۔ ۸۴ سال کی عمر میں فن و ادب کا یہ آفتاب غروب ہوا لیکن اس کی روشنی عربی زبان
کے قدر دانوں کو ہمیشہ ملتی رہے گی اور حقیقت تو یہ ہے کہ عربی زبان جب تک اس صفحۂ ہستی
پر زندہ رہے گی اس فرزند عزیز اور مایہ ناز ہستی کو فراموش نہ کیا جائے گا۔

اسلام کا نظامِ حکومت

جدید ایڈیشن

مؤلف مولانا حامد الانصاری غازی

اس کتاب میں اسلام کی ریاستِ عامہ کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطۂ حکومت
پیش کیا گیا ہے۔ یہ عظیم الشان تالیف اسلام کا نظام حکومت ہی نہیں پیش کرتی بلکہ نظم سیاست
و سلطنت کو بھی منظر عام لاتی ہے اور طرز تحریر زمانۂ حال کے تقاضوں کے ٹھیک ٹھیک
مطابق ہے۔

صدیوں سے جو غلط نظریے اسلام کی طرف منسوب ہوگئے ہیں انکی تردید کے لئے ایک
خاص اسلوب اختیار کیا گیا ہے یہ ہمارے لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے جو قانون قرآن، قانون نبوت
دستورِ صحابہ کے علاوہ اسلام کے علمار اجتماعیات کی بے شمار کتابوں اور عصر حاضر کے
نوشتوں کے مطالعہ اور سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد سامنے آئی ہے۔

صفحات ۴۶۴ بڑی تقطیع

قیمت: ۵۰/- روپے مجلد: ۷۰/- روپے

امیر خسرو ایک مختصر جائزہ

محمد ریاض الدین خاں ایم اے (ہسٹری) ایم-اے (سوسولوجی) ٹونک

امیر خسرو سلطان الشعراء اور برہان الفضلاء ہیں قوت ناطقہ ان کے کمالات کی توصیف بیان کے کمالات کی خوبیوں کے بیان سے قاصر ہے قلم ان کی صفات کو تحریر کرنے سے معذور ہے عربی و فارسی اور ہندی شعر گوئی میں یکتائے زمانہ ہوئے ہیں سرود اور قوالی کو ایجاد کیا جو اس سے پہلے نہ تھا شعرائے متقدمین و متاخرین میں ایسا صاحب قدرت نہ کوئی انکا ہمسر ہوا ہے نہ ہوگا خصوصاً صنائع شعر اور فن موسیقی میں کوئی ان جیسا یگانہ روزگار نہیں اور جتنی محبت شیخ المشائخ نظام الدین اولیاء خواجہ محبوب الٰہیؒ کو حضرت امیر خسرو سے تھی وہ کسی بھی اور مرید سے نہ تھی اکثر شیخ المشائخ خواجہ محبوب الٰہیؒ وہ رباعی جو خود انھوں نے موزوں فرمائی تھی امیر خسرو کے لئے فرمایا کرتے تھے۔

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست ملکیت ملک الشعراء خسرو راست

آں خسرو ماست ناصر خسرو نیست زیرا کہ خدائے ماست آں خسرو ماست

اپنے پیر و مرشد نظام الدینؒ اولیاء کے وصال کے چھ ماہ بعد ۱۸ شوال ۷۲۵ھ میں [illegible] کی طرف رحلت فرمائی۔ مدفن آپ کا اپنے پیر و مرشد کے روضۂ پر نور ہی میں ہے۔ [illegible] میں یہ سلطان غیاث الدین بلبن بادشاہ دہلی کے عہد حکومت میں ہوئے

[illegible] مصنف رائے چترمن کایستھ، مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرسنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک

ہیں اور موصوف نے چند اور دوسرے بادشاہوں سے ملاقات فرمائی ہے جنگ شہادت سلطان میں امیر خسروؒ اور امیر حسن دونوں قید مغول میں آئے تھے شیخ رکن الدین فریدی ابو الفتح بن صدرالدین عارف بن بہاؤالدین زکریا ملتانی مرشد شیخ جلال الدین مخدوم جہانیاں بڑے مرشد کے مرید اور بڑے پائے کے ولی تھے۔ شیخ المشائخ اولیاء بن سید احمد سلطان المشائخ نظام الدین خواجہ محبوب الٰہیؒ کے ہمعصر اور جلیس تھے۔ اور اکثر صحبتیں رہی تھیں۔ ایک روز خواجہ محبوب الٰہیؒ سلطان المشائخ اپنی خانقاہ میں تھے اور یہ خانقاہ عظیم گنج کی آبادی میں ہمایوں کے مقبرہ کے متصل ہے۔ سلطان المشائخ نے خواجہ نصیر الدین کو بھیجا کہ شیخ کی خبر لائیں۔ کہ وہ کس شغل میں مشغول ہیں۔ خواجہ نصیر الدینؒ اور امیر خسرو دونوں نے شیخ کو بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ دریا کے کنارہ خشکی پر بیٹھے ہوئے ایک مردہ گائے کے کیڑے بین بین کے کھا رہے ہیں۔ جب شیخ کی نظر ان کے دونوں بزرگوں پر پڑی دو مٹھیاں کیڑوں کی بھر کر ایک خواجہ نصیر الدینؒ کو اور دوسری امیر خسرو کو دی۔ خواجہ نصیر الدینؒ نے کراہیت نہ کرتے ہوئے عطائے شیخ کو اپنے منہ میں ڈال لیا۔ اور امیر خسروؒ اسی طرح ہاتھ میں لئے ہوئے سلطان المشائخ نظام الدینؒ خواجہ محبوب الٰہیؒ کے پاس لے آئے۔ اور شیخ کے احوال محبوب الٰہیؒ کو سنائے۔ کہ شیخ رکن الدین اس شغل میں مشغول تھے۔ اور انھوں نے ہم دونوں کو یہ کیڑے عنایت فرمائے۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ تم نے اس عنایت شیخ کا کیا کیا؟ خواجہ نصیر الدین نے کہا کہ میں نے وہ اسی جگہ کھا لیا۔ امیر خسرو نے کہا کہ میں حصہ لے آیا۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ ہاتھ (مٹھی) کھولو۔ امیر خسروؒ نے مٹھی کھولی تو دیکھا کہ تمام قسم کے میوے تھے۔ کیڑوں کا کہیں نشان نہ تھا۔ پھر سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء بن سید احمد خواجہ محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ حکم ولایت دہلی شیخ نصیر الدینؒ کو عطا کیا گیا میں چاہتا تھا کہ دہلی کی ولایت امیر خسرو کو ملے اگر وہ اس بیش بہا پاکیزہ کھانے میں سبقت کرتے۔

تبصرہ

اندلس کی اسلامی میراث

اسلام آباد کے سہ ماہی رسالہ فکر و نظر نے اندلس کی اسلامی میراث کے عنوان سے یہ خصوصی شمارہ نکال کر اردو میں اندلس کی تاریخ پر موجود کتابوں میں ایک اہم اضافہ کیا ہے خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ۹۰، صفحات پر مشتمل ایک ضخیم شمارہ بلا شبہ اس لائق ہے کہ ہر کتب خانہ اور تمام صاحب ذوق قارئین کے پاس موجود ہو۔ لطف یہ ہے کہ قیمت صرف ۰۰ ا روپے رکھی گئی ہے۔ جو پاکستان میں کتابوں کی قیمت کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

مسلم اندلس پر اس خصوصی اشاعت کو کئی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جیسے اندلس میں اسلام کی سرگذشت، تفسیر، حدیث، سیرت، فقہ، تاریخ، ادب، طب، فلسفہ و کلام تہذیب و ثقافت وغیرہ۔ ہر عنوان کے تحت، مختلف مقالات ہیں۔ جن میں موضوع پر کمل کر بحث کی گئی ہے۔ کچھ ایسے نئے عنوانات بھی دیکھنے میں آئے۔ جن پر اب تک اردو میں مواد نہ ہونے کے برابر تھا۔ مثلاً اندلس میں عربی نثر نگاری، سقوط اندلس پر شعرائے اندلس کی مرثیہ خوانی ـــــ کچھ عنوانات تو مرتبین کی ذاتی اپج اور وسعت خیالات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً سپین۔ اردو کے سفرناموں کے آئینہ میں۔ اندلس اور علامہ اقبال رسالہ فکر و نظر کی اس کاوش کی داد نہ دینا ظلم کے مترادف ہوگا۔ ایک ایسے موضوع کو جسے خود اسلامی دنیا فراموش کر چکی ہے اٹھا کر اتنا مواد جمع کر دینا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ اتنے بڑے کام میں اگر کہیں بھول چوک ہوتی ہے تو قابل معافی ہے۔

برصغیر میں۔ جو کچھ اہتمام بالشان نمبر نکالنے کا منصوبہ بنائے، وہ کم از کم دو نمبروں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ایک تو نیاز فتحپوری کے نگار کے خصوصی شمارے، دوسرے پاکستان میں ماہنامہ نقوش کے خصوصی نمبر۔ نیاز فتحپوری نے فرماں روایان اسلام نمبر نکالا۔ یہ ایک

طرح سے ۷۸۱ سو برس کی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ ہے۔ اس کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ اسی طرح نقوش کا شخصیات نمبر ہے۔ جس میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش مشکل سے ملے گی۔ اُندلس پر خصوصی شمارہ کی اشاعت کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو اندلس کی مجموعی تاریخ پر نگاہ رکھتی ہو، فکر و نظر نے اپنے شمارہ میں جن مضمون نگاروں کے مضامین دئے ہیں۔ وہ کسی ایک یا دوسرے زاویہ سے اندلس کی تاریخ کو دیکھ رہے ہیں۔ اس میں کلی نقطۂ نظر مفقود ہے۔ اس خصوصی شمارہ پر اتنی لاگت لگائی گئی ہے۔ اس سے کم از کم اتنا تو فائدہ ہونا چاہیئے تھا۔ کہ یہ خصوصی شمارہ ایک تاریخی دستاویز بن جاتا۔ اور بعد میں آنے والوں کے کام آتا۔ بلاشبہ کئی عنوانات چونکا دینے والے ہیں، مثلاً سقوطِ اُندلس پر شعرائے اندلس کی مرثیہ خوانی اور اسپین۔ اردو کے سفرناموں کے آئینہ میں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سقوطِ غرناطہ کی کیفیت اور مفصل تاریخ سے یہ خصوصی اشاعت خالی ہے۔ مرتبین کے سامنے اندلس پر نواب ذوالقدر جنگ کی کتاب بھی ہے۔ کیا اس سے غرناطہ کی حوالگی کی تفصیل نہیں دی جا سکتی تھی۔ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کے آخری حکمراں ابو عبد اللہ نے ملکہ ازابلا اور شاہ فرڈی نینڈ کو شہر غرناطہ کی کنجیاں حوالہ کی تھیں شہر ایک معاہدہ کے تحت حوالہ کیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ پورا نقل کیا جانا چاہیئے تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال (حصہ دوم ۱۹۲۷ء) میں ایک طویل مضمون ابو عبد اللہ اور اسکی باقیات پر دیا ہے۔ یقینی طور پر اس کی شمولیت سے اس خصوصی اشاعت کی اہمیت میں اضافہ ہوتا۔

اسپین اور پرتگال پہلے دو ملک نہیں تھے۔ ایک ہی ملک تھا۔ لیکن یہ کب سے دو ہوئے۔ اور وہاں کی عیسائی امارتوں کا سلسلہ کب سے کب تک چلا۔ اس کی کوئی تفصیل کسی بھی مضمون میں موجود نہیں ۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود کا مقالہ "اسپین میں اسلام کی سرگذشت" خاصہ کی چیز ہے، لیکن تشنہ ہے۔ اُندلس کا نقشہ دینا ضروری تھا۔ اسی طرح مسجد قرطبہ کی واگذاری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حکومت سعودی عرب کی کوششوں سے مسجد قرطبہ واگذار کر دی گئی ہے۔ اور وہاں ایک اسلامی سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ جنوبی فرانس پر بھی عربوں نے حملے کئے تھے۔ ان کی تفصیل الگ ہونی چاہیئے تھی۔ علامہ شکیب ارسلان

(باقی صـ۳۶ پر)

وفیات

آہ! ناز انصاری

کچھ ہستیاں، جنہیں ہم مسلسل دیکھتے رہے ہیں، لازوال معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ بھی فنا پذیر ہیں اور ایک دن ان کی موت کا غم سہنا ہوگا۔ اس دنیا کی ہر چیز فنا پذیر ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کو ہمہ وقت پیش نظر رکھے تو شاید موت کا غم آسان ہو جائے۔

سرکردہ جرنلسٹ اعجاز احمد ناز انصاری بھی ان ہی ہستیوں میں سے تھے جن کے بارے میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ایک دن ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ لیکن "کل من علیہا فان" کے مصداق اس دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے۔ حج کے دوران میں میدان عرفات میں ناز انصاری کی رحلت کی خبر بذریعہ فون یہاں دہلی میں اہل خانہ کو ملی۔ اہل خانہ سے حکومت سعودی عرب نے تدفین کے متعلق پوچھا تھا۔ اہل خانہ نے وہیں مکہ معظمہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں تدفین کی اجازت دیدی۔ مرحوم حج پر جانے سے پہلے وصیت بھی کر گئے تھے کہ موت ہو جانے کی صورت میں انہیں وہیں دفن کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کی یہ دعا یا تمنا بھی پوری کر دی ان کے پسماندگان میں بیوہ، چار لڑکیاں اور چار داماد ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اردو صحافت میں ناز انصاری کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ عہد جوانی ہی سے انہیں اخبار نویسی کا شوق تھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں ریلوے کی نوکری چھوڑ کر صحافت میں آئے۔ اور روزنامہ اخبار انصاری سے اپنے صحافتی کیریر کا آغاز کیا، اس کے بعد وہ متعدد روزناموں اور ہفت روزہ اخبارات میں کام کرتے رہے۔ الجمعیت، نئی دنیا، پیام مشرق، مشرقی آواز اور تیج میں باقاعدہ ملازمت کرتے رہے۔ الجمعیتہ کے چیف ایڈیٹر کے عہدہ تک پہونچے۔ ان کے علاوہ کئی ہفت روزہ اور ماہناموں میں مستقل طور پر کالم لکھتے رہے۔ اخیر عمر میں

اپنا روزنامہ انتباہ نکالا تھا۔ جو ابھی تک جاری ہے۔ صحافت میں ناز انصاری کی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں۔ انہوں نے ایسے وقت میں اپنے قلم سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی۔ جب ہندوستان میں ان کا سیاسی اور ملی وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور میں، اور اس کے بعد کی خوف، بے اعتمادی اور مایوسی کی دو دہائیوں میں ان کی انقلابی تحریروں نے مسلمانوں کے تن مردہ میں جان ڈالی اور انہیں پھر سے جینے کا حوصلہ دیا۔ وہ پکے نیشنلسٹ تھے اپنے نظریات کے بارے میں انہوں نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ وہ کسی بھی وقت کسی اہم مسئلہ پر صلاح مشورہ کے لیے ان کی خدمت میں آجایا کرتے تھے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں درجات عطا کرے۔ آمین۔

بقیہ : تبصرہ

نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

ایسکوریال کی خانقاہ سے مسلم اندلس کا جو علمی ذخیرہ ہاتھ آیا۔ کیا وہ الگ عنوان کے تحت محتاج بیان نہیں تھا۔ اسی طرح یہ خصوصی اشاعت "السید" (ALSiD) کے بارے میں خاموش ہے۔ یہ ایک ہیرو شخصیت تھی، جسے اسپین کے رجزیہ اشعار میں آج تک یاد کیا جاتا ہے۔

ان کوتاہیوں کے باوجود یہ خصوصی شمارہ اس لائق ہے کہ ہر لائبریری اور ہر صاحب ذوق کے ذاتی کتب خانہ میں ہو۔ (ادارہ)

برہان

جلد ۱۱۵	اگست ۱۹۹۲ء مطابق صفر ۱۴۱۳ھ	شمارہ ۲

عمیدالرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپواکر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا۔

نظرات

بابری مسجد کا تنازعہ

اگر کسی مسئلہ کو حل کرنے کی خواہش ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ حل نہ ہو۔ لیکن اگر نیت خراب ہو اور قدم قدم پر سیاسی وغیر سیاسی اغراض سامنے آتی ہوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی۔ بابری مسجد کے تنازعہ کو موجودہ مرحلہ تک پہونچانے میں جہاں بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل جیسی فرقہ پرست پارٹیوں کا ہاتھ ہے۔ وہاں اس تنازعہ کو غیر معمولی طور پر تاخیر میں ڈالنے کی ذمہ داری حکومت پر بھی آتی ہے۔ خواہ یہ حکومت کانگریس کی رہی ہو یا غیر کانگریسی۔ اگر فرقہ پرست سیاسی پارٹیوں نے رام مندر کی آڑ میں سیاسی فائدے حاصل کئے ہیں تو دوسری سیاسی پارٹیوں نے بھی سیاسی مصلحتوں پر حق و انصاف کو بھینٹ چڑھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے رام مندر کے نام پر ووٹ مانگے تھے۔ کچھ صوبوں میں اسے نمایاں کامیابی ملی۔ اس سے پارٹی کا حوصلہ اور بڑھا۔ اور ایک لمحہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے سیکولر سیاسی ڈھانچہ کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ۹ جولائی کو جب ایودھیا میں بھاجپا سرکار کی نگرانی میں وشو ہندو پریشد نے متنازعہ جگہ پر کارسیوا کے نام پر تعمیر کا کام شروع کیا تو ساری سیکولر سیاسی پارٹیاں چونک اٹھیں اور انہوں نے پارلیمنٹ میں کئی دن تک کارروائی محض اس لئے نہ چلنے دی کہ اس سلسلہ میں حکومت واضح بیان دے۔ تین دن تک وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ ایوان میں نہ آئے۔ وزیر داخلہ مسٹر چوہان اور وزیر مملکت مسٹر جیکب جواب دیتے رہے۔ خود کانگریس بطور پارٹی گوگو میں مبتلا ہو گئی، اور کوئی واضح بیان نہ دے سکی۔ ادھر جب الہ آباد ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے ایودھیا میں متنازعہ جگہ پر کارسیوا کے نام پر تعمیر روک دینے کا حکم دیا تو اس کی پروا کئے بغیر وشو ہندو پریشد اور اس کے ہزاروں کارسیوکوں نے تعمیری کام جاری رکھا۔ اب معاملہ صرف متنازعہ جگہ پر رام کی تعمیر کا نہ تھا۔ بلکہ توہین عدالت کا بھی علانیہ ارتکاب ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ

قوتوں نے ایک طرف ہمارے سیاسی نظام کو اور دوسری طرف عدالتی نظام کو چیلنج کیا تھا۔ مرکز نے اس خطرہ کو بروقت محسوس نہیں کیا اور اس معاملہ میں نرسمہاراؤ ایک کمزور حکمراں ثابت ہوئے وزیرداخلہ مسٹر چوہان بیانات ضرور دیتے رہے۔ اور مرکز کی طرف سے ایکشن کا بھی اشارہ کیا۔ لیکن افسوس کہ مرکز کی طرف سے کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ ایودھیا میں علانیہ عدالتی احکام کی توہین کی جارہی تھی۔ اور مرکز خاموش تماشائی بنا رہا۔ مرکز کا جواب یہ تھا کہ عدالتی احکام کی تکمیل کرنے کی ہدایت یوپی کی کلیان سنگھ سرکار کو ــــــ دیدی گئی ہے۔ کلیان سنگھ کا کہنا یہ تھا کہ ضلع مجسٹریٹ کو کارسیوا بند کر دینے کی ہدایت دیدی گئی ہے۔ ضلع مجسٹریٹ نے معذوری ظاہر کی کہ کارسیوا روکنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایودھیا میں کئی دن تک اسی طرح قانون کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ اور نہ صرف ہندوستان، بلکہ ساری دنیا اسے دیکھتی رہی۔ تعمیر جاری رہی۔ جب متنازعہ جگہ پر کنکریٹ کا ایک مکمل چبوترہ تیار ہوگیا تو حکومت جاگی۔ یہ چبوترہ ایسا لگتا ہے کہ رام مندر کی کرسی ہے اس پر مندر تعمیر کیا جائے گا۔ بہرحال وزیراعظم مسٹر نرسمہاراؤ نے مداخلت کی۔ اور خود ایودھیا کے سادھوسنتوں کے ساتھ بات چیت کی پیش کش کی۔ ان کا ایک وفد وزیراعظم سے ملنے دلی آیا۔ انہوں نے تین ماہ تک کارسیوا روکنے کی وزیراعظم کی اپیل مان لی۔ اس تین ماہ کی مدت میں وزیراعظم گفت وشنید سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ادھر سپریم کورٹ نے رجسٹرار کی سرکردگی میں ایک تین رکنی اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی مقرر کردی ہے۔ جو متنازعہ جگہ پر معائنہ کرکے نئی تعمیر کی نوعیت، وسعت اور دیگر امور کے بارے میں سپریم کورٹ کو اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔

اس معاملہ میں ہم جہاں سیکولر سیاسی پارٹیوں لیفٹ فرنٹ اور جنتادل کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ایودھیا کے تنازعہ میں انہوں نے فرقہ پرست پارٹیوں کا چیلنج قبول کیا۔ وہاں ہم وزیراعظم مسٹر نرسمہاراؤ کی بھی تعریف کریں گے کہ انہوں نے مسئلہ کو غیر جذباتی انداز میں حل کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یہ وقت بتلائے گا کہ وہ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں گے۔ مرکزی سرکار کا فرض بنتا ہے کہ وہ ملک کے سیکولر سیاسی ڈھانچہ کی حفاظت کرے۔ اور فرقہ پرستوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے۔

عراق پر دباؤ

اگرچہ عراق خلیجی جنگ میں ہار گیا۔ اور اسے اقوام متحدہ کے فیصلوں پر عملدرآمد کا عہد کرنا پڑا۔ پھر بھی امریکہ اور اس کے حلیف ممالک اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ اقوام متحدہ کے فیصلوں کے تحت عراق کی اقتصادی ناکہ بندی جاری ہے۔ اسے اپنا تیل بیچنے کی اجازت نہیں اسے بھاری رقم تاوان جنگ کے طور پر ادا کرنا ہے۔ اپنے مہلک اسلحہ تلف کرنے ہیں۔ حال ہی میں اقوام متحدہ کی ایک ٹیم جب اسلحہ کا پتہ لگانے کے لئے بغداد پہونچی تو اس پر جھگڑا پیدا ہوگیا۔ بغداد کی شرط یہ تھی کہ اس ٹیم میں کوئی امریکی یا مقامی آدمی نہیں ہوگا۔ اقوام متحدہ کو ان کی یہ شرط ماننی پڑی۔ اس ٹیم کا اصرار تھا کہ عراق اپنی وزارت زراعت کا معائنہ کرنے دے۔ شبہ تھا کہ وہاں عراق نے کچھ دستاویزات یا اسلحہ چھپا رکھے ہیں۔ یہ شبہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ خود ٹیم نے اعتراف کیا کہ اسے وہاں تلاشی میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملی۔ پھر دوسری ٹیم کا مرحلہ آیا۔ اس میں بھی کئی انسپکٹر ہیں۔ ادھر عراق نے یہ اعلان کر دیا کہ کسی بھی ٹیم کو وزارتوں کا معائنہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس پر کشیدگی پیدا ہو گئی ہے ـــــ ہماری رائے یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی ٹیم اس سے کچھ زیادہ ہی کارگذاری دکھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جتنی کارگزاری اس کے سپرد کی گئی ہے۔ اور یہ محض امریکی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ اقوام متحدہ اب ممالک کی تنظیم نہیں رہی ہے۔ بلکہ امریکہ کا ایک ادارہ ہو گیا ہے۔ یہ امریکی مفادات کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

عراق نے اعلان کیا ہے کہ وہ کویت کے علاقوں پر سے اپنے دعوے سے دست بردار نہیں ہوا۔ البتہ کویت کو بطور ملک تسلیم کرتا ہے۔ عراق کے اس رویہ میں تبدیلی ایک اچھی علامت ہے۔ جہاں تک سرحدوں کا معاملہ ہے۔ اس کا فیصلہ باہمی بات چیت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اقوام متحدہ کو ایسی تدابیر اپنانی چاہئیں کہ پھر عراق اور کویت کا کوئی تصادم نہ ہو۔ اس کا راستہ یہ ہے کہ علاقائی تنازعہ کو حل کیا جائے۔ اسی صورت میں اس خطہ میں دیرپا امن قائم ہو سکتا ہے۔

بوسنیا کے مسلمان

سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد یوگوسلاویہ کا وفاق بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے کئی صوبے آزاد یا نیم آزاد ہوگئے یہ خانہ جنگی میں مبتلا ہیں۔ اس کے ایک علاقہ بوسنیا و ہرزیگووینا میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ علاقہ سربیا کے تحت آتا ہے۔ اس وقت سربیا کے باشندے اور فوج ان مسلمانوں کو نشانہ ستم بنا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے یوگوسلاویہ میں امن فوج بھی بھیجی ہے۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل مسٹر غالی کی سفارش پر اس فوج میں اضافہ بھی کیا جا رہا ہے۔ لیکن یوگوسلاویہ کی اس خانہ جنگی کو بند کرانے میں اقوام متحدہ کہاں تک کامیاب رہتی ہے۔ اقوام متحدہ کو پیش کردہ ایک حالیہ یادداشت میں کہا ہے کہ سربیا کے علاقہ بوسنیا اور ہرزیگووینا میں مسلمانوں کو سرسری عدالتی کارروائی کے بعد پھانسیاں دینے کے کئی کیس منظر عام پر آئے ہیں، امن فوج نے اپنے ہیڈکوارٹرز اقوام متحدہ میں رپورٹ بھیجی تاکہ سیکورٹی کونسل اس پر غور کرے۔ اس یادداشت کی نقلیں بوسنیا کے سفیر محمد شاکر بے نے اقوام متحدہ میں تقسیم کیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پھانسیوں کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ سربیا اس علاقہ سے مسلمانوں کا صفایا کرنے کی اپنی مہم میں لگا ہوا ہے۔ بوسنیا میں جو مظالم ہو رہے ہیں۔ ان میں مکانات کو نذر آتش کرنا، علاقہ بدر کرنا، سرسری کارروائی کے بعد پھانسی دیدینا اور مکانات کے اندر گولیاں چلانا شامل ہے۔

بوسنیا کے مسلمانوں پر ان مظالم کے خلاف جدّہ کی اسلامی کانفرنس، ایران اور دوسرے ممالک نے بھی آوازیں اٹھائی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ترکی بھی ان مسلمانوں کی بے چینی اور پریشانی محسوس کرے۔ اس کی سرحد یوگوسلاویہ سے ملتی ہے۔ یوگوسلاویہ کے یہ حصے پہلے ترکی کی سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے۔ صدیوں تک ترکوں کی حکومت یہاں رہی ہے۔ یقینی طور پر ترکی کی آواز موثر ہوگی۔ اقوام متحدہ کو بھی اپنی کارروائی بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مغل شہنشاہوں کی ولادت، سال جلوس اور وفات کے قطعات

دوسری اور آخری قسط

جناب عبدالرؤف خاں صاحب اودے پور راجستھان

ملک الشعراء ابوطالب کلیم کاشانی نے اس حادثۂ جانکاہ پہ ایک پر اثر پانچ شعری قطعہ بھی کہا :

گوہرے ارجمند از کفِ شاہ — رفتہ کز دیدہ خوں نمی بندد
حاصل ہر دو کون شاہ جہاں — بدہد گر بسلک پیوندد
رختِ گلگوں شفق نمی پوشد — کہ بہر جز سیاہ نپسندد
آسماں برسرازمہ و خورشید — چہرۂ زرد گر نمی بندد

گشت تاریخ ایں مصیبتِ عام
"صبحدم زیں الم نمی خندد"[۱] ۱۰۴۰ھ
۶۵۸ + ۱۰۰ + ۷۱ + ۶۷ + ۱۴۴

شب دوشنبہ ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ م ۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء کو شاہ جہاں نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی۔ مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴-۱۷۲۰ء) نے، جبکہ اس (بیدل) کی عمر صرف بائیس سال کے قریب تھی، شاہ جہاں کی وفات پر نہایت پُر درد تاریخی مرثیہ کہا کیونکہ بقول ڈاکٹر کبیر احمد جائسی صاحب" بیدل کو شاہ جہاں سے والہانہ عقیدت تھی، وہ شاہ جہاں کو صرف ایک بادشاہ ہی نہیں بلکہ ایک اچھا انسان بھی سمجھتے تھے، اور اس کی موت کو ایک عہد کا خاتمہ ... بیدل نے جو مرثیہ کہا اس کا ایک ایک شعر ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے :

یاد آں موسم کی بی دہم بہار و فصل دی — داشت بیناے فلک جام طرب لبریزِ می

۱۔ ملاحظہ ہو مقالہ سابق الذکر ص ۱۰۶

انجمن تازاں چمن خنداں طراوت گل فشاں — شاخ گل رقاص و بلبل بستہ در منقار نی

دور سعدش بود و عہد امن و ایام شریف — خلق در حمد خدا، از عدل شاہ نیک پی

شاہ شاہان جہاں، شاہجہاں کز شوکتش — تاج بر خاک او فگندی کسری و کاوس و کی

از زمیں تا آسماں شہباز عکسش کردہ صید — رخش فرمانش، ز مشرق تا بہ مغرب کردہ طی

دست جودی داشت، چوں موسیٰ ولی بیضا فشاں — تیغ عدل، پائے ظلمت کردہ چوں خورشید پی

کوہ در فکر وقارش بستہ خوں در دل ز لعل — بحر از شرم عطایائش زگوہر کردہ خوی

کامراں شاہی چو او نگذشتہ در اقلیم دہر — کمترین چاکرانش بادشاہ مصر و ری

تا جہت رفعت آں شہ قدسی فغاں بر قصر عرش — سوی اصل خویش می باشد رجوع کل شیٔ

بہر تاریخ وصالش از خرد کردم سوال

گفت بیدلؔ بر سریر قرب یزداں جای وی[۱] ۱۰۷۶ھ

۱۶+۱۴+۷۲+۳۰۲+۴۷۰+۲۰۲

اشرف خاں نے "رضی اللہ" سے سال وفات شاہ جہاں برآمد کیا اور اس مادہ کو اس طرح شعری جامہ پہنایا:

سال تاریخ فوت شاہ جہاں

"رضی اللہ" گفت اشرف خاں[۲]

۱۰۷۶ھ

کسی اور نکتہ سنج نے "شاہ جہاں کرد وفات[۳]" سے ۱۰۷۶ برآمد کیا۔

شہزادہ اورنگ زیب نے شب یکشنبہ ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ م ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو بمقام دوحد نزد اجین بکتم عدم سے عالم وجود میں قدم رکھا۔ جہانگیر نے اس مولود مسعود کا نام "اورنگ زیب" رکھا، گویا اسی وقت قضاء و قدر کے کارکنوں نے خود دادا کے منہ سے اس پیش گوئی کو ظاہر کردیا جو چالیس سال بعد پوری ہونے والی تھی۔ اجین پہونچکر شہنشاہ جہانگیر نے اس خوشی میں جشن منایا۔ ابوطالب کلیم

۱۔ مقالہ "بیدل، شخصیت اور ماحول" از ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (علیگ) ریڈر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر، مشمولہ ماہنامہ جامعہ نئی دہلی ص ۱۰ و ۱۱ بابت جنوری ۱۹۸۲ء۔

۲۔ مقالہ اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں، از محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب کاظمی مشمولہ ماہنامہ معارف بابت مارچ ۱۹۸۹ء ص ۱۸۸ قسط ۲۔

۳۔ دیکھئے مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی ص ۱۲۰ سنہ طباعت ندارد۔

نے قطعۂ تاریخ ولادت موزوں کیا:

دادا یزد بپادشاہ جہاں — خلفے ہمچو مہر عالمتاب
تاج صاحبقران ثانی یافت — گوہر بحر ازو گرفتہ حساب
نامش اورنگ زیب کرد فلک — تخت از یمن پایہ گشتہ تخم جناب
چوں بآں خردہ آفتاب انداخت — افسر خویش بر ہوا چو حباب

خامہ از بہر سال تاریخش
زد رقم "آفتاب عالمتاب"[1] — ۱۰۲۸ = ۱۰۲۷ھ
۲۰۰+۱۳۱+۶۹۴

یہ مادۂ تاریخ "آفتاب عالمتاب" تعمیہ (تخرجہ) کے ساتھ کہا گیا ہے۔ اس سے ۱۰۲۸ کا عدد مستخرج ہوتا ہے جبکہ حضرت اورنگ زیب کی ولادت کا سال ۱۰۲۷ھ ہے چنانچہ کلیم نے چوتھے شعر میں آفتاب کے اپنے تاج (افسر یعنی پہلے حرف "الف") کو ہوا میں گرا دینے کی بات کہکر ۱۰۲۸ میں سے الف کے ایک عدد کے اسقاط کی جانب اشارہ کیا ہے[2]:

اورنگ زیب کی رسم تخت نشینی جنگِ برادران کے سبب دو دفعہ عمل میں آئی پہلی دفعہ یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ م ۲۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو شالامار باغ دہلی میں سرسری طور سے تخت نشینی کے مراسم ادا کئے۔ اس موقعے پر بہت سے باکمال لوگوں نے قطعات تہنیت اور تاریخیں کہیں۔ ان تاریخوں میں حیرت انگیز اور بے مثال تاریخ جسے پیش آمدہ واقعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا سید عبدالرشید ٹھٹھوی نے سورۃ نساء کی آیت کریمہ نمبر ۵۹:

اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (۹۷+۶۶+۶۶+۹۷، ۶۶۳۲، ۴۷+۲، ۲۲+۲، ۱۵۰) سے (۱۰۶۸ھ) برآمد کی۔ ایسے الہامی تاریخ کہیں تو بے جا نہ ہوگا[3] کسی صاحب فہم نے "سزاوار سریرِ پادشاہی" جیسے بلیغ الفاظ سے ۱۰۶۸ء برآمد کیا[4] خود اورنگ زیب نے اپنے مادۂ ولادت "آفتاب عالمتاب" کے آخر میں لفظ "میم" کا اضافہ کرکے "آفتاب عالمتابم" سے مذکورہ

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۲۰ و ۱۲۱ [2] تا [4] کے لئے دیکھئے پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب کا مقالہ "اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں" مشمولہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ فروری ۱۹۸۹ء ص ۱۰۳ تا ۱۱۲۔

سنِ جلوس برآمد کیا۔

اورنگ زیب جب جنگ کھجوا سے دو دو ہاتھ کر کے فتح مند و کامراں ہو چکا تو اس کا جشن جلوس ثانی ۲۴ رمضان ۱۰۶۹ھ مطابق ۵ جون ۱۶۵۹ء کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا اس تقریب کی تاریخ ملا عزیز اللہ پسر ملا تقی اصفہانی نے آیت کریمہ "اِنَّ المُلکَ لِلّٰہِ یُوتِیہِ مَن یَّشَاءُ"[1] (ملک اللہ کا ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے) سے ۱۰۶۹ھ برآمد کیا اور اسوقت سے وہ "ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" کہلانے لگا۔ مذکورہ مادہ کے علاوہ دیگر نکتہ سنجوں نے بھی مادے برآمد کئے مثلاً ایک صاحب نے "بادشاہِ ملکِ ہفت اقلیم"[2] سے مطلوبہ اعداد برآمد کئے نیز ایک دیگر سخن سنج نے "آفتاب ملک احساں سایۂ رحمٰن"[3] سے مکمل اعداد مستخرج کئے۔ دارا شکوہ اور شہزادی جہاں آرا بیگم کے پیرو مرشد حضرت شاہ محمد المعروف مُلّا شاہ قادری بدخشی متوفی ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء نے "ظل الحق" سے سال برآمد کر کے اسے رباعی میں موزوں کیا اور عالمگیری بارگاہ میں بھیجا۔

صبحے دلِ من چوں گلِ خورشید شگفت   کآمد حق و غبارِ باطل رفت

تاریخ جلوسِ شاہِ حق آگہ را

ظل الحق گفت، الحق ایں را حق گفت[4]

پروفیسر مصطفیٰ احسن علوی کاکوروی دانش گاہ لکھنؤ نے تیسرے مصرعے میں "شاہِ حق آگہ" کی بجائے "شاہ اورنگ" رقم فرمایا ہے[5]

اس اعتبار سے دودمان گورگان و پروانۂ توحید اورنگ زیب اعظم جو درصفِ شاہنشاہاں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب کا مقالہ "اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں" مشمولہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ فروری ۱۹۸۵ء ص ۱۰۳ تا ۱۱۲۔

[2] ملاحظہ ہو مقالہ "ابجد شمار" قسط نمبر ۲ از جناب سید محمد صاحب مشمولہ ماہنامہ آجکل نئی دہلی بابت جنوری ۱۹۸۲ء ص ۲۲

[3] روڈ کوثر ص ۲۴۳ مطبوعہ ۱۹۸۰ء نئی دہلی۔ [5] دیکھئے مقالہ "دربار عالمگیری" قسط نمبر ۱ مشمولہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ص ۱۳ بابت مئی ۱۹۹۱ء۔ [4] حضرت ملا شاہ بدخشی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات "داد ملا شاہ در توحید جان" ([illegible]) ہے۔

[6] مولانا ظفر علی خاں فرماتے ہیں: "وہ سلطنت ہوئی کیا ہندوستان میں جس کی اورنگ زیب اعظم تھا آخری شمع۔" ملاحظہ ہو نگارستان ص ۱۰۳۔

یکتا ہے اور مغل خانوادہ کے شموس ستہ کا آخری شمس درخشاں تھا کی روح پُر فتوح نے نوے سال کی عمر میں آرزو کے مطابق بروز جمعہ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ معادل ۲۱ فروری ۱۷۰۷ء تسبیح وتہلیل میں مصروفیت کے عالم میں بعد از نماز فجر ایک پہر دن گذرنے کے بعد بمقام احمد نگر روضۂ جنت کی راہ لی اور سلطنت وملتِ اسلامیۂ ہندیہ کی اس آخری نشانی کے جسدِ خاکی کو حسب وصیت خلد آباد میں سرگروہ اربابِ یقین حضرت شیخ زین الدینؒ کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا۔ کسی تاریخ گو نے آیت کریمہ: روح وریحان وجنت نعیم[1] ۱۱۱۸ھ

۱۱۰+۳۵۴+۶+۲۶۹+۶+۲۱۴

سے بشارت آمیز تاریخ دریافت کی، نیز دیگر تاریخ گو کے ذہن رسا نے "دخل الجنت"[2] سے مطلوبہ سنہ رحلت برآمد کیا۔

سید میر جعفر زٹلی نارنولی نے جو عہد اورنگ زیب کا نہایت منہ پھٹ اور بیباک شاعر تھا۔ بادشاہ کی وفات پر بہترین مادہ: بادشاہ بہشت از نیکی[3] ۱۱۱۸ھ

۹۰+۸+۷۰۷+۳۱۳

برآمد کیا۔ اورنگ زیب کی وفات پر اس نے جو اشعار لکھے وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے جو اس کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے ؎

کہاں پائیں گے ایسا شہنشاہ　　مکمل اکمل وکامل دل آگاہ[4]

"یہ آفتاب عالمتاب (بزیادت یک عدد) ۱۰۲۷ھ میں طلوع ہوا۔ چالیس سال تک شاہجہانی دور کو اپنے تابناک کارناموں سے روشن کرنے کے بعد یہ استحقاق پیدا کیا کہ آفتاب عالمتاب ہم (سال جلوس اول پر خود کہا ہوا مادہ جس سے ۱۰۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں) کہہ سکے۔ پھر پچاس سال دو ماہ انیس دن شاہان تیموریہ ہند کا "(آفتاب عالمتاب مُرد)[5]" مادہ سال وفات ۱۱۱۸ھ)

۹۰+۵۴۴+۴۸۴

---

[1] پروفیسر عبدالرب عرفان صاحب کا مقالہ مذکورہ قسط ۳ معارف اپریل ۸۹ء ص ۲۹۹

[2] مقالہ "رام نارائن حاجی پوری عہد عالمگیری کا ایک فارسی انشار پرداز" از جناب رضوان اللہ آروی مطبوعہ ماہنامہ جامعہ بابت جولائی ۱۹۸۸ء ص ۴۹ [3] مفاوضۂ گرامی پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب مکتوبہ ۲۳ مئی ۱۹۸۹ء بنام راقم الحروف [4] دیکھئے مقالہ عہد اورنگ زیب، کلیات میر جعفر زٹلی کی روشنی میں از ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین ریڈر شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی مشمولہ ماہنامہ جامعہ نومبر ۱۹۹۰ء ص ۴۳۔

[5] رجوع کیجئے تاریخ داستان اردو از پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم ص ۴۹۲ حاشیہ ص ۲۳۲ مطبوعہ ۱۹۵۷ء

ضیا پاش رہکر غروب ہوگیا۔ چنانچہ میر عبدالجلیل بلگرامی نے اس آفتاب عالمتاب کے غروب کی تاریخ:

بی آفتاب عالمتاب ۱۱۱۸ھ

سے برآمد کی بلے اسی موقع پر میرزا فرالدین محمد حاجی نعمت خان عالی (پسر حکیم فتح الدین شیرازی) جو اپنے عہد کے مشہور حکیم تھے (المخاطب مقرب خان و دانشمند خاں نے بھی چند رباعیاں موزوں کیں جن میں یوم وفات، وقت ارتحال و ماہ تاریخ انتقال، مدت حکومت و حیات مستعار کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ جنہیں یہاں محترم ڈاکٹر عبدالرب عرفان صاحب کے ترجمے کے ساتھ (لعینہٖ) نقل کیا جاتا ہے ا۔

آں جمعہ کہ مُرد پادشاہ اول چاشت　　　چوں سینۂ اطفال چہ تلخیہا داشت
ذوالقعدکہ ایما بہ نشستن وار د　　　ایں طرفہ از روی زمینش برداشت

(یعنی) وہ جمعہ جس کے وقت چاشت کی ابتدائی گھڑیوں میں بادشاہ نے وفات پائی بچوں کے سینوں کی طرح کتنی تلخیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ ماہ ذوالقعدہ جس میں (بلحاظ معنی) بیٹھنے کا اشارہ پایا جاتا ہے (قعدو بمعنی بیٹھنا) عجیب بات ہے کہ اس نے انہیں زمین (مراد دنیا) ہی سے اٹھالیا۔

آں شاہ کہ بیاد حق گذشت اوقاتش　　　خالی ز عبادت نشدی ساعاتش
چوں بیست و ہشت روز بگذشت ز ماہ　　　از صفحۂ روزگار حک شد ذاتش

(یعنی) وہ بادشاہ جس کے اوقات خدا کی یاد میں گزرے اور جس کی ساعتیں عبادت سے خالی نہیں ہوتی تھیں جب مہینے کے اٹھائیس روز گذر گئے (شاعر نے وفات کے دن کو بھی شمار کر لیا۔ چونکہ اٹھائیسواں دن گزرا نہیں تھا گذر رہا تھا اس لئے اس کے لئے فعل گذشت محل نظر ہے بیست و ہفت ہوتا تو مناسب تھا ج م ا) تو زمانے کے صفحے سے اسکی ذات محو ہوگئی (حک کے معنی کھرچ کر مٹانے کے ہیں چونکہ لفظی ترجمہ سوئے ادب ہوتا اس لئے اس لئے اس کا ترجمہ محو کیا گیا ہے ۔ ج م ا)

آں شاہ کہ دائم عَلَم فتح افراشت　　　چوں گشت نود سالہ جہاں را بگذاشت

لے ڈھلتی ہوئی چھاؤں، سایۂ زوال آفتاب ۱۲۔

ے مقالہ ڈاکٹر عبدالرب عرفان بابت اپریل ۱۹۸۹ء ص ۲۹۹ و ۳۰۰ -

در ہر کاغذ چو صاد میکرد رقم ۔ بر نسخۂ عمر او خدا صاد گذاشت

(یعنی) وہ بادشاہ جس نے ہمیشہ فتح کا جھنڈا بلند کیا جب نوّے سال کا ہوا تو دنیا چھوڑ گیا، چونکہ ہر کاغذ پر وہ صاد (آدھا صاد "ص" جو کسی بات کے صحیح ہونے کی علامت کے طور پر لکھا جاتا ہے) تحریر کر دیتا تھا (اس لئے) اس کے نسخۂ عمر (نوشتۂ عمر) پر خدا نے بھی صاد ثبت کر دیا۔ (واضح ہو کہ حساب جمل میں "ص" کے عدد نوّے ہوتے ہیں اور نوّے سال ہی کی بادشاہ کی عمر ہوئی تھی۔ عدد مقفلہ)

آں شاہ کز و نظام دنیا آمد ۔ تدبیر اتش تمام بر جا آمد

پنجاہ و یک آمد عدد سال جلوس ۔ پس فائے فنا بسر "نا" آمد = ۵۱ سال

(یعنی) وہ بادشاہ جس کے دم سے دنیا میں نظم و ضبط پیدا ہوا اور جس کی تمام تدبیریں درست ثابت ہوئیں اس کے سال جلوس کا عدد "۵۱" ہو گیا۔ لہٰذا "فنا" کا "ف" اس "نا" (یعنی ۵۱) کے سر آ گیا۔ مطلب یہ کہ "نا" "ف" کے اضافے سے "فنا" ہو گیا[1]

ملت کے ترکش کا یہ آخری تیر کار زار کفر و دیں کے درمیان اپنی عمر عزیز بسر کر کے خدا کے حضور پہونچا ۔

درمیانِ کار زار کفر و دیں ۔ ترکش مارا خدنگ آخریں

اور اب صرف اس کا قصہ ہی قصہ رہ گیا۔ ع قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند۔

بہادر شاہ اول (۱۷۰۷، ۱۷۱۲ء) و جہاندار شاہ (۱۷۱۲ تا ۱۷۱۳) کے بعد ۱۱ جنوری ۱۷۱۳ء فرخ سیر مسند نشین ہوا اور ۲۸ اپریل ۱۷۱۹ء / ۷ رجب ۱۱۳۱ھ کو بادشاہ گر سید برادران سید حسن علی الملقب بہ عبداللہ خاں متوفی ۱۷۲۲ء اور سید حسین علی متوفی ۱۷۲۰ء (بمقام ٹوڈہ بھیم) نے اسے قتل کروا دیا۔ مرزا بیدل پر جو اپنے اندر دل درد مند رکھتے تھے سید برادران کی اس سفاکانہ حرکت کا اتنا سخت ردِ عمل ہوا کہ انھوں نے فرخ سیر کی وفات پر جو تاریخی قطعہ سپرد قلم کیا اس میں سید برادران پر سخت ریمارک ہے ؛

---

[1] مقالہ اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں از ڈاکٹر عبدالرب عرفان مشمولہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۸۹ء ص ۳۰۰ و ۳۰۱ ۔

شاہی کہ چو بادشاہ گرامی کردند مدعی روجفا زراہ خامی کردند
تاریخ چو از فرد جستم فرمود
سادات بہمہ نمک حرامی کردند[1]
۴۶۶ + ۱۸ + ۱۱۰ + ۲۵۹ + ۳۸۱

شاہ عالم کے انتقال کے بعد ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی سریر آرا سلطنت ہوا۔ افتقار نے درج ذیل شعر سے سال جلوس برآمد کیا۔

جہاں تا خواست تاریخ جلوس ظل سبحانی خرد گفتا بگو شاہ ممالک اکبر ثانی" ۱۲۲۱ھ
۳۰۶ + ۱۳۱ + ۲۲۳ + ۵۶۱

اکبر شاہ ثانی نے ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اس شعر سے سال وفات مستخرج کیا:

پئے سال وفات گفت ظفر "عرش آرامگاہ عالی قدر"[2] ۱۲۵۲ھ
۵۰ + ۲۶۸ + ۱۱۱ + ۳۰۳

سرسید احمد خاں نے اکبر شاہ ثانی کی وفات پر بطریق تخرجہ درج ذیل قطعہ نظم کیا:

چوں بہ رفت از جہاں شہ اکبر شد سیہ آسماں ز دود جگر
پا بہ شادی شکست واحد گفت ۱۰

سال تاریخ او "غم اکبر"[3] ۱۲۶۳ - ۱۰ = ۱۲۵۳ھ
۲۲۳ + ۱۰۴۰

یعنی "شادی" کی "پا" کے دس عدد خارج کر کے سال مطلوبہ برآمد کیجیے۔

آخری مغل تاجدار ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی المتخلص ظفر پسر ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی ۸ رمضان ۱۱۸۸ھ / ۱۲ نومبر ۱۷۷۴ء کو پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد ۱۲۵۳ھ کو تخت نشین ہوئے کسی صاحب طبع نے "چراغ دہلی" سے سال جلوس ۱۲۵۳ھ برآمد کیا۔ ظفر نے بمقام رنگون (قید فرنگ میں) ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء کو وفات پائی اور "بجھا ہے چراغ دہلی" کسی نے سال وفات ۱۲۷۹ھ نکالا۔ شاہ غلام یحییٰ یحییٰ عظیم آبادی نے " فرمودہ شاہ رحلت" اور مندرجہ ذیل
۱۲۷۹ھ

---

[1] شعر العجم فی الہند از شیخ اکرام الحق ص ۳۳ مطبوعہ ۱۹۶۱ء مگر کاتب نے "بود" کی بجائے "بہ ودنے" نقل کیا ہے۔

[2] تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ص ۲۰۸ [3] آثار الصنادید مرتبہ پروفیسر خلیق انجم ۱: ۲۴۸

[4] کنز تواریخ ص ۱۸

قطعہ سے سال برآمد کیا:

شاہ درویش خو بہادر شاہ		نزیں سپنج سرا نمود سفر

در غزل چوں ظفر تخلص داشت

گشت سال وفات "حیف ظفر" ۱۲۷۸ھ بکمی یک عدد

اس موقع پر نواب محمد مردان علی خاں رعنا و نظام تلمیذ غالب اور دیوان ریاست جودھپور نے متعدد تاریخی قطعات کہے۔

۱۔ شہ بیکس چو رفت از دنیا		بیکسی کرد بر سرش ماتم

دید رعنا چو دشت را خالی

گفت تاریخ او "غزال ارم" : ۱۲۷۹ھ

۱۰۳۸ + ۲۴۱

۲۔ بہادر شاہ چوں سوئے ارم رفت		کہ بر او نام شاہی راست اتمام

پئے فوت بہادر شاہ غازی

چنیں رعنا رقم زد "خلد خدا" : ۱۲۷۹ھ

۶۳۴

۳۔ رفت از دہلی سوئے رنگوں چو شاہ بو ظفر		شادماں گشتند بہر دعوتش ارباب خلد

رفت بست از ملک مشرق چوں سوئے خلد بریں

گفت رعنا سال فوت او کہ "مشرق باب خلد" : ۱۲۷۹ھ

۶۳۴ + ۵ + ۶۴۰

چوتھا قطعہ بزبان اردو کہا ہے:

دارِ فانی مقام عبرت ہے		کیا کوئی آہ اوس سے دل کو لگائے

شاہ بیکس گئے جو دنیا سے

کہا رعنا نے "رفت با غم حاسئے" : ۱۲۷۹ھ

۱۲۰ + ۶۴۴ + ۱۹

مذکورہ قطعات کے علاوہ نواب محمد مردان علی خاں نظام و رعنا نے ایک طویل رثائیہ قطعہ بھی نظم فرمایا جس کا ایراد یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس کا عنوان ہے:

۱۔ کنز تواریخ ص ۱۷ ۱۲۷۶ھ تا ۱۲۹۳ھ دیکھیں کلیات نظام دیوان دوم ص ۱۹۷ و ۱۹۸ مطبوعہ ۱۸۷۵ء

قطعۂ وفات ابوظفر بہادر شاہ معزول شاہ دہلی مقیم رنگون خاتم السلاطین چغتیہ تیمو ۱۲۷۹ھ

مپرس احوال ایں دنیا کہ چوں ست	فنا باشد ہمہ آغاز وانجام
ہمہ رنگ نیلگوں رنگِ وفا نیست	تہی چوں شیشہ واژوں صورت جام
کجا اسکندر[1] و جمشید[2] و ضحاک[3]	کجا اسفند[4] یار و رستم[5] و سام[6]
گراز نیک و بد باقیست نامے	کسے ماند ز نیک و ہم ز بد نام
غنیمت داں دو روز عمر ناداں	بسر گردد گرت با عیش و آرام
شہ تیمور چنگیزی ز ترکاں	شنیدستی کہ بودش عالمی رام
ہمہ در سایہ صیت جلالش	ز چیں تا ہند بود از روم تا شام
چو ہندو ہندواں بردند رامش	ہمہ ترسا و گبر و اہل سلام
سمندر شاہیے اودر سمرقند	زدہ در ہشت و ہفتاد و دو گام
ز تیمور ابتدا بر بوظفر ختم	بہند آمد شمار بست و سہ[7] نام
شمار سال عمرِ سلطنت گشت	ازیں رو پنج صد[8] اے نیک فرجام

---

۱ یعنی سکندر اعظم شاہ مقدونیہ ۲ فارس کا مشہور بادشاہ جو پیشدادی خاندان کا چوتھا بادشاہ تھا لغوی معنی ماہ منور کہتے ہیں کہ جام سب سے پہلے اسی نے بنایا تھا لہذا جام جم اسی سے منسوب کر دیا

۳ فارس کا ایک ظالم بادشاہ جس نے جمشید کو آرے سے چروا دیا تھا۔ جسے فریدوں نے قتل کیا۔

۴ شاہ ایران گشتاسپ کا بیٹا۔ ۵ ایران کا مشہور پہلوان

۶ مشہور ایرانی پہلوان جو رستم کا دادا تھا۔ ۱۲۰ ۷ یعنی تیمور سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک کل ۲۳ مغل شہنشاہ ہوئے۔ تیمور، مرزا میراں شاہ، سلطان محمد مرزا، سلطان ابو سعید مرزا نیز سلطان عمر شیخ مرزا وسط ایشیا میں اور اسی طرح ہندستان میں یعنی بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب، بہادر شاہ اول، جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، شاہ جہاں ثانی، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر (ترتیب میں کسی ایک شہنشاہ کا نام سہواً حذف ہو گیا ہے۔ مدف۔ ۱۲۰

۸ مدت سلطنت شاہان مغل پانسو سال کس طرح شمار کی ہے؟

زابراهیم[1] لودی باز چوں کرد | ظهیر الدین بابر هند را رام
هزار و پانصد و بست و شش[2] ز سال | چه سال از سال عیسی بود هنگام
غرض سه صد سی و یک سال دیگر[3] | شمار کامرانی شه ز ایام
بعهد شاه عالم عهد شاهی | بعهد کمپنی چوں کرد ادغام[4]
هزار و یک صد و هفتاد و شش[5] بود | ز هجرت آنکه آمد سال اسلام
ز تخت و تاج شاهی ماند تا هم | نشاں باقی و از شاهی فقط نام
چو کشت غدر شد سرسبز از جور | رسید از دست اهل غدر آلام
هزار و دو صد و هفتاد و شش[6] بود | که گشته از بغاوت شاه بدنام
پس از یک سال[7] شاه انگلستاں | گرفت از کمپنی احکام حکام
هنوز آں شاه شاهاں حکمراں ست | که حکمش باد در هر ملک مادام[8]
بگیر آمد بهادر شه چو در رزم | به رنگوں رفت آخر با صد آلام
به بحر شور شد شوریده آخر | شده آغاز شورش را چه انجام
گرت دا گوش فهم و چشم بیناست | شنو نظم و ببیں احوال ناکام
من از آں روز دانستم که آخر | بود در دهر خورشید لب بام

---

[1] یعنی ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء جنگ پانی پت کی طرف اشارہ ہے جسمیں سلطان ابراہیم لودی شہید ہوا۔ "شہید شد سلطان ابراہیم" مادہ ہے۔ [2] یعنی عیسوی سنہ ۱۵۲۶ [3] اشارہ ہے ہندوستان میں مغلوں کی مدت حکومت ۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء جو صحیح ۳۳۱ سال ہوتی ہے [4] شاہ عالم ثانی کے عہد میں (۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) کمپنی نے مغل حکومت کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا اور بادشاہ کو پنشن دیکر برائے نام تخت نشین رکھا چنانچہ اس زمانہ میں مثل مشہور ہوگئی تھی کہ "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" [5] اشارہ ہے غالباً احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی طرف جو ۱۷۶۱ء میں ہوا تھا [6] یعنی غدر جو ۱۲۷۳ھ معادل ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا [7] یعنی غدر کے ایک سال بعد ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے سرکار انگلشیہ نے ہندوستان کی زمام کار اپنے تحت لے لی۔

[8] مادام یعنی میڈم مراد ملکہ وکٹوریہ

شدہ طالع ز مغرب شد بمشرق　　شود روز شہی را زود تر شام
مقام ترس و جلائے خوف و بیم است　　کہ آغاز آں بود ایں باشد انجام
من و تو ہر دو را کار از قضا ہست　　دگر خواب و خیالات ست او ہام
دگر بعز وشش اے رعنا کہ آمد　　ز ہجر شور شور رنج و آلام

چہ در رنگوں شہ بیکس قضا کرد
بہادر شاہ غازی "بوظفر نام" : ۱۲۷۹ھ
۹۱+۱۱۸۰+۸

ختم شد

ے کلیاتِ نظام دیوان دوم ص ۱۹۶، ۱۹۷ مطبوعہ ۱۸۷۵ء مطبع نول کشور جو راقم کو برائے مطالعہ پروفیسر فیروز احمد صاحب صدر شعبۂ اردو فارسی دانش گاہ جیپور کے ذاتی ذخیرہ سے از راہِ عنایت موصول ہوا تھا۔

امام ابوالحسن علی کسائی

دوسری اور آخری قسط

محمد الیاس الاعظمی ایم۔ اے

نحو سے دلچسپی کی ابتداء امام ابوالحسن علی کسائی کی نحو سے رغبت کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے کسائی کے شاگرد فراء کا بیان ہے کہ امام کسائی ایک مرتبہ طویل سفر کے بعد اپنے حلقہ احباب میں پہونچے جس میں فضل بھی تھے اور یہ اکثر یہاں بیٹھا کرتے تھے اہل مجلس کے دریافت کرنے پر انھوں نے اپنی تکان کو ان الفاظ میں بیان کیا عییت اس پر فضل نے کہا تم ہمارے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس طرح کی غلطی کرتے ہو کسائی نے کہا کہ میں نے کون سی غلطی کی ہے تو ان لوگوں نے بتایا کہ تم سفر کی وجہ سے تھک جانے کی عییت کے بجائے اعییت بالتخفیف سے تعبیر کرنا چاہیئے عییت اس وقت بولتے ہیں جب انسان کو کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئے اور بالکل عاجز و بے بس ہو اس واقعہ سے کسائی نے بڑی خجالت محسوس کی اور ان پر اس کا گہرا اثر ہوا چنانچہ اسی وقت وہ علم نحو حاصل کرنے کے لئے کمربستہ ہوئے اور دریافت کیا کہ اس وقت علم نحو کا سب سے بڑا ماہر شخص کون ہے لوگوں نے معاذ بن الہراء کا نام بتایا چنانچہ کسائی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مکمل استفادہ کیا اس کے بعد بصرہ گئے اور خلیل بن احمد سے خصوصی استفادہ کیا۔ ان کے درس میں بیٹھے تو ایک اعرابی نے کہا:

ترکت اسداً وتمیماً وعندھما الفصاحۃ وجئت الی البصرۃ، تم بنو اسد و بنو تمیم کو چھوڑ کر بصرہ آئے ہو حالانکہ ان کے پاس فصاحت تھی۔

مولانا عبدالقیوم حقانی لکھتے ہیں:۔

اسی زمانہ میں امام کسائی جب ایک روز کسی گلی سے گذر رہے تھے تو ایک بدشی نے ان پر طعن کیا کہ تم لوگ کان ادب بنو تمیم اور بنو اسد کو چھوڑ کر عربیت حاصل

کیسے بصرہ آئے ہو بھلا یہاں کتنا ادب حاصل کرسکو گے؟ یہ چبھتا ہوا فقرہ امام کسائی کے دل میں اتر گیا اور اپنے استاد علامہ خلیل بصری سے کسی موقع پر انھوں نے دریافت کیا حضرت آپ نے فن ادب کہاں سے سیکھا؟ استاد نے جواب دیا حجاز تہامہ اور نجد کے جنگلوں میں بس پھر کیا تھا کسائی کے سر میں ایک تازہ سودا پیدا ہوا عشق کی موجیں مچلنے لگیں شہر چھوڑ دیا صحراؤں اور جنگلوں کی راہ لی قبیلہ در قبیلہ پھرتے رہے اور اتنے پھرے اور اس قدر اسفار کئے کہ فن ادب کا کوئی پہلو ان سے پوشیدہ نہ رہا حتیٰ کہ اس فن کے امام بن گئے جس کے نہ جاننے سے شرمندہ ہونا پڑا تھا آج اس کے ایک ایک پہلو سے انھیں عزتیں اور رفعتیں مل رہی ہیں[1]

امام کسائی جب نجد و تہامہ اور حجاز سے واپس ہوئے تو حفظ کی ہوئی چیزوں کے علاوہ دیہاتوں کے اقوال و محاورات لکھنے پر روشنائی کی پندرہ بوتلیں صرف کر چکے تھے[2]

صاحب المدارس النحویہ کا بیان ہے کہ:۔

انہ خرج الی نجد وتہامہ والحجاز وما جمع وقد انفد خمس عشرۃ قنینۃ حبر فی الکتابۃ عن العرب سوی ما حفظ[3]

کسائی نے نجد تہامہ اور حجاز کا سفر کیا عربوں کی روایت لکھنے میں پندرہ شیشی روشنائی صرف کی علاوہ ازیں بہت سی چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

عربی قبائل سے تحصیل علم کے بعد پھر بصرہ تشریف لائے تو خلیل بن احمد کی وفات ہوچکی تھی ان کی مسند درس پر ان کے شاگرد یونس بن حبیب بصری نحوی تشریف فرما تھے امام کسائی نے بہت سے مسائل میں ان سے گفتگو کی تو انہوں نے کسائی کی تصدیق کی اور اپنی جگہ پر امام کسائی کو بٹھا دیا اور پھر یہیں انھوں نے مستقل اقامت اختیار کر لی[4]

---

[1] مولانا عبدالقیوم حقانی، کتاب پیشہ رزق حلال اور ارباب علم و کمال ص ۱۵۳ و ۱۵۴۔

[2] ایضاً والموجز فی نشاۃ النحو۔

[3] المدارس النحویہ ص ۱۵۹		[4] نزہۃ الالباء

نحوی اسکول علم نحو کے تین مراکز تھے جنھیں اسکول سے تعبیر کیا جاتا ہے اولیت بصری اسکول کو حاصل ہے اس کے بعد کوفہ اور بغداد کے مراکز کا تذکرہ کیا جاتا ہے ان نحوی مراکز سے وابستہ علماء نے بڑی محنت کی اور فن نحو کو بڑی وسعت او ہمہ گیری بخشی ان میں سرفہرست بصرہ میں سیبویہ، کوفہ میں کسائی اور بغداد میں ابن کیسان تھے کوفی اسکول کی ابتداء کسائی کے استاد ابوجعفر رؤاسی اور معاذ بن الہراء سے ہوتی ہے مگر کسائی کی محنت ومشقت نے ان کو کوفی اسکول کا بانی قرار دینے کا جواز فراہم کر دیا دراصل کوفی نحو کی ابتداء با قاعدہ اور منظم طریقے سے کسائی اور ان کے شاگرد فراء سے ہوتی ہے انھیں دونوں نے اس کے مقدمات ترتیب دیئے اصول وضوابط منضبط اور مخلوط بنائے اور اپنی نجی صلاحیتوں کی بنا پر کوفی اسکول کو ایک مستقل نظریہ دیا۔

نحوی مراکز کے درمیان چپقلش معرکہ آرائی اور ایک دوسرے پر تنقید واعتراضات بھی ہوتے تھے اس سلسلہ میں ابن الانباری نے دونوں کے اختلافات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب بھی لکھی تھی چونکہ امام کسائی اور ان کے ہم خیال نحویوں کا رویہ فراخدلانہ اور وسعت پسندانہ تھا وہ صرف فصحائے عرب ہی سے اشعار وامثال لینے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان عربوں سے بھی روایت کرتے تھے جو شہروں میں رہتے تھے جبکہ اہل بصرہ ان سے سند لینے کو پسند نہیں کرتے تھے اس میں وہ متشدد تھے اور اسی بنا پر امام کسائی کو اپنی تنقیدوں کا ہدف بناتے تھے جیسا کہ اس قول سے ظاہر ہے:

انہ کان یسمع الشاذ الذی لا یجوز من الخطاء واللحن وشعر غیر اھل فصاحۃ والضرورۃ لیجعل ذالک اصلاً ویقیس علیہ حتیٰ افسد النحو۔[1]	شاذ اور غلط روایتوں کو قبول کرتا تھا اور غیر اہل فصاحت کے اشعار نقل کرتا تھا اور اس کو اصل بنا کر اس پر قیاس کرتا تھا۔ یہاں تک کہ نحو کو اس نے خراب کر دیا۔

حالانکہ ابتداء میں اشعار وامثال اور اقوال ومحاورات ہی سے کام لیا جاتا تھا لیکن باوجود ابن خلکان کا یہ قول حیرت انگیز ہے کہ

---

[1] معجم الادباء۔ ۱۴۳/۱۳

"اس کو شعر میں کوئی مہارت حاصل نہیں تھی مشہور مقولہ ہے کہ علمائے نحو میں کسائی سے زیادہ شعر سے ناواقف کوئی نہیں ہے۔"

مناظرے اوپر گذر چکا ہے کہ کسائی نے خلیفہ ہارون رشید کے بیٹے امین و مامون کی اتالیقی میں خلیفہ ہارون رشید کے وزیر اعظم یحیٰی بن خالد نے کسائی اور سیبویہ کو اکٹھا کیا امام کسائی کے شاگرد فراء کا بیان ہے کہ میں ایک روز کسائی کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں میں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو کسائی نے فرمایا۔

"یہ بادشاہ یحیٰی ابن خالد مجھے بلاتا ہے کہ مجھ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کرے اگر میں اس کا جواب دینے میں دیر کروں گا تو مجھ پر اس کا عتاب ہوگا اور اگر عجلت سے جواب دوں تو مجھے غلطی کا خطرہ ہے۔"

انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ جو کچھ پوچھے آپ اس کا جواب دیجئے آپ تو کسائی ہیں۔ کسائی نے اپنی زبان پکڑلی اور کہا اللہ تو اس زبان کو کاٹ اگر میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہ ہو۔

واضح رہے کہ سیبویہ ماہر قرأت ونحو اور بصری اسکول کے نمائندہ تھے بالآخر دونوں میں مناظرہ ہوا کسائی نے سیبویہ سے دریافت کیا کہ "کنت اظن العقرب اشد لسعة من الزنبور فاذا ھو ایاھا" میں فصاحت کس میں ہے سیبویہ نے جواب دیا آخری جملے میں ایاھا کی منصوب ضمیر لانا جائز نہیں ہے صحیح یہ ہے "فاذا ھو ھی" کسائی نے فرمایا عربوں میں دونوں رائج ہے بات آگے بڑھی تو ایک فصیح اللہجہ عرب دیہاتی کو حکم مقرر کیا گیا اس نے سیبویہ کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن چونکہ کسائی امین کے اتالیق اور کوفہ کے رہنے والے تھے اس لئے ان کے طرفداروں کو کسائی کی پسپائی گوارا نہ ہوئی اس لئے سیبویہ نے دل برداشتہ اور ملول خاطر ہو کر بغداد کو خیر باد کہکر بیضار کے لئے رخت سفر باندھ لیا اور بقیہ زندگی بیضار میں گوشہ نشینی میں گذار دی[1]

---

[1] المدارس النحویہ ص ۵۸ بحوالہ الرشاد اعظم گڑھ مئی، جون ۸۵ء

لیکن اس مناظرے کی مکمل روداد دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون حق پر تھا غیر واضح اور مبہم ہونے کی وجہ سے یہ واقعہ محل نظر ہے۔

فراء کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے میری تعریف کی اور کہا کہ آپ کسائی کے پاس کیوں جاتے ہیں آپ تو علم نحو میں انھیں کی طرح ہیں چنانچہ مجھے اس کا زعم پیدا ہوا اور میں نے کسائی سے مناظرہ کیا اور کچھ سوالات کئے تو معلوم ہوا کہ میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے جو سمندر میں پانی پی رہی ہو۔

نحو میں کمال وامتیاز امام ابوالحسن علی کسائی کی جلالت شان اور علو مرتبت کا اندازہ علامہ ابن الانباری (م ۳۲۸ھ) کے اس قول سے ہوتا ہے کہ امام کسائی علم نحو کے ماہر اور عربی میں بے نظیر تھے ان پر علم نحو اور فن قرأت دونوں ہی چیزیں منتہی ہوتی ہیں۔[۱] حرملہ ابن یحییٰ نجیبی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام شافعیؒ سے کہتے ہوئے سنا کہ جسے علم نحو میں مہارت حاصل کرنی ہو وہ کسائی کا محتاج ہے۔[۲]

خلیفہ سے تعلق امام ابوالحسن علی کسائی نے خلیفہ ہارون رشید اور ان کے لڑکے امین کو پڑھایا تھا اس لئے خلیفہ کی بارگاہ میں کسائی کو اثر و رسوخ حاصل تھا خلیفہ کی معیت میں وہ خراسان جاتے ہوئے شہرری میں انھوں نے وفات پائی ان کی وفات پر خلیفہ کو سخت صدمہ ہوا اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا:

"دفنا الفقہ والنحو بالری فی یوم واحد"[۳] ہم نے فقہ اور نحو دونوں کو ایک ہی دن شہرری میں دفن کر دیا۔

تصانیف درس و تدریس کے علاوہ ان کا وقت تصنیف و تالیف میں گذرتا ان کی جن کتابوں سے ہم واقف ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ معانی القرآن: یہ علوم القرآن سے متعلق تھی۔[۴]

۱۔ بحوالہ علم قرأت اور قراء سبعہ ص ۱۱۵ ۲۔ کتاب التبصرہ ص ۱۲۴

۳۔ المدارس النحویہ ص ۱۷۵ ۴۔ تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۱۳

٢۔ مختصر النحو ؎ } ان دونوں کتابوں کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی لیکن ان کے ناموں سے
٣۔ کتاب الحدود فی النحو } معلوم ہوتا ہے کہ یہ نحو سے متعلق تھیں ۔
٤۔ نوادر کبیر ؎ : اس کے متعلق کوئی تفصیل نہ مل سکی ۔

٥۔ ماتلحن فیہ العوام : یہ کتاب اغلاط عام سے متعلق تھی اپنے موضوع کے لحاظ سے غالباً یہ سب سے قدیم ترین تصنیف ہے اس کا مخطوطہ کتب خانہ برلن میں ہے بروکلمان ۔ (BHOCKELMANN) نے رسالہ ZEITSCHR. F. ASSYRIAL کے شمارہ ۱۲ شمارہ ۱۸۹۸ء میں ص ۲۹ تا ۴۶ میں شائع کیا تھا بعد ازاں عبدالعزیز میمنی کی تصحیح سے دوبارہ شائع ہوا ؎۔

اس کے علاوہ اور بھی مختلف رسالے اور کتابیں تصنیف کیں لیکن ہم ان کی تفصیلات سے محروم ہیں۔

وفات انھوں نے ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء رے کے ایک قریہ رنبویہ میں خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ خراسان جاتے ہوئے ستر سال کی عمر میں وفات پائی ؎ اور وہیں سپرد خاک کئے گئے تاریخ وفات لفظ المحسن سے نکلتی ہے اسی دن ان کے خالہ زاد بھائی اور مشہور فقیہ امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے بھی یہیں وفات پائی اسی پر خلیفہ ہارون رشید نے کہا تھا کہ "ہم نے فقہ اور نحو دونوں کو ایک ہی دن شہر ری میں دفن کر دیا ۔

صاحب تذکرہ النحاۃ نے بغیر کسی حوالے کے سنہ وفات ۱۸۳ھ اور جائے وفات طوس لکھ دیا ہے ؎ جبکہ کسی معتبر کتاب سے ان کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی ۔

بشارتیں اسماعیل بن جعفر مدنی کا بیان ہے کہ میں نے خواب میں امام کسائی کی زیارت کی اور دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا تو کسائی نے فرمایا کہ قرآن کی وجہ سے میری مغفرت فرمادی اور جنت میں جگہ دی۔

؎ ایضاً ؎ ایضاً ؎ دائرہ معارف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) ؎ ملا علی قاری شرح شاطبی ص ۱۵ و سراج القاری المبتدی ص ۱۲ ؎ تذکرۃ النحاۃ ص ۱۵۔

دوسری جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی اور رضامی کرم کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب عطا کیا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ علی بن حمزہ کسائی ہو میں نے کہا ہاں تو آپ نے فرمایا قرأت کرو میں نے والصافات صفاً سے شہاب ثاقب تک تلاوت کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن انتیں تم پر فخر کریں گی۔

خود امام کسائی کا بیان ہے کہ میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی آپ نے فرمایا تم کسائی ہو میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ پھر آپ نے فرمایا پڑھو میں نے کہا کیا پڑھوں آپ نے فرمایا والصافات صفا فالزاجرات زجراً فالتالیات ذکراً ان الھکم لواحد" پھر اپنا دست مبارک میرے مونڈھے پر رکھا اور فرمایا لاحیتن بد الملائکتقدا میں تمہارے ذریعہ کل فرشتوں پر فخر کروں گا۔

محمد بن یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے عبد الرحمٰن ابن جریش سے سنا کہ انہوں نے کسائی کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا امام کسائی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی وجہ سے میری مغفرت فرمادی۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب۔شاعر کی حیثیت سے

از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن خدابخش لائبریری پٹنہ۔

پہلی قسط

حضرت مولانا قاری محمد طیب نوراللہ مرقدہ (متوفی ۱۹۸۳ء) ایک متبحر عالم بے مثل خطیب متقی و پرہیزگار شخصیت اور مہتمم دارالعلوم کی حیثیت سے پورے ہندو پاک میں مقبول و مشہور تھے یہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے مختلف حلقوں میں نہایت قدر و منزلت اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہ مذہبیات کے علاوہ شعر و ادب سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ایک بلند پایہ شاعر تھے۔

بات دراصل یہ تھی کہ وہ محض شاعر نہیں تھے کہ مشاعروں میں شرکت کرتے اخبار و رسائل میں اپنا کلام چھپواتے اور اہل ذوق حضرات سے داد تحسین حاصل کرتے۔ بلکہ ان کی زندگی کا اصل مقصد تو علم دین کی اشاعت و تبلیغ اور دارالعلوم دیوبند کی آبیاری اور چمن بندی تھی لیکن کبھی کبھار کسی ضرورت یا محض تفنن طبع کے طور پر کوئی نظم یا قصیدہ کہہ ڈالتے۔ جس سے ان کی شعری صلاحیت کا جوہر کھلتا اور پھر اہل ذوق انہیں سن کر جھوم اٹھتے۔

خوشی کی بات ہے کہ ان کے صاحبزادے مولانا اسلم قاسمی نے قاری محمد طیب کا شعری مجموعہ "عرفان عارف" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ جو ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور جس کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً ۴۲۰۷ ہے۔ اس میں فارسی کے ۴۳۲ اور عربی ۱۰۷ اشعار پائے جاتے ہیں بقیہ ۳۶۰۷ اشعار اردو زبان میں ہیں۔

تخلص مولانا قاری محمد طیب صاحب نے شعر و شاعری کا فطری ذوق پایا تھا اسی بنا پر وہ زمانہ طالب علمی میں گرچہ درسی کتابوں کے مطالعہ میں رہے تاہم وقتاً فوقتاً شعر گوئی بھی کر لیا کرتے تھے اس لئے انہوں نے نظموں میں اپنا تخلص "عارف" استعمال کیا ہے، لیکن عام طور پر اپنے نام طیب ہی کو تخلص کی حیثیت سے اختیار کیا ہے کہیں کہیں بغیر تخلص کے بھی نظم ملتی ہے۔

ادبی ماحول مولانا قاری محمد طیب کی پرورش و پرداخت خالص علمی و دینی ماحول میں ہوئی تھی، ان کے دادا حضرت مولانا قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) دارالعلوم دیوبند کے بانی اور ہندوستان کے مشہور عالم دین فقیہ اور مرد مجاہد تھے ان کے والد محترم حافظ محمد احمد بھی مشہور عالم دین اور دارالعلوم دیوبند کے مہتم تھے اس طرح پورا گھرانا خالص علمی و دینی تھا۔ جہاں مذہبیات کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا۔ ایسے خوشگوار علمی و ادبی ماحول نے مولانا قاری محمد طیب کے فطری ذوق شاعری پر گہرا اثر ڈالا اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچپن ہی سے خوبصورت اور اچھے اشعار کہنے لگے۔

اردو شاعری جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مولانا قاری محمد طیب نے اردو زبان میں زیادہ اشعار کہے ہیں، مجموعی طور پر ۲۷ نظمیں ملتی ہیں۔ سب سے طویل نظم "آنکھ کی کہانی" ہے جس میں تقریباً ۱۷۱ اشعار پائے جاتے ہیں۔

اردو نظموں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد طیب میں اچھی اور کامیاب نظم کہنے کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔ ان کی نظموں میں حالات و واقعات کی صحیح عکاسی، زبان کی سلاست و روانی، اردو الفاظ و محاورات کے برمحل استعمال اور جذبات کی ترجمانی کی پوری جھلک ملتی ہے، چونکہ وہ ایک متبحر عالم دین تھے۔ اسلئے مذہبی رنگ تقریباً ہر نظم میں نمایاں ہے، لیکن جا بجا طنز و مزاح کی جھلک ملتی ہے، کہیں کہیں فلسفیانہ خیال اور منطقیانہ استدلال نظر آتا ہے، بعض بعض جگہ پند و نصیحت بھی پائی جاتی ہے۔

مولانا قاری محمد طیب کی شاعری کس پایہ کی ہے، کتنے اچھے شاعر ہیں اور اس میدان میں ان کا کیا مقام ہے؟ اس لئے مناسب ہوگا کہ چند مستند اور معتبر شاعر و ادیب کے تاثرات بیان کئے جائیں اور دیکھا جائے کہ انھوں نے انکی شاعری کے بارے میں کیا کہا ہے۔

اکبر الہ آبادی کا تاثر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے ایک انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ "پانی کی روانی" کے عنوان سے کیا تھا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اس نظم کو پڑھ کر اس کی پیروی میں ایک دوسری نظم "اسلام کی روانی"

کے عنوان سے کہی جو رسالہ القاسم ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی، اکبر الہ آبادی اس نظم کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن دار العلوم دیوبند کے نام ایک خط میں اپنا تاثر اس طرح پیش کیا۔

مولانا محمد طیب کی نظم روانی اسلام نظر سے گذری۔ ماشاء اللہ صلی علی جزاک اللہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

خاکسار اکبر

مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا تاثر

مولانا قاری محمد طیب کی ایک آنکھ کا آپریشن ۸ر جنوری ۱۹۶۳ء کو ہوا تھا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد دوسری آنکھ کا آپریشن ہوا، انھوں نے اس موقع پر بستر آپریشن پر لیٹے لیٹے ایک طویل نظم کہی، جو نہایت معرکۃ الآرا نظم ہے، اس نظم میں آنکھ سے متعلق بہت حقائق، فوائد اور کیفیات نہایت بلیغ انداز میں بیان کی گئی ہیں، حکمت وعبرت کی باتیں کہی گئیں ہیں۔ سبق حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، خالق حقیقی کا شکر ادا کیا گیا ہے۔ ہسپتال کے ڈاکٹر وغیرہ کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ جب یہ نظم چھپی تو اہل علم نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تعریف کی، اردو زبان کے مشہور انشاپرداز اور ادیب مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اس نظم کو پڑھ کر ایک خط کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا۔

حضرت محترم السلام علیکم

"آنکھ کی کہانی" آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی۔ سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر وادب میں اس درجہ قدرت حاصل ہے۔ ذالک فضل اللہ

کیا کیا عالیے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو بہ حیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اس درجہ میں ہیں ماشاء اللہ

دعاگو و دعاجو

عبدالماجد ۵ار دسمبر ۱۹۶۳ء

مسٹر افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر کا تاثر

مسٹر افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان برائے ہند نے بھی "آنکھ کی کہانی" والی نظم پڑھی تو وہ نہایت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے تاثرات کو اس طرح بیان کیا۔ لکھتے ہیں

"شعر کی سادگی، تخیل کی پرواز اور خلوص کی بہتات تمام ایسی خوبیاں ہیں، جو آپ کی ذات سے نہایت آسانی سے منسوب ہو گئی ہیں، آپ کی روحانی عظمت کا کون قائل نہیں۔ یہ مثنوی آپ کے ملکۂ شاعری کا لوہا ہم جیسے کافروں سے بھی منواتی ہے۔ بہت ظلم ہو گا اگر آپ اپنے مشاغل میں صنف سخن کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ اس ملک (ہندوستان) میں جہاں اسلام کو آپ کی بابرکات سے تقویت پہنچی ہے، وہاں اردو بھی منت پذیر شانہ ہے،، سلہ

نمونۂ کلام

مولانا قاری محمد طیب کی شاعری کو مکمل طور پر سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے ان کے مجموعہ کلام "عرفان عارف" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ تاہم یہاں ان کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ ان کے یہاں کیسی زبان کیسے کیسے مضامین اور کیسے کیسے قافیے و ردیف کس خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس کو پڑھ کر حضرت اکبر الہ آبادی نے داد دی تھی، یعنی اسلام کی روانی۔ دیکھئے یہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے

چلا ارض بطحا سے ایک موج اختر — کہ تھا جس کی موجوں کا اول نہ آخر
وہ توحید کی نے بجاتا ہوا — سرود حجازی میں گاتا ہوا
وہ جنگل میں منگل مناتا ہوا — وہ شہروں میں شادی رچاتا ہوا
پہاڑوں پہ نعرے لگاتا ہوا — سمندر میں طوفاں اٹھاتا ہوا
ضلالت کے [illegible] کو گھٹاتا ہوا — زمانے میں [illegible] مچاتا ہوا
ہدایت کے جھنڈے اڑاتا ہوا — وہ [illegible] لگاتا ہوا
بتوں سے وہ رشتے تڑاتا ہوا — خدا سے ہر ایک کو ملاتا ہوا
اسی کی عبادت سکھاتا ہوا — حضور اس کے [illegible] جھکاتا ہوا
جہالت کی رسمیں مٹاتا ہوا — معارف کے [illegible] اٹھاتا ہوا

اذانیں زمیں پر دلاتا ہوا　　شیاطیں کو دھکے لگاتا ہوا
معاصی کو آنکھیں دکھاتا ہوا　　گناہوں کی گردن دباتا ہوا
وہ غیروں کو اپنا بناتا ہوا　　لگن اک نئی سی لگاتا ہوا
وہ آنکھوں سے آنکھیں لڑاتا ہوا　　دلوں میں ہر اک کے سماتا ہوا
تمدن کی چولیں جماتا ہوا　　مہذب جہاں کو بناتا ہوا
دلوں کو وہ ہمت دلاتا ہوا　　وہ روحوں کی قوت بڑھاتا ہوا
دروس حقائق پڑھاتا ہوا　　خرافات یوناں بھلاتا ہوا
صدفہائے علمی بہاتا ہوا　　گہرہائے عرفاں لٹاتا ہوا

(جاری)

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے سرکاری خطوط

مؤلف ومرتب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وہ تمام خطوط مع اصل و ترجمہ یکجا کئے گئے ہیں جو خلیفۂ اول نے اپنی خلافت کے پر آشوب اور ہنگامہ خیز دور میں حاکموں، گورنروں اور قاضیوں کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ ان مکتوبات اور فرامین کے مطالعہ سے حضرت صدیق اکبرؓ کی لاثانی انتظامی خصوصیات اور طریق کار سامنے آجاتا ہے۔

اس ترتیب وتفصیل کے ساتھ ایسا مجموعہ اب تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ اردو ترجمہ کے ساتھ خطوں سے متعلق ضروری تفصیل دی گئی ہے۔ شروع میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خاص حالات سے متعلق ایک بصیرت افروز تعارف۔ آخر میں خطوط کے اصل مکتوبات [illegible] صورت میں دیئے گئے ہیں۔ کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے جس میں مزید خطوط (جو بعد میں دستیاب ہوئے) [illegible] بلکہ تفصیلات بھی اضافہ کی گئی ہیں جو بعد کو معلوم ہوئیں۔

بڑی تقطیع ۲۶×۲۰ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قندِ پارسی
بیادِ اقبالؒ

[illegible]

سکون و عیش را ای دل، از آں دلبر چہ می خواہی
بجز دردِ فراق و سوزِ غم، دیگر چہ می خواہی

تو تخت کے چہ می جوئی، بسر افسر چہ می خواہی
دلِ درد آشنای طلب، دیگر چہ می خواہی

نمی داری ز عیش و راحتِ دنیا اگر چیزی
بدل داری چو دردِ عشق، ازیں بہتر چہ می خواہی

بہر سو داغِ دل بینی، شرارِ درد و غم یابی
دریں محنت سرا لوای دلِ مضطر چہ می خواہی

دریں جا درد و غم، آہ و فغاں، سوزِ جگر بینی
جزایں دیگر، دریں غمخانہ گو، منظر چہ می خواہی

جہاں از بسکہ شد پُر ہولہا و بیقراریہا
قیامت گشت برپا، تو دگر محشر چہ می خواہی

بدنیا عام کردی رہزنی و قتل و سفاکی
جہاں را کردہ ویرانہ، از داور چہ می خواہی

مقامِ خویش را دریاب و کن تسخیرایں عالم
چو خود بالاتری، تو از مہ و اختر چہ می خواہی

یکی را گیر محکم تر، بشو آزادِ ہر عالم
طلب کن از دری، دریوزہ از ہر در چہ می خواہی

بدیدہ صدر از اشکِ ندامت قطرہ‌ای دارد
بگوای شاہِ خوباں! بہ ازیں گوہر چہ می خواہی

قندِ پارسی

نذرِ حافظ

از جناب محمد صدر عالم صدرؔ، استاذ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ

چہ گویم من ترا ای جاں، چہ افتاد است مشکلہا
نمی سازد بما خلوت، خوشم آید نہ محفلہا
تپد از بیقراریہا، درونِ سینہ ہا دلہا
نمی دانم کہ آخر چیست راہ و رسم منزلہا
خدا حافظ ترا ای رہرو راہش خدا حافظ
خلد بر ہر قدم صد خار در پاہا و در دلہا
نمی یابم نشانِ منزلِ جاناں نمی یابم
چہ شود ای رہرواں کز بہر او بندید محملہا
نہد آں کس کہ در راہِ طلب باشوقِ دل پای
بہ پیشِ او بیاید بہر استقبال منزلہا
حدیثِ جنت و حوراں، چہ می گوئی مرا واعظ
کہ من آتش زدم بر سودہا و جملہ حاصلہا
چہ دادی اے فلک مارا کہ ہر کس دشمنم گشتہ
ندارم خوبئی کز رشک خوں افتاد در دلہا
در افتاد است در دریائے بے پایانِ عشقِ تو
نمی خواہد ازیں پس صدرؔ کشتیہا و ساحلہا

قندِ پارسی

بیادِ رودکیؒ

از:۔ محمد صدر عالم صدرؔ، استاذ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ ۴

مژدہ ای دل، جانِ جاں آید ہمی — بادشاہِ گلرخاں آید ہمی
این گدا میں آستاں آید ہمی — زیرِ پایم آسماں آید ہمی
یادِ بزمِ دوستاں آید ہمی — در نظر باغِ جناں آید ہمی
نامِ او چوں بر زباں آید ہمی — ہمچو شکّر در دہاں آید ہمی
یاد، چوں آں مہرباں آید ہمی — در تنم گوئی کہ جاں آید ہمی
مژدہ باد ای دل کہ بعد از مدّتی — یار سویت میہماں آید ہمی
از رگِ جاں ہست او نزدیک تر — خود وجودم درمیاں آید ہمی
ہر چہ دارد عشقِ یار اندر دلش — بر سرش کوہِ گراں آید ہمی
گشتہ ام رسوا سرِ بازارہا — عشق با ایں ارمغاں آید ہمی

شاد باش ای صدرؔ، کاندر بزمِ تو
باز یارِ مہرباں آید ہمی

برہان

جلد ۱۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء مطابق ربیع الاول ۱۴۱۳ھ شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا

بوسنیا میں قیامت

سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد۔ یوگوسلاویہ بھی جو ایک وفاقی ملک تھا ٹوٹ گیا۔ اس کے کچھ صوبے آزاد یا نیم خود مختار ہوگئے۔ ان میں سب سے بڑا صوبہ سربیا تھا اسی کے ایک خطّہ کا نام بوسنیا ہے۔ جس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ اس خطّہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ خطہ ان کی بلقانی ریاستوں میں شامل تھا۔ جو کبھی سلطنت عثمانی کی قلمرو میں شامل تھیں۔ ۱۹ ادیں صدی کے اخیر دور میں، اور بیسویں صدی کے اوئل میں یکے بعد دیگرے یہ بلقانی ریاستیں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکلتی چلی گئیں۔ اور آزاد حیثیت اپناتی گئیں یورپ کی بڑی طاقتوں نے ہمیشہ ہی مشرقی یورپ کے ان علاقوں پر ترکوں کی حکومت کو بُری نگاہ سے دیکھا تھا۔ ان ہی کی در پردہ شہ اور مسلسل ریشہ دوانیوں اور بعد ازاں جنگوں کے باعث، یہ علاقہ سلطنت عثمانی کے ہاتھوں سے نکلا۔ اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ ادھر جب پہلی جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین وجود میں آیا۔ ترکی ایشیائے کوچک میں سمٹ کر رہ گیا۔ اور عرب ممالک بھی آزاد ہوگئے تو اس خطّہ میں یوگوسلاویہ ایک وفاق بن کر ابھرا۔ مارشل ٹیٹو سوویت یونین کے بلاک سے یوگوسلاویہ کو الگ رکھنے میں تو کامیاب تو ہوگئے۔ لیکن اندرونی طور پر وہ مختلف مذاہب کو ماننے والے اس ملک میں توازن رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر ۱۹۴۰ء کے بعد بھی اس ملک میں مسلمانوں کو زبردست ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ وسیع پیمانہ پر غارت گری اور تباہی کے ذریعہ مسلم آبادیوں کو اجاڑ دیا گیا۔ اس معاملہ مہذب یورپ، جو سلطنت عثمانی میں رہنے والے عیسائیوں کی نام نہاد "حالت زار" پر آنسو بہایا کرتا تھا۔ مجرمانہ طور پر خاموش رہا۔ اور آج جب اس خطّہ میں مسلمانوں پر

انسانیت سوز مظالم روا رکھے جا رہے ہیں۔ مہذب دنیا اور خاص طور پر امریکہ اور اس کے اتحادی خاموش ہیں۔

تازہ ترین اخباری اطلاعات کے مطابق بوسنیا کا سارا خطہ ایک وسیع قید خانہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سرب بیائی انتہا پسندوں نے اس خطہ میں ۱۰۵ کیمپ قائم کر رکھے ہیں جن میں گذشتہ اپریل سے اب تک ۲ لاکھ ۶۰ ہزار لوگوں کو رکھا جا چکا ہے۔ ان کیمپوں میں ۱۳ ہزار بوسنیائی اب تک شہید کئے جا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک لاکھ ۳۰ ہزار مسلمانوں کو نظر بندی کیمپوں میں رکھا گیا ہے۔ جہاں انہیں ناقابل بیان اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ امریکی ہفت روزہ ٹائم اور دوسرے اخباری نمائندوں نے حال ہی میں بوسنیا کا دورہ کر کے وہاں کی لرزہ خیز تفصیلات بیان کی ہے۔ دریائے بوسنیا کے واقع یہ ملک بوسنیا، مشرقی یوروپ کا حسین ترین خطہ ہے یہ واقعی طور پر جنت نظیر ہے۔ لیکن آج اسے جہنم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

ایک صحافی نے ہراتو نامی قصبہ کے ایک پرائمری اسکول میں قائم نظر بندی کیمپ کا حال لکھا ہے۔ جہاں ۵۰۰ مسلم قیدیوں کے جسم کا سارا خون اس لئے نچوڑ لیا گیا کہ زخمی سربیائی باشندوں کو تازہ خون فراہم کیا جا سکے۔ اسی طرح اوگوسکا قصبہ میں واقع سومرے کے عارضی کیمپ میں سربیائی دہشت گردوں نے قیدیوں کو الٹا لٹکا کر ان کی آنکھیں نکال لیں۔ ٹائم کے نمائندہ اومیک السٹر نے جو رپورٹ دی ہے۔ وہ قابل ذکر ہے السٹر لکھتا ہے۔

بوسنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ نہ صرف بڑی حد تک ناقابل یقین ہے۔ بلکہ قدم قدم پر نازی جرمنی کی یادیں دلاتا ہے۔ اس خطہ میں ایک ایسی جنگ لڑی جا رہی ہے جس کا اصل نشانہ معصوم شہری ہیں انہیں ہراساں اور خوف زدہ کرنے۔ اپنی بستیوں کو چھوڑ کر بھاگ جانے اور یہاں تک کہ قتل کر ڈالنے کے ایک ایسے منصوبہ پر عمل ہو رہا ہے جو ہر اعتبار سے قابل مذمت ہے جو لوگ بوسنیا سے فرار ہو رہے ہیں۔ انکا واحد مقصد

نظرات

بوسنیا میں قیامت

سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد۔ یوگوسلاویہ بھی جو ایک وفاقی ملک تھا ٹوٹ گیا۔ اس کے کچھ صوبے آزاد یا نیم خود مختار ہو گئے۔ ان میں سب سے بڑا صوبہ سربیا تھا۔ اسی کے ایک خطّہ کا نام بوسنیا ہے۔ جس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ اس خطّہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ خطہ ان کی بلقانی ریاستوں میں شامل تھا۔ جو کبھی سلطنت عثمانی کی قلمرو میں شامل تھیں۔ ۱۹ ویں صدی کے اخیر دور میں، اور بیسویں صدی کے اوائل میں یکے بعد دیگرے یہ بلقانی ریاستیں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکلتی چلی گئیں۔ اور آزاد حیثیت اپنائی گئیں یوروپ کی بڑی طاقتوں نے ہمیشہ ہی مشرقی یوروپ کے ان علاقوں پر ترکوں کی حکومت کو بُری نگاہ سے دیکھا تھا۔ ان ہی کی در پردہ شہ اور مسلسل ریشہ دوانیوں اور بعد ازاں جنگوں کے باعث، یہ علاقہ سلطنت عثمانی کے ہاتھوں سے نکلا۔ اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ ادھر جب پہلی جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین وجود میں آیا۔ ترکی ایشیائے کوچک میں سمٹ کر رہ گیا۔ اور عرب ممالک بھی آزاد ہو گئے تو اس خطّہ میں یوگوسلاویہ ایک وفاق بن کر ابھرا۔ مارشل ٹیٹو سوویت یونین کے بلاک سے یوگوسلاویہ کو الگ رکھنے میں تو کامیاب تو ہو گئے۔ لیکن اندرونی طور پر وہ مختلف مذاہب کو ماننے والے اس ملک میں توازن رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ادھر ۱۹۴۰ء کے بعد بھی اس ملک میں مسلمانوں کو زبردست ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ وسیع پیمانہ پر غارت گری اور تباہی کے ذریعہ مسلم آبادیوں کو اجاڑ دیا گیا۔ اس معاملہ مہذب یوروپ، جو سلطنت عثمانی میں رہنے والے عیسائیوں کی نام نہاد "حالت زار" پر آنسو بہایا کرتا تھا۔ مجرمانہ طور پر خاموش رہا۔ اور آج جب اس خطّہ میں مسلمانوں پر

انسانیت سوز مظالم روا رکھے جا رہے ہیں۔ مہذب دنیا اور خاص طور پر امریکہ اور اس کے اتحادی خاموش ہیں۔

تازہ ترین اخباری اطلاعات کے مطابق بوسنیا کا سارا خطہ ایک وسیع قید خانہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سرب بیائی انتہا پسندوں نے اس خطہ میں ۱۰۵ کیمپ قائم کر رکھے ہیں جن میں گذشتہ اپریل سے اب تک ۲ لاکھ ۶۰ ہزار لوگوں کو رکھا جا چکا ہے۔ ان کیمپوں میں ۱۳ ہزار بوسنیائی اب تک شہید کئے جا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک لاکھ ۳۰ ہزار مسلمانوں کو نظر بندی کیمپوں میں رکھا گیا ہے۔ جہاں انہیں ناقابلِ بیان اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ امریکی ہفت روزہ ٹائم اور دوسرے اخباری نمائندوں نے حال ہی میں بوسنیا کا دورہ کر کے وہاں کی لرزہ خیز تفصیلات بیان کی ہے۔ دریائے بوسنیا کے واقع یہ ملک بوسنیا، مشرقی یوروپ کا حسین ترین خطہ ہے یہ واقعی طور پر جنت نظیر ہے۔ لیکن آج اسے جہنم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

ایک صحافی نے ہراتو نامی قصبہ کے ایک پرائمری اسکول میں قائم نظر بندی کیمپ کا حال لکھا ہے۔ جہاں ۵۰۰ مسلم قیدیوں کے جسم کا سارا خون اس لئے نچوڑ لیا گیا کہ زخمی سربیائی باشندوں کو تازہ خون فراہم کیا جا سکے۔ اسی طرح اوگوسکا قصبہ میں واقع سوزے کے عارضی کیمپ میں سربیائی دہشت گردوں نے قیدیوں کو الٹا لٹکا کر ان کی آنکھیں نکال لیں۔ ٹائم کے نمائندہ اومیک السٹرنے جو رپورٹ دی ہے۔ وہ قابلِ ذکر ہے السٹر لکھتا ہے۔

بوسنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ نہ صرف بڑی حد تک ناقابل یقین ہے۔ بلکہ قدم قدم پر نازی جرمنی کی یادیں دلاتا ہے۔ اس خطہ میں ایک ایسی جنگ لڑی جا رہی ہے جس کا اصل نشانہ معصوم شہری ہیں انہیں ہراساں اور خوف زدہ کرنے۔ اپنی بستیوں کو چھوڑ کر بھاگ جانے اور یہاں تک کہ قتل کر ڈالنے کے ایک ایسے منصوبہ پر عمل ہو رہا ہے جو ہر اعتبار سے قابلِ مذمت ہے جو لوگ بوسنیا سے فرار ہو رہے ہیں۔ انکا واحد مقصد

صرف اپنی جان بچانا ہے۔ ایک بوسنیائی خاتون نے روتے ہوئے اپنی بپتا سنائی۔ اس نے کہا کہ ظالموں نے میرے شوہر اور میرے بیٹے کو ہلاک کر دیا۔ انہوں نے میرا گھر جلا ڈالا۔ ایک پناہ گزین توفیق محرم نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں کو رتنک کا واحد شخص ہے۔ جو اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ ۲۰ رجون کو سربیائی ملیشائی کے جوانوں نے اس گاؤں کے ۷۵ نوجوان بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو ایک مکان کے تہ خانہ میں بند کر کے انہیں دستی بموں سے ہلاک کر دیا۔ ان کی چیخ پکار سنکر یہ وحشی دیوانہ وار رقص کرتے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔

بوسنیا کے ایک شہر بوسانسکی نووی میں تمام مسلمانوں کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا ان کے گھر جلا دیئے گئے۔ ان کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ اور انہیں ایک اسٹیڈیم میں کئی روز تک بھوکا پیاسا بند رکھا گیا۔ پھر ایک ایک کر کے ان سے ایسی دستاویزوں پر دستخط کرائے گئے۔ جن کے تحت وہ اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائدادوں سے دست بردار ہو گئے۔ یہ چند واقعات ہیں۔ جو ہم نے بیان کئے ہیں۔ ورنہ ظلم و ستم کی یہ داستان بہت طویل ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کر کے بوسنیا کو انسانی بنیادوں پر پہونچائی جانے والی امداد کی تقسیم میں حائل رکاوٹوں کو طاقت کے ذریعہ دور کرنے کی منظوری دیدی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طاقت کا استعمال کون کرے گا۔ کیا اس کے لیے امن فوج بنائی گئی ہے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کو فوری طور پر اسلحہ کی امداد اور غذائی میڈیکل امداد کی سپلائی کے امکانات فی الحال نظر نہیں آتے۔ اس سلسلہ میں بڑے اسلامی ممالک پاکستان، ترکی، سعودی عرب اور مصر بالکل خاموش ہیں۔ عرب لیگ نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کیا ان کا رویہ انتہائی قابل مذمت ہے۔ ادھر امریکی صدر جارج بش صاف کہہ چکے ہیں کہ بوسنیا میں فوجی کارروائی خارج از بحث ہے۔ بوسنیا کے بے یار و مددگار مسلمانوں کی مدد کرنے والا آج کوئی نہیں ہے۔

بش کی عراق دشمنی

امریکی صدر جارج بش کے لیے عراق اور اس کے صدر صدام حسین، صرف خطۂ عرب کے لئے نہیں، بلکہ ان کی ذات کے لئے بھی ایک مسئلہ ہیں۔ جارج بش اور ان کے اتحادیوں فرانس، برطانیہ کی نیند آج کل اس لئے حرام ہے کہ خلیجی جنگ میں اتنا بڑا دھکا لگنے کے بعد بھی عراق، پروان چڑھ رہا ہے۔ اور وہاں صدر صدام حسین برجمان ہیں ان کے خیال کے مطابق صدام حسین کے خلاف اب تک بغاوت ہو جانی چاہیئے تھی۔ اور عراق کی تقسیم ہو جانا چاہیئے تھی۔ بش کی عراق پالیسی بنیادی طور پر ناکام رہی۔ کویت کو اگرچہ آزاد کرا لیا گیا۔ لیکن امریکی رائے عامہ کو وہ نہ جیت سکے۔ اب جبکہ نومبر میں صدارتی چناؤ سامنے ہیں۔ اور اپنے مدمقابل کلنٹن سے وہ پیچھے ہیں انہوں نے رائے عامہ کو جیتنے کے لئے ایک اور چال چلی۔ امریکہ نے اپنے اتحادیوں فرانس اور برطانیہ کے ساتھ میں۔ عراق کے جنوبی حصہ میں اپنے طیارے اتار دیئے۔ اور اس کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ عراقی فوج کو اس خطہ میں شیعہ باغیوں کے خلاف کارروائی نہ کرنے دی جائے گی۔ اور عراقی طیاروں کی آمد روک دی جائے گی۔ عراقی شیعوں کے ساتھ جارج بش کی یکایک یہ ہمدردی محض اس لئے ہے کہ وہ اس طرح صدام کے اقتدار کو ہلا کر خلیجی جنگ کے ناکام مقاصد کو کامیاب کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عراق کو تین خطوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں شیعہ جنوبی عراق، شمالی کرد عراق اور وسطی یا عراق عرب، کیا وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسے تو تاریخ ہی بتائے گی۔ مشرق وسطیٰ کا منظر اب بدل چکا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب سلطنت عثمانیہ کے پارہ پارہ ہونے کے بعد مغربی طاقتوں نے عرب ممالک کو الگ الگ کیا تھا۔ وہ وقت اور ماحول اور تھا۔ آج کا ماحول قطعی مختلف ہے۔ آج مشرق وسطیٰ کا ہر باشندہ مغرب کی عیاری و مکاری سے پوری طرح ہوشیار ہو چکا ہے۔ تقسیم فلسطین اور اسرائیل کی تشکیل کا تلخ تجربہ عربوں کے ذہن سے دور نہیں کیا جا سکا۔ قلب عرب میں ناسور کے طور پر اسرائیل کو وجود میں لانے کا

محض اس علاقہ کو جو تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ اپنے تسلط میں رکھنا تھا۔ آج بھی امریکہ اور اس کے اتحادی حلیفوں کی نگاہ عراق کی تیل کی دولت پر ہے۔ عراق اور مشرق کے تمام باشندے۔ جو گذشتہ صدیوں سے مغرب کے استحصال کا شکار رہے ہیں اب سیاسی طور پر ہوشمند اور باشعور ہیں اور اہل مغرب کی ان عیاریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان حالات میں جارج بش کے لئے اپنے مقصد میں کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔

نشستند و گفتند و برخاستند

جکارتہ کی ناوابستہ کانفرنس اس لحاظ سے اہم تھی کہ یہ ایسے پس منظر میں منعقد ہوئی۔ جبکہ عالمی سیاست کا منظر بدل چکا ہے۔ امریکہ دنیا کی واحد بڑی طاقت بن چکا ہے۔ اقوام متحدہ امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کی آلہ کار بن چکی ہے۔ ناوابستہ کانفرنس میں طول طویل تقریروں میں نمائندوں نے اس پر زور دیا کہ اب اقوام متحدہ میں ویٹو کا اختیار دوسروں کو بھی ملنا چاہیئے۔ کانفرنس نے جو دستاویز یا اعلان جاری کیا ہے اس میں ہندوستانی ترمیم کے ذریعہ عالمی سطح پر بڑھتی ہوئی دہشت گردی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ ناوابستہ ممالک نے اس پر زور دیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک امداد کے معاملہ میں ان کے ساتھ ہمدردی سے کام لیں۔ یہ سب تقریریں رسمی کارروائی تھیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے۔ مانگنے والے، انتخاب کا حق نہیں رکھتے۔ ہم ہر معاملہ میں تو ترقی یافتہ ملکوں کی امداد کے محتاج ہیں۔ آزادی کے بعد گذشتہ چالیس پینتالیس برسوں میں ہم نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ ہمیں خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔ قرضوں پر قرضے لیتے رہے۔ اور اسکو ترقی سمجھتے رہے تقریباً تمام ناوابستہ ملکوں کا یہی حال ہے۔

کیا کشمیر کا مسئلہ کبھی حل ہو گا۔ جب کہ یہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جارہا ہے پاکستان کی طرف سے پنجاب اور کشمیر میں دہشت گردوں کی ٹھوس امداد سے یہ مسئلہ اور ٹیڑھا ہو گیا۔ اس سلسلہ میں بار بار توجہ دلانے کے باوجود پاکستانی روش میں کوئی فرق

نہیں آیا اگر دونوں ممالک سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیں اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ اس مسئلہ پر بات چیت کریں تو یہ مسئلہ آج بھی حل ہو سکتا ہے ۔

ترتیب مصحف ایک جائزہ

(حافظ سید ظفیر علی دارالسلام عمرآباد)

دنیا کے کسی مذہب کا کوئی الہامی صحیفہ صحت میں قرآن مجید کا مقابلہ نہیں کرسکتا ان سب میں کچھ نہ کچھ رد و بدل ہوگیا ہے اور بعض میں تو اتنا تغیر ہوگیا ہے کہ بتانا مشکل ہے کہ اس میں خدا کا کلام کتنا ہے اور انسانی تصرفات کس قدر رہے، یہ امتیاز صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس حال میں بنی نوع انسانی کے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے من وعن ہو بہو سرمو تفاوت کے بغیر یہ خدائی صحیفہ آج بھی دنیا میں موجود ہے [1]

قرآن مجید کی کتابت قرآن مجید پورا کا پورا ایک دفعہ میں نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ کبھی چند آیتیں ہی اتریں تو کبھی پوری ایک سورت کا نزول ہوا [2] علامہ سیوطی لکھتے ہیں،

الذی استقری من الاحادیث الصحیحۃ ان القرآن کان ینزل بحسب الحاجۃ عشر آیات وعشر آیات واکثر واقل۔ [3]

احادیث صحیحہ کے استقرار اور تتبع سے پتہ چلتا ہے کہ وحی کا نزول کسی خاص واقعہ اور ضرورت کے پیش آنے پر ہوتا تھا کبھی پانچ آیتیں کبھی دس آیتیں اور کبھی اس سے کم و بیش آیات نازل ہوتے۔

بہرحال جب بھی کلام الٰہی کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبین وحی کو بلا کر ہدایت فرماتے کہ اس حصے یا اس سورہ کو فلاں سورہ میں فلاں آیت یا فلاں سورہ کے بعد لکھا جائے چنانچہ آپ کی ہدایت اور حکم کے مطابق وہ لکھ لیا جاتا تھا حضرت عثمانؓ کا بیان ہے۔

کان رسول اللہ مما یاتی علیہ — وحی کے زمانے میں رسول اللہ پر متعدد سورتیں نازل

---

[1] شاہ معین الدین ندوی، معارف ماہ مئی ۱۹۴۹ء، تدوین قرآن مرتب غلام ربانی [2] تعارف قرآن مجید از مولانا صدرالدین اصلاحی [3] اتقان نوع سادس عشر،

الزمان وھو ینزل علیہ السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیہ الشیء دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا ھذہ الآیۃ فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا وکذا۔ لہ	ہوتی جب آپ پر کچھ حصہ نازل ہوا کرتا تو آپ کا تبان وحی میں سے کسی کو طلب کرتے اور فرماتے کہ ان آیات کو اس سورہ میں درج کر دجس میں ایسا اور ایسا مذکور ہے۔

اس طرح ایک طرف تو قرآن کی کتابت سرکاری اہتمام میں ہوتی رہتی تھی دوسری طرف بہت سے صحابہ اسے نجی طور پر ضبط تحریر میں لاتے رہتے تھے چنانچہ حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، اور حضرت ابو زید وغیرہ نے تو پورا قرآن مرتب و مدون شکل میں لکھ لیا تھا۔ ٢ہ

اس کے علاوہ ان صحابہ کرام کے مصاحف بہت مشہور رہیں، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت ابی بن کعب، ٣ہ

ان بیانات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ؐ کے زمانے میں جتنا قرآن نازل ہوتا وہ قید تحریر میں آجاتا اس طرح آپ کی حیات مبارکہ میں پورا قرآن احاطہ تحریر میں آچکا تھا لیکن پورا قرآن ایک صحیفہ کی شکل میں مرتب و مدون نہیں ہوا تھا، اس کے اجزاء، سورتیں منتشر اور غیر مرتب تھیں دیرعاقولی اپنی کتاب فوائد حضرت زید بن ثابت سے روایت نقل کرتے ہیں۔

قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یکن القرآن جمع فی شیء "۔ ٤ہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی لیکن قرآن کسی خاص چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا

امام خطابی فرماتے ہیں۔

وقد کان القرآن کلہ کتب فی عھد	پورے قرآن مجید کی کتابت عہد رسالت۔

لہ ترمذی ابواب التفسیر کنز العمال ج ۱ ص ۲۸۱ ٢ہ قرآن مجید کا تعارف ٣ہ کشاف الہدی مرتبہ یعقوب حسن ص ۱۲۶ بحوالہ بخاری ..... باب تالیف القرآن الاتقان نوع ۱۷ اور ۱۸ تیسیر الوصول کتاب التفسیر۔
٤ہ اتقان نوع ۱۶

رسول اللہ لکن غیر مجموع فی موضع ہی میں مکمل ہو گئی لیکن اس کے اجزا یکجا نہ تھے اور
واحد ولا مرتب السور ۱؎ نہ ہی سورتوں کے درمیان کوئی باہمی ترتیب تھی

جمع قرآن (عہد ابو بکرؓ میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب عرب میں ارتداد کا طوفان اٹھا اور اس کو فرو کرنے کے لئے صحابہ کرام کو سخت خونریز لڑائیاں لڑنی پڑیں تو ان معرکوں میں ایسے صحابہ کی ایک کثیر تعداد شہید ہو گئی جن کو پورا قرآن حفظ تھا۔ اس سے حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں صرف ایک ہی ذریعہ پر اعتماد کر لینا مناسب نہیں ہے بلکہ الواحِ قلم کے ساتھ صفحات قرطاس پر بھی اس کو محفوظ کر لینے کا انتظام کر لینا چاہیئے۔ اس کام کی ضرورت انہوں نے حضرت ابو بکرؓ پر واضح کی انھوں نے کچھ تامل کے بعد اس سے اتفاق کر کے حضرت زید بن ثابت انصاری کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا ایک طرف وہ تمام لکھے ہوئے اجزا فراہم کر لئے جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے ہیں۔ دوسری طرف صحابہ کرام میں سے جس جس کے پاس قرآن یا اس کا کوئی حصہ لکھا ہوا ملے۔ وہ ان سے لے لیا جائے اور پھر حفاظ قرآن سے بھی مدد لی جائے اور ان تینوں ذرائع کی متفقہ شہادت پر کامل صحت کا اطمینان کرنے کے بعد قرآن کا ایک ایک لفظ مصحف میں ثبت کیا جائے۔ ۲؎

حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے۔ فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال ۳؎ یعنی میں نے قرآن کو پتھر کی باریک سلوں، کھجور کی ٹہنیوں اور آدمیوں کے سینوں سے تلاش کرنا شروع کیا۔

اور امام حارث محاسبی اپنی کتاب فہم السنن میں لکھتے ہیں

كتابة القرآن ليست محدثة فانه كان يامر بكتابته ولكنه مفرقا فى الرقاع والاكتاف والعسب فانما امر الصديق کہ قرآن مجید کی کتابت کچھ نئی بات نہ تھی خود آنحضرتؐ نے قرآن کے قلم بند کرنے کا حکم دیا تھا لیکن حضور کے زمانے میں مختلف چیزوں یعنی کاغذ، شانہ کی ہڈی

۱؎ بحوالہ سابق۔ ۲؎ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۹

۳؎ بخاری ج ۲ کتاب فضائل القرآن

بنسخها من مکان الی مکان مجتمعا وکان ذلک بمنزلۃ اوراق وجدت فی بیت رسول اللہ فیہا القرآن منتشرا فجمعہا جامع و ربطہا بخیط حتی لا یضیع منہا شیء۔ [1]

کھجور کے تختہ پر لکھا ہوا تھا، حضرت ابوبکر نے متفرق جگہوں سے اکو یکجا کرنے کا حکم دیا یہ سب اشیاء یوں تھیں جیسے آنحضورؐ کے گھر میں اوراق منتشر پڑے ہوں اور ان میں قرآن لکھا ہوا ہو ایک جمع کرنے والے (حضرت ابوبکرؓ) نے ان اوراق کو جمع کرکے ایک دھاگے سے باندھ دیا تاکہ ان میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہونے پائے۔

اور حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح میں رقم طراز ہیں۔

وقد اعلم اللہ تعالیٰ فی القرآن بانہ مجموع فی الصحف فی قولہ یتلوا صحفا مطہرۃ الآیۃ وکان القرآن مکتوبا فی الصحف لکن کانت مفرقۃ فجمعہا ابوبکر۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بتادیا کہ قرآن صحیفوں میں مجتمع ہے اور قرآن صحیفوں میں لکھا ہوا موجود تھا لیکن یکجا نہ تھا حضرت ابوبکر نے اسکو یکجا کردیا

جمع قرآن عہد عثمان میں لیکن رفتہ رفتہ جب اسلام پھیلا اور عرب کے لوگوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو فتح کرلیا اور دوسری قوموں کے لوگ بھی دائرے اسلام میں آنے لگے اور بڑے پیمانے پر عرب و عجم کے اختلاط سے عربی زبان متاثر ہونے لگی تو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اب بھی دوسرے لہجوں اور محاوروں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت باقی رہی تو اس سے طرح طرح کے فتنے کھڑے ہوجائیں گے ان وجوہ سے حضرت عثمان نے صحابہ کرام کے مشورے سے یہ طے کیا کہ تمام ممالک اسلامیہ میں صرف اس معیاری نسخۂ قرآن کی نقلیں شائع کی جائیں جو حضرت ابوبکر کے حکم سے ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ اور باقی تمام دوسرے لہجوں اور محاوروں پر لکھے ہوئے مصاحف کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے [3]

---

[1] اتقان نوع ۱۸ البرہان الزرکشی (ج ۱ ص ۲۳۹) [2] مقالات شبلی ج ۱ ص ۷ بحوالہ فتح الباری ج ۹ ص ۱
[3] تفہیم القرآن ج اول ص ۲۵۔

امام بخاری صحیح بخاری میں ابن شہاب سے ایک روایت نقل کرتے ہیں اس میں یہ حالات ملتے ہیں اور اسی حدیث کا یہ ٹکڑا ہے۔

فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیک فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید بن ثابت وعبد اللہ بن زبیر وسعید بن العاص وعبد الرحمٰن بن الحارث ابن ھاشم فنسخوھا وقال عثمان للرھط القریشیین الثلثة اذا اختلفتم انتم و زید بن ثابت فی شیء من القرآن فاکتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانھم ففعلوا۔ الحدیث [1]

حضرت حذیفہ بن یمان کی بات کو سن کر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہ کو کہلا بھیجا کہ آپ کے پاس قرآن کے جو صحیفے ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے تاکہ ہم اس کو کتابی صورت میں جمع کریں اور پھر ہم ان کو واپس کر دیں گے انہوں نے وہ صحیفے ارسال کر دیئے حضرت عثمان نے ان چاروں اصحاب کو اس پر مامور فرمایا حضرت عثمان نے تینوں قریشی صحابہ سے کہا کہ جب تمہارے اور زید کے مابین قرآن کی کسی آیت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو تو قرآن کو قریش کی زبان میں لکھے کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا تھا چنانچہ ان لوگوں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی۔

صحف صدیقی اور مصحف عثمانی کا فرق | علامہ عینی شرح بخاری میں صحف صدیقی اور مصحف عثمانی کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں۔

ان الصحف ھی الاوراق المحررة التی جمع فیھا القرآن فی عھد ابی بکر وکانت سوراً مفرقة کل سورة مرتبة بآیاتھا علی حدة لکن لم یرتب بعضھا اثر بعض فلما نسخت ورتب بعضھا

صحیفہ ان اوراق کا نام ہے جو ابو بکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے یہ متفرق سورتیں تھیں جن کی آیتیں مرتب تھیں لیکن خود سورتوں میں باہم کوئی ترتیب نہ تھی۔ پھر جب ان کی نقل لی گئی اور سورتیں آگے پیچھے رکھی گئیں تو اس کا نام مصحف ہوا۔

---

[1] صحیح بخاری
کتاب فضائل القرآن۔

اثر بعض صادت مصحفا ولم یکن مصحفا الا فی عہد عثمان " ۔ [1]

اور یہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوا ۔

اور علامہ ابن التین وغیرہ لکھتے ہیں

الفرق بین جمع ابی بکر وعثمان ان جمع ابی بکر کان بخشیۃ ان یذھب من القرآن شئی بذھاب حملتہ کانہ لم یکن مجموعا فی موضع واحد فجمعہ فی صحائف مرتبا لآیات سورۃ علی ما وقفہم النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجمع عثمان کان لما کثر الاختلاف فنسخ تلک الصحف فی مصحف واحد مرتبا لسورہ واقتصر من سائر اللغات علی لغۃ قریش ۔ [2]

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمان کے جمع قرآن میں فرق یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے قرآن کو اس خوف کی وجہ سے جمع کروایا تھا کہیں ایسا نہ ہو حاملان قرآن کی موت کے ساتھ قرآن کا بھی کوئی حصہ جاتا رہے کیونکہ اس وقت تمام قرآن ایک ہی جگہ جمع نہ تھا اسلئے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کو صحف میں اس ترتیب سے جمع کیا کہ ہر ایک سورۃ کی آیات رسولؐ کے ارشاد کے موافق سلسلہ وار درج ہوگئیں اور حضرت عثمانؓ نے وجوہ قراۃ میں بکثرت اختلاف ہونے کی وجہ سے قرآن کی صحف کو ایک ہی مصحف میں سورتوں کی ترتیب کے ساتھ جمع کردیا اور تمام عرب کی زبانی کو چھوڑ کر فقط قبیلہ قریش کی زبان پر اکتفا کیا ۔

اب یہاں ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ پورا قرآن عہد رسالت میں لکھا جا چکا تھا مگر اس کی آیتیں اور سورتیں یکجا نہ تھیں ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ نے اس کو مرتب فرمایا تو کیا یہ ترتیب توقیفی ہے یا اس میں اجتہادِ صحابہ کا دخل تھا ۔ اس بحث کو ہم دو حصوں میں منقسم کرتے ہیں (۱) ترتیب آیات ۔ (۲) ترتیب سور ۔

ترتیب آیات تمام علماء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن میں آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے بے شمار نصوص اس سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں کہ آیتوں کی ترتیب نبی اکرمؐ نے اللہ تعالیٰ ہدایت

---

[1] عینی ج ۹ ص ۳۰۶ ۔

[2] اتقان نوع ۱۸ ، و مناہل العرفان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۲۵۳ ۔

کے تحت فرمائی ہے علامہ سیوطیؒ اتقان میں رقم طراز ہیں۔

الاجماع والنصوص المترادفة علی ان ترتیب الآیات توقیفی لا شبهة فی ذلک اما الاجماع فنقله غیر واحد منهم الزرکشی فی البرهان وابوجعفر فی مناسباته وعبارته ترتیب الآیات فی سورها واقع بتوقیفه وامره من غیر خلاف فی هذا بین المسلمین ۔ [1]	اجماع ونصوص اس بات پر دال ہیں کہ سورتوں کے آیات کی ترتیب توقیفی ہے اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ رہے اجماع تو اس کو بہت سارے لوگوں نے نقل کیا ہے ان میں زرکشی اور ابوجعفر ہیں، ابوجعفر بن زبیر کی یہ عبارت ہے کہ قرآنی سورتوں میں آیات کی ترتیب آنحضورؐ کے حکم سے قائم کی گئی، ہے مسلمانوں کے یہاں اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ۔

اس کے بعد علامہ سیوطیؒ نے ان تمام نصوص اور علماء کے اقوال کو بالتفصیل ذکر کیا ہے۔

نصوص وارده (۱) امام حاکم نے مستدرک میں حضرت زید بن ثابت سے شیخین کے شرط کے موافق یہ حدیث روایت کی ہے۔

کنا عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع الحدیث قال البیهقی یشبه ان یکون المراد به تالیف ما نزل من الآیات المفرقة فی سورها وجمعها باشارة النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ۔ [2]	حضرت زید فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللّٰہؐ کے پاس قرآن کو مختلف اشیاء کے ٹکڑوں سے جمع کرتے تھے ۔ امام بیہقی اس کا مطلب بیان کرتے ہیں کہ ٹکڑوں سے نقل کر کے نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق قرآنی آیات و سور کو مرتب کیا جاتا تھا

(۲) دوسری حدیث حضرت ابن عباس کی ہے جسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی ابن حبان اور حاکم نے نقل کیا ہے۔

قال عثمان کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم تنزل علیه السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیه الشیٔ دعا البعض	حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن عباس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ نبیؐ پر مختلف سورتیں نازل کی جائیں، جب آپ پر کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبین

---

[1] اتقان ج ا نوع ۱۸ و البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ج ۱ ص ۲۵۔
[2] اتقان ج ا نوع ۱۸ ۔

من یکتب فیقول ضعوا ھؤلاء الآیات فی السورۃ التی یذکر فیہا کذا و کذا۔[۱]　　وحی میں سے کسی کو بلاتے اور یہ حکم دیتے کہ ان آیتوں کو اس سورۃ میں رکھو جہاں فلاں فلاں باتوں کا ذکر ہے

امام حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرمایا ھٰذا صحیح الاسناد[۲]

(۳) امام احمد نے اسناد حسن کے ساتھ حضرت عثمان بن ابی العاص سے یہ روایت کی ہے

کنت جالسا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ شخص ببصرہ ثم صوبہ ثم قال اتانی جبریل فامرنی ان اضع ھٰذہ الآیۃ ھٰذا المواضع من ھٰذہ السورۃ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان و ایتاء ذی القربیٰ الی اٰخرھا۔[۳]　　میں ایک مرتبہ بارگاہ نبوی میں بیٹھا تھا آپ نے نگاہ اٹھائی اور پھر نیچے کر کے فرمایا کہ۔ میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے تھے انہوں نے کہا آیت کریمہ ان اللہ یامر بالعدل الخ کو فلاں سورہ میں فلاں جگہ رکھئے۔

(۴) اسی طریقہ سے امام مسلم حضرت عمرؓ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔

قال ما سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن شیء اکثر مما سالتہ عن الکلالۃ حتی طعن باصبعہ فی صدری و قال تکفیک اٰیۃ الصیف التی فی اٰخر سورۃ النساء۔[۴]　　حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ سے کلالہ سے زیادہ کسی چیز کے متعلق نہیں پوچھا یہاں تک کہ آپ نے میرے سینہ پر مارا اور فرمایا تیرے لئے آیت صیف جو سورہ نساء کے آخر میں ہے۔

ومنہا الاحادیث فی خواتیم سورۃ البقرۃ　　یا سورہ بقرہ کے آخر کی آئتیں کافی ہیں۔

(۵) نیز حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی وہ روایت بھی ہے جس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے

قلت لعثمان والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا قد نسختہا الآیۃ الاخریٰ فلم تکتبہا او تدعہا قال یا ابن اخی لا اغیر شیئا من مکانہ۔[۵]　　میں نے حضرت عثمانؓ سے کہا یہ آیت والذین یتوفون الخ کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے پھر آپ نے اس کو کیوں باقی رہنے دیا حضرت عثمانؓ نے فرمایا بھتیجے! میں قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

---

[۱] بحوالہ سابق [۲] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۲۱ [۳] اتقان نوع ۱۸۔
[۴] بحوالہ سابق۔ [۵] اتقان جلد ۱ نوع ۱۸ اور صحیح بخاری ج ۲۔

علامہ زرقانی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

فھذا حدیث ایدج من الصبح فی ان اثبات ھذہ الایۃ فی مکانھا مع نسخھا توقیفی لایستطیع عثمان باعترافہ ان یتصرف فیہ لانہ لا مجال سوائی فی مثلہ۔ [1]

یہ حدیث بالکل واضح ہے کہ حضرت عثمان کو معلوم تھا کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے مگر تاہم اس آیت کو اس جگہ سے تبدیل نہ کر سکے کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ حضرت جبرئیل سرور کائنات کو ترتیب قرآن سے آگاہ کر چکے ہیں اس لئے اب کسی شخص کو اس میں تبدیلی کا مجال نہیں۔

(۶) صحیح مسلم میں حضرت ابو الدرداء کی یہ روایت مرفوع ذکر ہے

من حفظ عشر ایات من اول سورۃ الکھف عصم من الدجال۔ [2]

جو شخص بھی سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات کو یاد کرے وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا

(۷) اس کے علاوہ بہت سی ایسی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے متعدد سورتیں صحابہ کرام کو سنایا ہے چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں۔

ومن النصوص الدالۃ علی ذالک اجمالا ماثبت من قراءتہ لسور عدیدۃ کسورۃ البقرۃ وآل عمران والنساء فی حدیث حذیفۃ والاعراف فی صحیح البخاری انہ قراھا فی المغرب وقد افلح روی النسائی انہ قراھا فی الصبح والم تنزیل وھل اتی علی الانسان روی الشیخان انہ کان یقرؤھما فی صبح الجمعۃ والرحمن فی المستدرک وغیرہ انہ قرأ علی الجن و

کتب حدیث میں ایسی لاتعداد روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ آپ قرآن کریم کی متعدد سورتیں صحابہ کو پڑھ کر سناتے نماز کے دوران یا خطبہ میں مثلاً سورہ بقرہ آل عمران اور نساء، ان سورتوں کا پڑھنا حضرت حذیفہ کی روایت میں ثابت ہے سورہ اعراف صحیح بخاری کی روایت کے مطابق مغرب میں پڑھتے نسائی نے نقل کیا ہے کہ آپ سورۃ قد افلح صبح میں پڑھی ہے سورہ سجدہ اور سورہ دھر کا جمعہ کے صبح میں، سورہ ق کا خطبہ جمعہ میں، سورہ رحمن کا جن کے سامنے اور

---

[1] مناہل العرفان فی علوم القرآن للزرقانی ج ۱ ص ۲۴۱۔

[2] اتقان نوع ۱۸۔

فی صحیح مسلم انہ کان یقرؤھا فی الصلوٰۃ والنجم فی صحیح انہ قرأھا علیھم بان انزلت حتی ختمھا فی سور شتی فی المفصل۔

سورہ نجم کا کفار کے پاس مختلف روایات کی روشنی میں آپ کا پڑھنا ثابت ہے

اس کے بعد علامہ سیوطی فرماتے ہیں

تدل قرأتہ صلی اللہ علیہ وسلم بھا بمشھد من الصحابۃ ان ترتیب آیاتھا توقیفی وما کان الصحابۃ لیرتبوا ترتیبا سمعوا النبی یقرأ علی خلافہ فبلغ ذالک مبلغ التواتر۔ [۱]

صحابہ کی موجودگی میں آپ کی تلاوت اس امر کی صریح دلیل ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ صحابہ کرام کسی سورت کی آیات کو آنحضور کی ترتیب کے خلاف تلاوت کریں۔ ۹ ہوا کہ آیات کی ترتیب تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہے

اقوال علماء

علامہ سیوطی نے مختلف علماء کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔

قال مکی وغیرہ ترتیب الآیات فی السور بامر من النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یامر بذلک فی اول براءۃ ترکت بلا بسملۃ [۲]

امام مکی وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ قرآنی سورتوں میں آیات کی ترتیب نبی اکرمؐ کی تعلیم و توقیف سے ہوئی اور چونکہ آپ نے سورہ براۃ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کا حکم دیا اس لئے بسم اللہ نہ لکھا گیا۔

وقال القاضی ابوبکر فی الانتصار ترتیب الآیات امر واجب وحکم لازم فقد کان جبریل یقول ضعوا آیۃ کذا فی موضع کذا [۳]

قاضی ابوبکر انتصار میں فرماتے ہیں کہ ترتیب آیات یہ امر واجب اور حکم لازم ہے کیونکہ حضرت جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دیتے کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھئے۔

وقال ابن الحصار ترتیب السور ووضع الآیات مواضعھا انما کان بالوحی کان رسول اللہ

ابن حصار کا بیان ہے کہ ترتیب آیات اور ترتیب سور یہ وحی کے مطابق تھی اس لئے کہ رسول ؐ حکم دیتے

---

[۱] ... [۲] اتقان ج ۱ نوع ۱۸۔
[۳] ...

تولی ضعوا کذا وقد حصل الیقین
قد حصل الیقین من النقل المتواتر بھذا
لترتیب من تلاوۃ رسول اللہ وانما
جمع الصحابۃ علی وضعہ ھکذا فی المصحف

فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھو اور رسول اللہ
کی تلاوت سے یقین حاصل ہوا کیونکہ یہ نقل متواتر
سے ثابت ہے اور صحابہ کرام نے اس کو اسی ترتیب
پر رکھنے پر اجماع کرلیا۔

تقریباً یہی دلائل اور اقوال علامہ سیوطی کے علاوہ علامہ زرکشی زرقانی مناع القطان علامہ
وسی اور ڈاکٹر صبحی صالح وغیرہ ہم نے پیش کئے ہیں [۲]

ایک شبہ اور اس کا جواب البتہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی ایک حدیث جسے ابن ابی داؤد نے
پنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس کے علاوہ چند حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیتوں کی
موجودہ ترتیب توقیفی نہیں ہے صحابہ نے اس میں اپنے اجتہاد کے ذریعہ کچھ رد و بدل کیا ہے اس
حدیث کو ذکر کر کے علامہ آلوسیؒ اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں۔

مایدل بظاھرہ من الاثار علی انہ اجتھادی
معارض ساقط عن درجۃ الاعتبار کالخبر
الذی اخرجہ ابن ابی داؤد بسندہ عن
عبد اللہ بن الزبیر قال اتی الحرث بن خزیمۃ
بھاتین الآیتین من اخر سورۃ براۃ
فقال اشھد
انی سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم ووعیتھا فقال عمر وانا اشھد
لقد سمعتھما ثم قال لو کانت ثلاث
آیات لجعلتھا سورۃ علی حدۃ فانظروا

اور جن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ترتیب
آیات اجتہادی ہے تو یہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے ا
جیسے وہ حدیث جس کو ابن ابی داؤد نے عبداللہ بن
زبیر سے روایت کیا ہے کہ حرث بن خزیمہ سورہ براۃ
کی آخری دو آیتوں کو لے کر آئے اور کہا میں گواہی
دیتا ہوں۔
کہ میں نے ان آیتوں کو رسول اللہؐ سے سنا ہے تو حضرت
عمرؓ نے فرمایا میں بھی اس بات پر شاہد ہوں کہ میں
نے ان کو آپ سے سنا ہے پھر کہا کہ اگر تین آیتیں ہوتیں
تو میں اسکو ایک الگ سورۃ بنا دیتا۔ لیکن ان سے

---

[۱] ایضاً
[۲] دیکھئے البرہان للزرکشی نوع ۱۴۔ مناہل العرفان ج ۱ ص ۲۴۰-۳۴۰ مباحث فی علوم القرآن مناع
القطان ص ۱۳۹ علوم القرآن ڈاکٹر صبحی صالح مترجم غلام احمد حریری ص ۱۱۱ اور مقدمہ روح المعانی

اخر سورۃ من القرآن فالحقوھما فی
اخر ھا فانہ معارض بما لا یحصی مما یدل
علی خلافہ بل لابن ابی داؤد نفسہ خبر
یعارضہ ایضا فقد اخرج ایضا عن ابی
انھم جمعوا القرآن فلما انتھوا الی
الایۃ التی فی سورۃ براۃ ثم انصرفوا صرف
اللہ قلوبھم ظنوا ان اخر ما نزل فقال
ابی ان رسول اللہ اقرانی بعد ھذا
ایتین لقد جاءکم رسول.. لہ

سی احادیث کے معارض ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے
کہ ترتیب آیات توقیفی ہے بلکہ خود ابن ابی داؤد نے
ایک حدیث روایت کی ہے جو اس کے معارض ہے
حضرت ابی سے مروی ہے کہ جب وہ لوگ جمع قرآن
کے وقت سورہ براۃ کی اس آیت پر پہونچے ثم انصرفوا
تو دوسروں کا خیال ہوا کہ یہ آخری آیت ہے تو
حضرت ابیؓ نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ نے ان دونوں
آیتوں کے بعد مجھے یہ آیت لقد جاءکم الخ پڑھائی
ہے۔

اسی کو علامہ زرقانی اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

یقولون ھذا الحدیث یدل علی ان
ترتیب الآیات لم یکن فی القرآن کلہ
بتوقیف انما کان ھوی من الصحابۃ و
عن تصرف منھم ولو فی بعض ۔

لوگوں کا خیال ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا کہ قرآنی
آیتوں کی ترتیب توقیفی نہیں ہے بلکہ ان میں صحابہ کی
خواہش اور ان کے تصرف کا دخل ہے گرچہ یہ تصرف
بعض آیتوں ہی میں کیوں نہ ہو۔

ونجیب (اولا) بان ھذا الخبر معارض للقاطع
وھو ما اجمعت علیہ الامۃ ومعارض
القاطع ساقط عن درجۃ الاعتبار فھذا
خبر ساقط مردود علی قائلہ
(ثانیہ) انہ معارض لما لا یحصی من الاخبار
الدالۃ علی خلافہ وقد تقدم کثیر منھا بل
لابن ابی داؤد نفسہ خبر یعارضہ لہ

اس کا جواب ہم اسطرح دیتے ہیں کہ اولاً یہ حدیث
اجماع امت کے معارض ہے اور جو حدیث قاطع کی
معارض ہو وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے
تو یہ حدیث ناقابل قبول ہے اور مردود ہے
دوسری بات یہ کہ یہ حدیث ان لاتعداد حدیثوں کے
بھی خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیتوں کی
موجودہ آیت توقیفی ہے بلکہ ابن ابی داؤد نے بھی

لہ مقدمہ روح المعانی علامہ آلوسیؒ
لہ مناہل العرفان فی علوم القرآن ص ۳۴۲ ۔

ایک حدیث نقل کیا جو اس کے خلاف ہے

ترتیب سور | ترتیب سور کے توقیفی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں علماء کی تین رائیں ہیں۔ (۱) جمہور کی رائے ہے کہ سورتوں کی ترتیب غیر توقیفی ہے۔ موجودہ ترتیب سورہ صحابہ کرام نے اپنے اجتہاد سے مقرر کی ہے[1] یہ قول اساطین امت کی ایک بڑی تعداد کی جانب منسوب ہے جن میں حافظ ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) امام رازی (متوفی ۶۰۶ھ) امام نووی (متوفی ۶۷۶ھ) شیخ بدر الدین الزرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) علامہ عینی (۸۵۵ھ) شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) مولانا انور شاہ کشمیری متوفی (۱۳۵۲) اور علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴ء) کے اسمائے گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ موجودہ ترتیب کے متعلق کوئی منصوص حکم نہیں پایا جاتا ہے سورتوں کی ترتیب کا حق صحابہ کرامؓ کو تفویض کر دیا گیا تھا انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ ترتیب مقرر کی ہے اسی وجہ سے اس ترتیب کے مطابق تلاوت وقرأت بھی ضروری نہیں[2]

جمہور نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) پہلی دلیل حضرت حذیفہ کی وہ حدیث ہے جسکو امام مسلمؒ، امام احمد اور امام النسائی نے نقل کیا ہے

صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃ فافتتح البقرۃ فقلت یرکع عند المائۃ ثم مضی فقلت یصلی بھا فی رکعۃ فمضی فقلت یرکع بھا فمضی ثم افتتح النساء فقرأھا ثم افتتح آل عمران فقرأھا مترسلا۔	میں ایک رات رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا آپ نے سورہ بقرہ کی تلاوت شروع فرمادی میرا خیال ہوا کہ سو آیات پوری ہونے پر رکوع کریں گے لیکن آپ کی قراۃ جاری رہی پھر میں نے سوچا سورہ مکمل کرنے کے بعد رکوع میں جائیں گے۔ لیکن آپنے سورہ نساء کی تلاوت شروع کردی، سورہ پوری ہو

---

[1] دیکھئے البرہان نوع ۱۴، مباحث فی علوم القرآن مناع القطان اور مناہل العرفان فی علوم القرآن۔
[2] قرآنی سورتوں کی ترتیب اور اجتہاد صحابہ از مولانا ندوی سہ ماہی تحقیقات اسلامی علیگڈھ اپریل وجون ۱۹۸۰ء بحوالہ۔

جانے کے بعد سورۂ آل عمران کی تلاوت فرمائی اور اسے بھی ترسیل کے ساتھ ختم کردیا۔

قاضی عیاض اس حدیث کی شرح میں بیان فرماتے ہیں۔

فیہ دلیل لمن یقول ان ترتیب السور اجتہاد من المسلمین حین کتبوا المصحف وانہ لم یکن ذالک من ترتیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل وکلہ الی امتہ بعدہ قال وھذا قول مالک والجمہور واختارہ القاضی ابوبکر الباقلانی قال ابن الباقلانی وھو اصح القولین قال والذی نقولہ ان ترتیب السور لیس بواجب فی الکتابۃ ولا فی الصلاۃ ولا فی الدرس ولا فی التلقین والتعلیم ولذلک اختلف ترتیب المصاحف قبل مصحف عثمان۔ [1]

اس حدیث میں ان حضرات کے لئے دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ ترتیب سور اجتہادی ہے۔ اور توقیفی نہیں ہے اور یہ قول مالک اور جمہور علما کا ہے اور قاضی باقلانی نے اسکو اختیار کرکے فرماتے ہیں کہ ترتیب سور کتابت نماز، درس وتدریس اور تعلیم وتلقین میں کوئی ضروری نہیں ہے اسلئے مصحف عثمانی سے قبل صحابہ کے مصاحف بھی مختلف ہوگئے۔

(۲) انکی دوسری دلیل وہ روایت ہے جس کو ابن اشتہ نے مصاحف میں اسماعیل بن عباس عن حبان بن یحیٰ عن ابی محمد القرشی کے طریق سے نکالا ہے۔

قال امرھم عثمان ان یتابعوا الطوال فجعل سورۃ الانفال وسورۃ التوبۃ فی السبع ولم یفصل بین بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

[1] تفسیر طبری۔ صحیح مسلم مع شرح نووی، تفسیر کبیر، البرہان ج ۱، فتح الباری ج ۹ عمدۃ القاری ج ۹ الفوز الکبیر فیض الباری ج ۲ مقالات شبلی ج ۱ فتاوی ابن تیمیہ ج ۱۳ نیل الاوطار ج ۲ باب جہر الصلوۃ فتح الباری ج ۹

حضرت مولانا قاری محمد طیب شاعر کی حیثیت سے

از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

قسط ۷

نواب نظام حیدرآباد دکن نے دارالعلوم دیوبند کے طلبا، کے لئے سالانہ تقریب عید الفطر اور عید الاضحیٰ پانچ سو روپیہ دینا منظور کیا تھا، اس سے متاثر ہو کر قاری محمد طیب نے ایک نظم "شکریہ نظام دکن" کے عنوان سے کہی، چند اشعار لائق توجہ ہیں ؎

بحر راحت کا تلاطم لے چلا سوئے دکن — مژدہ اے دل ہو مبارک تجھکو شوق انجمن
ہو رہی ہیں ناامیدی پر امیدیں خندہ زن — پھوٹ نکلی ہے افق سے مہر ہمت کی کرن
کیا عجب چشم تصور نے بندھا انتظام — سامنے اک دم میں کر دی درگہ شاہ نظام
اے کہ عالم میں طراز مسند عظمت ہے تو — ظلمت گیتی میں ماہ نصرت ملت ہے تو
ہستیاں ہیں راحت آمادہ تو تیرے نام سے — اور شرف اندوز ہے دنیا تیرے انعام سے

اس نظم کے ابتدائی اشعار ان مذکورہ اشعار سے بھی زیادہ دلچسپ اور زوردار ہیں، یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

اے سرور محفل عالم عجب ہے تیری تاب — بحر شادی میں ہے پیدا جزر و مد کا انقلاب
جلوہ پیدا ہے ہر ایک ذرہ مثال آفتاب — مدعی ہے آسماں کی یہ زمیں خاک باب
دل کا غوغا ہے کہ لا ساقی مئے ناب سخن — ساغر و مینا ہے خالی اور پیاسی انجمن
رخصت اے ذوق خموشی چھوڑ دے اپنا مکاں — دیکھنے دے اب تکلم کی بھی مجھ کو شوخیاں
آسماں آسا ابھرتا ہے مرا عجز بیاں — صورت سے ہوں سراپا اپنی بہجت کا نشاں

۱؎ عرفان عارف ص ۱۶

شعلۂ سوز الم ہے آج میں کو سوں ہوں دور / چھیڑ مت مجھکو کریں ہو لطف صہبائے سرور

مولانا قاری محمد طیب نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں کوثر العلوم کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی ہے۔ جس میں اکابر دار العلوم دیوبند کی خدمات بیان کی گئی ہیں اور مسلمانوں کے انقلابات کی طرف اشارہ کرکے انہیں دین اور تعلیم کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

یہ نظم گرچہ زمانہ طالب علمی میں کہی گئی ہے تاہم اسمیں جتنا زور بیان سلاست و روانی، منظرکشی اور خوبصورت اسلوب نظر آتا ہے، اسکو پڑھ کر ایک اچھے قادر الکلام اور استاد شاعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ آپ بھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور اس زبان و بیان سے لطف اٹھائیے ؎

یہ کیسی دھوم ہے باغ جہاں میں آج اے ہمدم / گلوں سے بلبل نالاں گلے ملتی ہے کیوں باہم
خوشی میں کیوں ترانے گا رہی ہیں قمریاں باہم / برستا ہے یہاں پر ابر رحمت آج کیوں چھم چھم
ہوئے جاتے ہیں گل جامے سے باہر شادمانی سے / ہوئی جاتی ہے بلبل مست اپنی نغمہ خوانی سے
خرام ناز سے باد بہاری آج آتی ہے / بنا کر ہار پھولوں کا چمن میں ساتھ لاتی ہے
چمن میں ہر طرف سے یہ مبارک باد آتی ہے / مبارک ہو بہار بے خزاں گلشن میں آتی ہے
پلا دے ایک ساغر ساقی رنگیں بیاں مجھ کو / تیری آنکھوں کے صدقے دے شراب ارغواں مجھکو
بتادے عالم اسرار کے راز نہاں مجھکو / پلا دے وہ مئے عرفاں کہ کر دے بے نشاں مجھکو
مضامیں کا چلا ہے دل سے اک قلزم رواں ہوکر / مرے عجز بیاں نے سر اٹھایا آسماں ہوکر
تخیل کے ہے سینہ میں مضامین کی فراوانی / تصور کے خزانے میں ہے تصدیقوں کی ارزانی

شاعر آگے چل کر مسلمانوں کی ترقی اور ان کے زوال کی داستان پیش کر رہا ہے، اور اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ عرب جیسی وحشی قوم نے جب نبی آخر الزماں کو اپنا ہادی اور رہبر تسلیم کر لیا۔ اور ان کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گذاری تو اللہ نے انھیں دنیا کی بادشاہت مرحمت فرمائی اور زندگی کے ہر میدان میں انہیں رہبر بنایا اور جب انھوں نے اس سے منہ موڑا تو نامرادی و ناکامی ان کے حصہ میں آئی، دیکھئے اس تاریخی واقعہ کو کس خوبصورت دلچسپ پیرایہ، زبان میں بیان کیا گیا ہے، اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

لے عرفان عارف ص ۳۷

عرب کے وحشیوں کو وہ بتائی تمدن کی — کہ یورپ کے مہذب خوشہ چیں ہو گئے ان کی

وہ وحشی قوم جو کل تک کہ خود گمراہ پھرتی تھی — بنی ہے رہنما اللہ اکبر آج عالم کی

غرض اس قوم پر وہ وہ ہوئے الطاف رحمانی — شتربانی کے بدلے میں ملی ان کو جہاں بانی

دل و جان سے رہے جب تک کہ تم اسلام پر شیدا — سروں پر تھا تمہارے نیر اقبال کا سایا

مگر مذہب کی پابندی سے جوں ہی تم نے منہ موڑا — تو پھر اقبال نے بھی دوسری جانب کا رخ بدلا

نہ کی جب قدر اس کے نور کی کچھ اہل مشرق نے — طلوع آفتاب ہونے لگا آخر کو مغرب سے

عزیزو تم کہاں پھرتے ہو یوں حیران اور ششدر — ہے ٹھانی تم نے دل میں کیا بھروسے تمہیں کا پھر

ترقی ڈھونڈھتے پھرتے ہو کیوں غیروں کے برتے پر — نہ پہنچائیگا کیا اسلام معراج ترقی پر

تلاش آب حیواں میں کہاں جا کر بھٹکتے ہو — وہ ہے رنگ رواں جس کو کہ تم پانی سمجھتے ہو

کمائی دولت دنیائے دوں بدخواہ دیں ہو کر — ڈسے گی وہ ترقی تم کو مار آستیں ہو کر

عبث تم چھوڑ کر اسلام کو پھرتے ہو یوں دردر — اگر دنیا ہی ہاتھ آئی تو تف ہے اس ترقی پر

نہ لی تم نے صفت غیروں سے پابندی مذہب کی — اسی کو چھوڑ بیٹھے بات تھی جو اصل مطلب کی

تمہارے دل کو بھائی ہے ادا غیروں کے مشرب کی — چھوا عقرب کو لیکن کی نہ پروا نیش عقرب کی

ستم ہے نور کو اندھیر ظلمت کو ضیا سمجھے — پڑیں پتھر اس اوندھی عقل پر سمجھے تو کیا سمجھے

تمہاری عقل کا یہ پھیر ہے سوچو تو تم اتنا — زمانہ کب یہ کہتا ہے کہ مذہب چھوڑ دو اپنا

سلف نے وہ کئے تھے عزت و جاہ و حشم پیدا — کہ یورپ خواب میں بھی اس ترقی کو نہ دیکھے گا

نئی تہذیب کی انکو ذرا بو تک نہ پہونچی تھی — ذرا سوچو تو پھر کیسے ترقی ان کو حاصل تھی

اطاعت کیا نہ کرتے تھے سلاطین زماں ان کی — نہ تھی کیا کرسی اقبال رشک آسماں ان کی

ہمیشہ راہ پر رہتا تھا کیوں سارا جہاں ان کی — فرشتے چومتے تھے کیوں زمیں آستاں ان کی

سبب یہ تھا کہ وہ اسلام تھا ان کا — بجز مذہب کی خدمت کے نہ کوئی کام تھا انکا[1]

دنیائے تصوف کے مشہور بزرگ اور صوفی منصور حلاج نے انا الحق کہا تھا اور اس کی وجہ سے انھیں سولی پر چڑھا دیا گیا، کیونکہ شریعت کا یہی فتویٰ تھا، اس سلسلے میں صوفیا کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ منصور حلاج عشق حقیقی کی ایسی منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں دوئی کا تصور ختم ہو گیا تھا،

---

[1] عرفان عارف ص ۴۴ - ۴۹

اور عالم وارفتگی میں ہونے کی وجہ سے ایسا جملہ ان کی منہ سے نکل گیا، وہ بے قصور تھے اور سولی غلط دی گئی تھی، دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ گرچہ ان پر وارفتگی کی کیفیت طاری تھی تاہم عشق کی بہت منزلیں ہوتی ہیں، سب سے اہم اور اعلیٰ منزل یہ ہے کہ عاشق کی زبان سے اس کا اظہار نہ ہو اگر زبان سے اس کا اظہار کر دیا تو عشق ہی کہاں رہا۔ دیکھئے شاعر اس مضمون کو کس خوش اسلوبی اور منطقیانہ استدلال کے ساتھ بیان کرتا ہے ؎

اے نوا سنج اناالحق ترا کہنا تھا بجا	پر نہیں پاس ادب عشق میں دعویٰ ہونا
ہے اناعشق میں اِک راز دروں پردہ	پر نہیں راز کا حق، راز کا افشا ہونا
عشق خود دار ہے خود راز دروں عشاق	عشق کی خامی و رسوائی ہے لب وا ہونا
اپنے آپ میں خودی ہو تو خودی ہے ورنہ	اپنے آپے سے گذرنا ہی ہے رسوا ہونا
غیرت عشق ہے اسرار خودی ہوں خاموش	نہ کہ اسرار خدا تک سے بھی گویا ہونا
دیکھ کر مہر کو اپنے میں نظر آئے جو مہر	یہ نظر ہی نہیں۔ آنکھوں کا ہے خیرا ہونا
نعرہ سنجی اناحق سہی لیکن پھر بھی	شرط انصاف ہے انصاف سے گویا ہونا
ہے اناحق تو ابحر بقطرہ ہو اگر	پر نہیں اس کا محل قطرہ بدریا ہونا[1]

قاری محمد طیب کے ایک صاحب زادے محمد اعظم ۱۹۴۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں مولانا نے ایک طویل نظم لکھ کر بھیجی جو پند ونصیحت پر مشتمل ہے اور جن میں علم کی تعریف، فضیلت اور اس کی عظمت کو بیان کیا ہے، یہ نظم بڑی خوبصورت، پر معنی حکیمانہ اور نصیحت آموز ہے، دیکھئے زندگی اور علم کا مقابلہ کس خوش اسلوبی کے ساتھ کر رہے ہیں، اور بتا رہے ہیں کہ زندگی تو فنا ہو جاتی ہے، لیکن علم باقی رہتا ہے اور اس کو دوام حاصل ہے ؎

زندگانی سیل ہے گویا برف کی	جو پگھلتی رہتی ہے لیل و نہار
ہاں دوام زندگی ہے علم سے	علم ہی دنیا میں ہے دائم بہار
انقلاب دھر سے بالا ہے علم	علم کے محکوم ہیں لیل ونہار
علم ہی پر چل رہے ہیں رات دن	جہل سے ممکن نہیں یہ نظم کار

[1] عرفان عارف ص ۱۴۹

انقلاب آتے ہیں سب معلوم پر — علم رہتا ہے ہمیشہ بے فنا
آمد و شد ہو نفس کی یا نہ ہو — موت ہو یا ہو حیات مستعار
تختہ بندی ہو چمن میں یا نہ ہو — باغ میں ہو روئے گل یا نوک خار
خندہ زن ہوں گل کہ شبنم گریہ زن — ہو خزاں گلشن میں یا آئے بہار
شہر اجڑیں یا بسیں یا کچھ بھی ہو — ہوں وہ ویراں یا رہیں باغ و بہار
بادشاہی ہو کہ محکومی کا داغ — ہو غلامی یا ہو زور و اقتدار
آسماں ہل جائے ٹل جائے زمیں — جوش پر دریا ہوں یا بجھ جائے نار
کچھ بھی ہو ہر حال میں یکساں ہے علم — وہ نہیں ہرگز تغیر کا شکار
آئے لاکھوں اور گئے لاکھوں بشر — علم پر اپنی جگہ ہے برقرار
زندگی نعمت ہے لیکن علم سے — جاہل انساں ہے حقیقت میں حمار
زندگی نعمت ہے لیکن بے ثبات — علم سے ہے تا ابد اور برقرار
علم ہے معیار اخلاق و کمال — علم ہی ہے نوع انساں کا ابھار
علم ہی ہے نور افزائے حیات — علم ہی سے زندگی کا ہے وقار
علم ہی دارین میں وجہ نجات — علم ہی آسودگی کا ہے شعار

آگے چل کر علم کا مقصد بیان کرتے ہیں اور اس کی افادیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

علم وہ ہے جس سے ہو حق سربلند — اور باطل سرنگوں و شرمسار
علم وہ ہے جس سے حق آئے نظر — جس سے باطل محو ہو یا بے وقار
علم ہے سرمایہ دار زندگی — زندگی بنتی ہے جس سے آبدار
علم سے آتی ہے سرافگندگی — علم نافع ہے جمال زندگی
علم وہ ہے جس سے ہو خوف خدا — خوف وہ ہے جس سے ٹپکے بندگی
علم وہ ہے جس سے ہو تہذیب نفس — علم ہی کیا گر نہ سنورے زندگی
علم کا مقصد ہے اخلاق و عمل — علم کی غایت صلاح زندگی

علم کیا ہے؟ اسوۂ پیغمبری پیروی ہو تب صلاح زندگی
علم نافع جذبۂ حسن عمل زندگی کی ہے، یہی تابندگی[1]

مولانا قاری محمد طیب کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت اکبر الٰہ آبادی کی شاعری سے زیادہ متاثر تھے، یہی وجہ ہے "عرفان عارف" میں کئی نظمیں ایسی ملتی ہیں جو حضرت اکبر الٰہ آبادی کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی سرزمین اور اسی بحر میں قافیہ وردیف بدل کر کہی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اکبر الٰہ آبادی نے ایک قطعہ کہا ؂

دنیا نے کہا کہ کیسے چمکوں عورت نے کہا کہ گو ند ہو نہیں
چندہ نے کہا کہاں سماؤں کالج نے کہا کہ تو ند ہوں میں

دیکھئے قاری صاحب نے اس قطعہ سے متاثر ہو کر اسی زمین اور اسی بحر میں ایک دوسری نظم کہی، جس میں مذہبی رنگ پیدا کر دیا ہے اور نظم کو بھی بڑا دلچسپ بنا دیا ہے نظم ملاحظہ ہو ؂

عصیاں نے کہا کدھر سے آؤں شہوت نے کہا کہ راہ ہوں میں
فتنہ نے کہا کہاں پہ اتر دل؟ غصہ نے کہا پناہ ہوں میں
ذلت نے کہا کہ کیسے تاکوں؟ نخوت نے کہا نگاہ ہوں میں
دولت نے کہا کھپوں کہاں میں بولی یہ ہوس کہ چاہ ہوں میں
شیطان نے کہا جموں میں کیونکر عورت نے کہا نباہ ہوں میں
طغیاں نے کہا مرا سہارا دولت نے کہا شاہ ہوں میں
ایماں نے کہا بچوں میں کیونکر نیکی نے کہا سپاہ ہوں میں
فطرت نے کہا کہاں ہے عزت؟ تعلیم بڑھی کہ جاہ ہوں میں
عزت نے کہا کہاں سے ابھروں؟ بولا یہ عمل کہ راہ ہوں میں
ملت نے کہا کہ میں ہوں بدحال کوشش نے کہا رفاہ ہوں میں[2]

لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی نے ایک دوسری جگہ کہا تھا ؂

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

---

[1] عرفان عارف ص ۱۰۰-۱۰۴ [2] عرفان عارف ص ۱۲۱

اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

اس قطعہ میں دنیا کی زندگی اور اس کے حالات کو ناقابل التفات ٹھہرایا گیا ہے جو اپنی جگہ بالکل درست ہے، لیکن یہاں مقصد کا پتہ نہیں جس کے لئے ان حالات کو ناقابل توجہ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض حالات دنیا بیان ہونے سے رہ گئے ہیں، مولانا قاری محمد طیب نے اس زمین اور اسی بحر میں مزید اشعار کہے ہیں جو بطور تتمہ۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

رہ گیا عزت و جاہ کا جھگڑا — یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
قابل ذکر بھی نہیں خور و نوش — یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے
مقصد زندگی ہے طاعت حق — نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے[1]

آخر میں "آنکھ کی کہانی" والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جو قاری صاحب کی تمام نظموں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور طویل بھی ہے، اس نظم میں آنکھ کی تخلیق، اس کی افادیت، حکمت و مصلحت، آپریشن کے آغاز و اختتام اور اس کے مختلف مراحل بڑے خوبصورت اور دلچسپ شاعرانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں پھر اس کے لئے نیا اسلوب اور نئے قوافی و ردیف استعمال کئے گئے ہیں، جس سے شاعر کی شاعرانہ عظمت میں چار چاند لگ جاتا ہے، یہ نظم حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے، دیکھئے اس میں بھی آنکھ ہی کی نعمت کا اظہار کیا گیا ہے ؎

مستحق حمد و ثنا کا ہے خدائے وہاب — جس نے دی آنکھ ہمیں آنکھ کو دی نور آب
کھول دی چشم بصارت بجمال ظاہر — جس سے ممتاز لگا ہوں میں ہیں خواب اور خراب
دل کو دی چشم بصیرت بکمال باطن — جس کی رو سے متمیز ہیں خطا اور صواب
ساری تعریفیں ہیں اس رب دو عالم کیلئے — جس نے بینائی کی آنکھ میں ہے رکھی تب و تاب
نعت و توصیف ہے اس ذات مقدس کے لئے — دل کی بند آنکھ کے جس ذات نے کھولے ابواب
ختم جس ذات پہ ہے عین نبوت کا کمال — خوشہ چیں جن کے ہیں انسان و ملک اور دواب

آگے آنکھ کی افادیت کے مختلف پہلو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس طرح پیش کر دیئے۔

آنکھ قائم ہے تو ہے لذت رنگ و صورت — نہ رہے باقی تو موجود ہے جنت کا ثبوت

[1] ایضاً ۱۲۰

ہو کھلی آنکھ تو اس سے ہے ظہور رعیان — اور ہو بند تو ہے زیر نظر عالمِ خواب
آنکھ کھل جائے جو بھرپور ہے بجلی دل پر — نیم وا ہو تو بھری اس میں ہے مستی شراب
آنکھ نیچی ہو تو ہے نور حیا کا چشمہ — اور اٹھ جائے تو ہے نار فروزان عتاب
آنکھ پھر جائے تو ہے شعلۂ نفرت کی بھڑک — اور بھر آئے تو ہے بارش رحمت کا سحاب
آنکھ ترچھی ہو تو پھٹ جائے فضا پیشیں — اور سیدھی تو سیدھا ہے جہانِ اسباب
آنکھ گر امن پسند ہے تو ہے دل بھی آزاد — آنکھ لڑ جائے تو پھر دل ہے گرفتار عذاب
آگئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی — اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح اور صواب
چشم حق بیں ہو تو ہے نافع دین و دنیا — چشم بد بیں ہو تو دارین کا خسران و عذاب
آنکھیں دو ہیں تو وہ ہیں کاشف الوان جہاں — چار ہوئیں تو ہیں سر محبت کا نقاب[1]

آنکھ کے آپریشن کے مختلف نازک مرحلے ہوتے ہیں، ان سب مراحل اور کیفیات کا چند اشعار میں احاطہ کرنا نہایت مشکل کام ہے، لیکن دیکھئے شاعر نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا احاطہ کس طرح کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ کیجئے فرماتے ہیں ؎

ہاں خلاصہ اگر احوال ہو پیش نظر — مختصر طور سے ہیں اس کے یہ کل سات ابواب
دس منٹ کا ہے عمل آنکھ کے آپریشن کا — ہے یہ اس منزل مشکل کا اہم پہلا باب
چت پڑے رہنا ہے چھ گھنٹہ پس آپریشن — ان مراحل کا اہم تر ہے یہی دوسرا باب
ساتویں گھنٹہ میں ملتی ہے کہ کروٹ — جو کہ اس مدت احوال کا ہے تیسرا باب
پانچویں روز میں ملے ذن نشست و برخاست — جو کہ اس قید مہمات کا ہے چوتھا باب
چارپائی پہ سوار آنکھ پہ پٹی ہو چڑھی — بارہ دن تک کی ہے یہ قید رواں پانچواں باب
ہاں اسی کا ایک تتمہ ہے کہ جب پٹی کھلے — آنکھ کے چہرے پہ چڑھ جائے جبھی سبز نقاب
تین دن زخم کے ٹانکوں کی برآمد کئے ہوئے — اس مداوا کی منازل کا چھٹا ہے یہ باب
اس سے ایک ماہ کے بعد آتا ہے چشمہ کا مقام — سہل تر سارے مراحل کا یہ ہے ساتواں باب
آپریشن کے مہمات کی تلخیص ہے یہ — سات ابواب کا ہے یہ ڈیڑھ مہینے کا نصاب[2]

[1] عرفان عارف ص ۱۷۲ ـ [2] عرفان عارف ص ۲۰۸

فارسی نظم

مولانا قاری محمد طیب نے اردو نظموں کے علاوہ فارسی نظمیں بھی کہی ہیں جو کل ۱۴ ہیں اور ان کے اشعار کی تعداد ۴۳۳ ہے، یہ نظمیں بارگاہ نبوت میں فریاد فکر حزیں، آہ دردمنداں، استقبال مجاہد، یاد رفتگاں، ہست و نیست اور موعظت و ذکری کے عنوان پر مشتمل ہیں۔ ان نظموں میں واقعہ نگاری، منظر کشی، جذبات کی ترجمانی زبان کی صفائی و سادگی اور دلکشی و رعنائی پورے طور پر نظر آتی ہے۔

انگریزوں نے مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کو ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے قید کرکے احمد آباد جیل بھیج دیا تھا۔ جب وہ جیل سے رہا ہو کر دیوبند پہنچے تو عمائدین شہر کی طرف سے ایک شاندار استقبالیہ دیا گیا اس موقع پر مولانا قاری محمد طیب نے استقبال مجاہد کے عنوان سے ایک طویل نظم پڑھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور لطف زبان اٹھائیے۔

باد ممدوح کریمے کہ ز ممدوحئ خویش — از ثنائش ہمہ ترساں دگر یزاں آمد
چہ کنم مدح عزیزے کہ ز تسلیم و رضا — مدح و ذم در نظرش واحد و یکساں آمد
شکر معبود بجا آرم و شاداں گویم — از رہ فضل خدا یوسف زنداں آمد
پیکر صبر و رضا رہ گر اخوان صفا — یوسف راہ وفا باز بکنعاں آمد
اسم سامیش حسین است و مسمّیٰ حسن است — روح تکبیر بہ تصغیر چہ پنہاں آمد
نیک مردے ست کہ سرمست شہادت بینم — کہ حیاتش ہمگی ظلم شہیداں آمد
اے تو عیسیٰ قدمی زانکہ ہمیں خطۂ ہند — بود صحرا ز قدوم تو خیاباں آمد
راہ محمود سپردی ہمہ محمود شدی — باد فرخندہ ترا شاں کہ درخشاں آمد
برتشش افگندہ اگر قید بایں مرد قوی — روبہے اوست یہ شیران نیستاں آمد
مردے از جیل بر دل آید و کارے بکند — ملکے بود کہ در صورت انساں آمد[1]

۳؍اگست ۱۹۶۲ء کو ڈربن (جنوبی افریقہ) میں ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مولانا قاری محمد طیب نے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا، اس کلام میں شاعر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات بیان کرنے کے بعد امت مسلمہ کی زبوں حالی اور پریشانی تحریر کی ہے۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کے لئے ...... درخواست کی ہے۔

[1] عرفان عارف ص ۱۲۹

دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار میں کس قدر وارفتگی، تڑپ اور بے چینی کا اظہار پایا جاتا ہے ؎

اے رحمت و عزت مجسم — حاضر بتو قوم دست بستہ
وقت است کہ خبر آب آئی — باشد کہ بما کرم نمائی
برخیز ز لطف خویش برخیز — اے آنکہ بما رحیم برخیز
دشمن زچہار سو برآمد — محصور بہ فتنہ الم برخیز
یک گوشہ زچشم ہیبت انداز — یک لحظہ نگاہ رعب انگیز
رحمے کہ شکستہ ایم و ناشاد — مائیم و فسانۂ الم خیز
ابر لیست محیط تیرہ و تار — آبست ز ابر آبرو ریز
یک قطرہ بحر فضل و فیضیت — ما خشک لبان و آتش تیز
دلہا ز فسوق شد شب تار — یک خندہ ز عالم سحر خیز

برخیز کہ خالی انجمن شد
بے برگ و ثمر ہمہ چمن شد[1]

مہاراجہ شیر سنگھ والی ریاست اندرگڈھ (راجپوتانہ) کے سالگرہ کے موقع پر مولانا قاری محمد طیب، مولانا محمود رام پوری وزیر ریاست کے ساتھ ان کے دربار میں حاضر ہوئے اس موقع پر قاری محمد طیب نے مندرجہ ذیل قصیدہ سالگرہ کی تہنیت کے طور پر پیش کیا جس کو سن کر مہاراجہ شیر سنگھ نہایت خوش ہوئے۔

اس قصیدہ میں شاعر نے اپنا تخلص "عارف" استعمال کیا ہے چند اشعار نذر خدمت ہیں ؎

باغ و راغ است خوش طراب گاہے — صرف دیداست ہر حق آگاہے
زور بازار عشرت و شادی ست — فرح بخش است برگ ہر گاہے
سبزہ استادہ چوں پیادہ بخاک — گل نشستہ بہ تخت چوں شاہے
چوں نہ خرم شود جہاں بہ جہاں — بود از دیر چشم بر راہے
از پئے روز جشن سالگرہ — رائی راکز ملوست جم جاہے

[1] عرفان عارف ص ۱۵

نام او شیر سنگھ و شیر فلک — از نہیبش برنگ روباہے
شیر مردے کہ از شجاعت او — در دہنہا فتادہ افواہے
پہلوانے کہ گست کوہ ربا — وقت ذکر جلادتش کاہے
شہسوارے کہ گنبد گردوں — بہر یکراں اوست خرگاہے
شاطرے کس پیادہ در عرصہ — اسپ و خر زین نہادہ چوں شاہے
مہربانے کہ مثل درگاہش — مامن خلق نیست درگاہے
از کمال کرم بدرگاہش — نیست معمول عرض درخواہے
دیدن اوست دیدن ماہول — ہست درخواہ روئے درخواہے
خلق را در زمان میمونش — ماہ عید است ماہ ہر ماہے
رشک صبح وطن بود ایں جا — گر غریبے رسد بہ بے گاہے
در جہاں تا خوش است عارف داد — تا زبون نیست ظلم جاں کاہے
رائی ماشاد باد و بدخواہش — پیش کوہ شکوہ او کاہے

مثل ایں جشن نیز میموں باد
ماہ ہر سال و روز ہر ماہے[1]

[1] عرفان عارف ص ۳۶

جلد ۱۱۰ — اکتوبر ۱۹۹۲ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ — شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد سے شائع کیا

نظرات

قبلہ آبا جان حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ گھر میں ہم کو اکثر تلقین فرمایا کرتے تھے
کہ: "ہمیں ہر مسئلہ و معاملہ میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی و مدد حاصل کرنی چاہیئے۔ اسی
میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے" یہ بات آج کے سائنٹفک دور میں ثابت ہو چکی ہے کہ پیغمبر اسلام
حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ بنی نوع انسان کی فلاح و بقا اور بہتری
کیلئے تیر بہدف ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ جو دین اسلام بھیجا وہ شروع میں غریب الوطن
یعنی بیکس و بے یار و مددگار تھا پیغمبر اسلام قدم مکہ میں پیدا ہوئے تو وہاں شرک چھایا ہوا تھا تمام
عادات شرک سے وابستہ ہو گئے تھے کفر و ظلمت کا بازار گرم تھا جہالت ہر طرف چھا چکی تھی دنیا میں
رہنے والے تمام لوگ اللہ تعالیٰ کے بھیجے انبیاء کرام کی تعلیمات سے منحرف و منکر ہو کر اپنے اپنے طور پر
انبیاء کرام کی تعلیمات کو گڑھنے لگے تھے نیکی و بدی میں فرق مٹ چکا تھا سچائی کی کوئی وقعت نہیں
رہ گئی تھی لوگ لڑکیوں کی پیدائش کو منحوس سمجھنے لگے تھے اور لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیا
کرتے تھے۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی بت پرستی کمال عروج کو پہونچی ہوئی تھی۔ ایسے ماحول
میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حقیقی دین کی باتیں پھیلائیں شرک و بت پرستی کیخلاف
آواز بلند کی حق پرستی کا پرچم بلند کیا برائی کو برائی کہا۔ ہر طرف مکہ میں آپ کی مخالفت پر تمام
لوگ کمربستہ ہو گئے۔ مگر آپ حق کو حق ہی کہتے رہے اور برائی کو برائی ہی گردانتے رہے۔ آپ کو طرح
طرح کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ہر قبیلے کے بڑے بڑے سردار آپ کے خلاف آپ کو
اذیتیں دینے کے لئے میدان میں کود پڑے۔ کون سی ایسی تکلیف تھی جو آپ کو نہ دی گئی ہو۔ مگر
آپ اللہ کے سچے دین کی باتیں کہتے رہے کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت آپ کے

لئے مقدر ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جو اسلام غریب الوطن و بے کس و بے یار و مددگار تھا وہ قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان حکومت و سلطنت کے قوی ہیکل ایوانوں میں اس کے جبر و ظلم اور تشدد و قہر کو چیرتا ہوا اس شان سے داخل ہوا کہ تمام دنیا حیران و ششدر دیکھتی رہ گئی۔ اتنے کم وقت میں اسلام ہر طرف چار پھیل گیا اور تعلیمات اسلامی کے ذریعہ ہی نوع انسانی کو حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئیں۔ جس سے مدتوں ہی نوع انسانی اپنی فلاح و بہتری کے لئے تدبیریں حاصل کرتی رہے گی جو بھی انسان کھلے دل و دماغ سے سیرت مقدسہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرے گا۔ وہ اس حقیقت سے روشناس ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ کہ انسانیت کی فلاح و بہبودگی اور کامیابی و ترقی کے لئے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اسوۂ حسنہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ابتدا سے انتہا تک انبیاء و مرسلین کے حالات و واقعات کے ذکر کی حکمت یہ بیان فرمائی جس سے آپ کے قلب کو قوت اور سکون عطا کریں اور ان واقعات کے ضمن میں اہل ایمان کے لئے حق اور حقیقت اور موعظت اور نصیحت اور تذکیر او یاددہانی سامنے آجائے۔ کلام پاک میں باری تعالیٰ کے ارشاد کے پیش نظر ہر مسلمان کو انبیاء کرام کے حالات و واقعات خصوصاً سیرت رسول صلعم کا جاننا لازم و ضروری ہے۔ مگر ہمارا سوال ہے کہ عام مسلمانوں کی کتنی تعداد ایسی ہوگی جنہیں انبیاء کرام اور نبی آخر الزماں کے حالات و واقعات کا صحیح معنوں میں علم ہوگا؟ ہماری موجودہ مشکلات و مصائب کی وجہ ہی یہ ہے کہ ہم نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی ہے۔ انبیاء کرام کے حالات و واقعات اور سیرت خاتم المرسلین کو سن کر عبرت و نصیحت حاصل ہوتی ہیں۔ اور جب ہم اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوں گے تو عبرت و نصیحت ہمیں کہاں نصیب ہوگی اور اس طرح ہم اسلام انسانیت کے لئے کہاں تک مفید و کارآمد ہوں گے؟۔

ہمارے نبی اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب عالم کے تمام سلاسل انساب سے اعلیٰ اور برتر اور سب سے افضل و بہتر ہے۔ آپ امت کے لئے سراپا ہدایت و رحمت ہیں چنانچہ آپ کو اپنے عہد کے ہی انسانوں کی فکر دامن گیر نہ تھی بلکہ آنے والے تمام انسانوں کی فکر آپ کو تھی۔ اور آپ کی حیات طیبہ کا ہر ہر لمحہ نوع انسانی کے لئے باعث رحمت و نمونہ ہے۔ آنحضرت صلعم اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ مروت اور سب سے زیادہ خلیق اور

سب سے زیادہ ہمسایوں کے خبر گیراں اور سب سے زیادہ حلیم وبردبار اور سب سے زیادہ سچے اور امانت دار اور سب سے زیادہ خصومت اور دشنام وفحش وبری بات سے کوسوں دور تھے اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپؐ کا نام امین رکھا۔ عبداللہ ابن ابی الحسنار سے مروی ہے کہ میں نے بعثت سے پہلے ایک بار نبی کریم صلعم سے ایک معاملہ کیا۔ میرے ذمہ کچھ دینار باقی تھا میں نے آپؐ سے عرض کیا کہ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ اتفاق سے گھر جانے کے بعد اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین روز بعد یاد آیا کہ میں آپ سے واپسی کا وعدہ کر کے آیا تھا یاد آتے ہی فوراً وعدہ گاہ پر پہونچا، آپ کو اسی مقام پر منتظر پایا۔ آپ نے صرف اتنا ہی فرمایا کہ تم نے مجھ کو زحمت دی میں تین روز سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

عبداللہ بن سائب فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک تجارت تھا، جب مدینہ منورہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ کو پہچانتے بھی ہو میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں آپ میرے شریک تجارت تھے اور کیا ہی اچھے شریک، نہ کسی بات کو ٹالتے تھے اور نہ کسی بات میں جھگڑتے تھے اور نہ کسی قسم کا مناقشہ کرتے تھے۔ آپ بہترین شریک تجارت تھے حضرت خدیجہ عرب کے شریف خاندان کی بڑی مالدار عورت تھیں ان کی شرافت اور عفت و پاک دامنی کی وجہ سے جاہلیت اور اسلام میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے۔ قریش جب اپنا قافلہ تجارت کے لئے روانہ کرتے تو حضرت خدیجہؓ بھی اپنا مال کسی کو بطور مضاربت دیکر روانہ کرتیں۔ ایک حضرت خدیجہؓ کا سامان قریش کے کل سامان کے برابر ہوتا تھا۔ جب رسول اللہ کی عمر شریف پچیس سال کی ہوئی اور گھر گھر میں آپ کی امانت و دیانت کا چرچا ہوا اور کوئی شخص مکہ میں ایسا نہ رہا کہ آپ کو امین کے لقب سے نہ پکارتا ہو تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کے پاس پیام بھیجا کہ اگر آپ میرا مال تجارت کے لئے لے کر شام جائیں تو آپ کو بہ نسبت دوسروں کے المضاعف معاوضہ دوں گی۔ آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کی مالی مشکلات کی وجہ سے اس پیغام کو قبول فرمایا اور حضرت خدیجہؓ کے غلام میسرہ کے ساتھ ملک شام کی طرف روانہ ہوئے جب بصریٰ پہونچے تو ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے وہاں ایک راہب رہتا تھا جس کا نام نسطورا تھا وہ دیکھ کر آپ کی طرف آیا اور آپ کو دیکھ کر یہ کہا کہ عیسٰی بن مریم کے بعد سے لیکر اب تک یہاں آپ کے سوا کوئی نبی نہیں اترا پھر میسرہ

سے پوچھا کہ ان کی آنکھوں میں یہ سرخی ہے میسرہ نے کہا کہ یہ سرخی آپؐ سے کبھی جدا نہیں ہوتی ہے۔ راہب بولا یہ وہی نبی ہے اور یہ آخری نبی ہے۔

پھر آپؐ خرید و فروخت میں مشغول ہوئے اسی اثنار میں ایک شخص آپ سے جھگڑنے لگا اور اس نے آپؐ سے کہا کہ لات و عزیٰ کی قسم کھایئے آپؐ نے فرمایا کہ میں نے کبھی لات عزّیٰ کی قسم نہیں کھائی اور اتفاقاً جب کبھی میرا لات عزّیٰ پر گذر بھی ہوتا ہے تو میں اعراض و کنارہ کشی کے ساتھ وہاں سے گذر جاتا ہوں یہ سن کر اس شخص نے کہا کہ بے شک بات تو آپ ہی کی ہے یعنی صادق اور سچے ہیں اور پھر اس شخص نے کہا کہ واللہ یہ شخص ہے جس کی شان اور صفت کو ہمارے علماء اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ میسرہ کا بیان ہے کہ جب دوپہر ہوتا اور گرمی کی شدت ہوتی تو میں دو فرشتوں کو دیکھتا کہ وہ آپ پر آکر سایہ کر لیتے ہیں جب آپ شام سے واپس ہوئے تو دوپہر کا وقت تھا اور دو فرشتے آپؐ پر سایہ کئے ہوئے تھے آپ نے مالِ تجارت حضرت خدیجہؓ کے سپرد کیا۔ اس مرتبہ آپ کی برکت سے حضرت خدیجہؓ کو اسقدر منافع ہوا کہ اس سے بیشتر کبھی اتنا نفع نہ ہوا تھا۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل و کردار ایسا ہے کہ امّت کے لئے اس میں قدم قدم پر راہ ہدایت کا سامان ہی سامان ہے۔ آپؐ نے اسی لڑکی کو جو زمانہ جاہلیت میں ماں باپ اور معاشرہ پر ایک بوجھ تھی وہ ظہور اسلام کے بعد ماں باپ کے لئے باعث رحمت ہے اور شوہر کے لئے نعمت اور اولاد کے لئے جنت میں جانے کی سیڑھی ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ آپؐ کے عمل سے سبق حاصل کرتا ہے۔ پانی کی اہمیت، کھانا اٹھنا بیٹھنا عبادت و ریاضت بڑوں کا ادب و احترام چھوٹوں سے شفقت و محبت پاکی و صفائی کی تاکید، غریبوں، یتیموں بے کسوں، بیماروں و لاچاروں، ضعیفوں بیواؤں سے حسن سلوک کا آپ کی تعلیمات میں ذکر ہی ذکر ہے۔ ہر مذہب کا احترام کسی بھی مذہب کو برا نہ کہنا کسی کی دل آزاری سے باز آنا آپ کی تلقین ہے۔ کسی بھی کام کے انجام کو سوچ کر کرنا، اور اپنے کاموں میں آپ کے مشورہ کو اسلامی طریقہ بتا کر آپؐ نے امت کو کامیاب زندگی گذارنے کا طریقہ و سلیقہ دکھایا آپؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش اس چیز کے تابع ہو جائے جو میں لایا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا کہ یہ کلمہ اخلاص کے ساتھ لاالہٰ الا اللہ کہے وہ جنت میں جائیگا۔ آپ نے فرمایا یہ کہ یہ کلمہ اس کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کا ڈر اور اچھا اخلاق وہ چیز ہے جو جنت میں لے جانے کا سب سے زیادہ ذریعہ ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی بات کو مانا بعد اس کے کہ ان کو زخم پہونچ چکا تھا۔ تو ایسے نیکو کاروں اور پرہیزگاروں کے لئے اجر عظیم ہے۔ آج بھی امت کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کامیابی و ترقی اور سکون و اطمینان کے میسر آنے کا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کیجائے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی مشکلات و ذلت کا باعث ہے کہ مسلمانوں نے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے تغافل کئے رکھا ہے مسلم ممالک میں اسلامی معاشرہ کے بجائے مغربی معاشرہ اپنانے کی دھن سوار ہے۔ اسلامی تعلیمات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے روشنی حاصل کرنا بھولے ہوئے ہیں مغربیت کی نقالی میں منہمک و مشغول ہیں جس کی وجہ سے امت مسلمہ لاانتہا مسائل سے دوچار ہے ترقی کے بجائے تنزل کا شکار ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے روسائے قریش کے نمائندۂ منتخب عتبہ بن ربیعہ سے اس کی مال و دولت حکومت وغیرہ کی پیش کش کے جواب میں فرمایا " مجھ کو نہ تمہارا مال و دولت درکار ہے اور نہ تمہاری حکومت اور سرداری مطلوب ہے میں تو اللہ کا رسول ہوں اللہ نے مجھ کو تمہاری طرف پیغمبر بناکر بھیجا ہے اور مجھ پر ایک کتاب اتاری اور مجھکو یہ حکم دیا کہ میں تم کو اللہ کے ثواب کی بشارت سناؤں اور اس کے عذاب سے ڈراؤں میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور بطور نصیحت و خیر خواہی اس سے تمہیں آگاہ کر دیا اگر تم اس کو قبول کرو تو تمہارے لئے سعادت دارین اور فلاح کونین کا باعث ہے اور اگر نہ مانو تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان میں فیصلہ فرمائے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول پر عمل پیرا ہوکر دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی حاصل کریں۔ وما ارسلنٰک الا رحمۃ اللعالمین اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اپنے محبوب کو رحمت بناکر اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے بندے اس کے حکم کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے جنت کی حقدار بنیں!

ترتیب مصحف ایک جائزہ

از:- سید ظفر علی، دارالسلام عمرآباد

دوسری قسط

شاید اسی کی طرف حضرت ابن عباسؓ کی وہ حدیث ہے جس کی تخریج امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے کی ہے۔

قلت لعثمان ما حملکم علی ان عمدتم الی الانفال وھی من المثانی والی براءۃ وھی من المئین ولم تکتبوا بینھما سطر بسم اللہ الرحمن الرحیم ووضعتموھا فی السبع الطوال؟

فقال عثمان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنزل علیہ السور ذوات العدد فکان اذا انزل علیہ شیء دعا بعض من یکتب فیقول ضعوا ھذہ الآیات فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا وکذا وکانت الانفال من اوائل ما نزل بالمدینۃ وکانت براءۃ اٰخر من القرآن نزولا وکانت قصتھا شبیھۃ بقصتھا فظننت انھا منھا فقبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یبین لنا انھا منھا فمن اجل ذالک قرنت بینھما ولم اکتب بینھما سطر بسم اللہ الرحمن الرحیم ووضعتھا فی السبع الطوال[1]

ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان سے پوچھا کہ سورہ انفال مثانی میں اور سورۂ براۃ مئین میں سے ہے آپ نے دونوں کو ملا دیا اور سبع طوال میں شامل کر دیا۔ اور ان کے درمیان بسم اللہ کے ذریعہ حد فاصل بھی قائم نہیں کی؟

حضرت عثمان نے کہا کہ سورہ انفال مدینہ میں سب سے پہلے اتری تھی اور سورہ براۃ سب سے اخیر سورہ ہے

---

[1] مناہل العرفان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۳۴۷۔

لیکن دونوں کے واقعات ملتے جلتے ہیں اس لئے میں نے سمجھا کہ دونوں ایک ہی سورہ ہیں لیکن چونکہ آنحضرتؐ نے اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں فرمائی تھی۔ اس لئے میں نے دونوں کو پاس پاس لکھا اور بیچ میں بسم اللہ نہیں لکھی۔ اور اسے سبع طوال میں شامل کردیا۔

ابن فارسی کا یہ قول ان ہی حضرات کے حق میں جاتا ہے۔

" قال ابن الفارس جمع القرآن على ضربين احدهما تاليف السور كتقديم السبع الطول وتعقيبها بالمئين فهذا وهو الذى تولته الصحابة واما الجمع الآخر وهو جمع الآيات فى السور فهو توفيقى تولاه النبى صلى الله عليه وسلم كما اخبره جبريل عن امر ربه " [1]

" ابن فارسی کا بیان ہے کہ جمع قرآن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سورتوں کی ترتیب جیسے سبع طوال کو مقدم رکھنا اس کے بعد مئین والی سورتوں کو اور یہ کام صحابہ کرام کے ہاتھوں سے ہوا۔ ایسی دوسری قسم کی سورتوں میں آیات کی ترتیب تو یہ توفیقی ہے نبیؐ نے اللہ کے حکم سے حضرت جبریل کی رہنمائی میں اس کی ترتیب دی۔"

ان حضرات کی تیسری دلیل یہ ہے کہ عہد عثمان میں جمع و ترتیب قرآن سے پہلے صحابہ کے مصاحف مختلف تھے۔ اگر ترتیب سور توفیقی ہوتی تو پھر مصاحف کے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں رہتی [2] جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب وغیرہ کے مصاحف مصحفِ عثمان کی ترتیب سے مختلف تھے۔ ابن ندیم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی ترتیب کو اسطرح بیان کی ہے :۔

بقرہ، نساء، آل عمران، المص، انعام، مائدہ، یونس، برأۃ، نحل، ہود، یوسف، بنی اسرائیل، انبیاء، مومنون، شعراء، صافات، احزاب، قصص، نور، انفال، مریم، عنکبوت، روم، الم [3]

حضرت علی نے اپنے مصحف میں نزولی ترتیب کو ملحوظ رکھا تھا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں :۔

---

[1] اتقان نوع ۱۸۔ [2] مناہل العرفان ص ۳۴۶

[3] کتاب الفہرست ص ۱۳۸

ویقال ان مصحف علی کان علی الترتیب النزول اولہ اقرأ ثم المدثر ثم نون والقلم ثم المزمل ثم تبت ثم تکویر ثم سبح وھکذا الی آخر المکی والمدنی۔

دوسرا قول ابن عطیہ کا ہے۔ ان کے متعلق علامہ زرکشی "برہان" میں لکھتے ہیں۔

" مال الیہ القاضی ابو محمد بن عطیۃ ان کثیرا من السور کان قد علم ترتیبہ فی حیاتہ کالسبع الطوال والحوامیم والمفصل واشاروا لی ماسوی ذلک یمکن ان یکون فوض الامر فیہ الی الامۃ بعدہ "[2]

قاضی ابو محمد ابن عطیہ اس قول کی طرف گئے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب نبیؐ کی حیات مبارکہ ہی میں ہو چکی تھی جیسے سبع طوال۔ حوامیم اور مفصل وغیرہ اس کے علاوہ جو چند سورتیں ہیں ممکن ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے صحابہ کے اجتہاد پر چھوڑ دیا ہو۔

ابو جعفر بن زبیر کا مندرجہ ذیل قول ابن عطیہ کے قول کی تائید کرتا ہے۔

" وقال ابو جعفر بن الزبیر: الآثار تشھد باکثر مما نص علیہ ابن عطیۃ ویبقی منھا قلیل یمکن ان یجری فیہ الخلاف کقولہ اقرؤا الزھراوین البقرۃ وآل عمران رواہ مسلم وکحدیث سعید بن خالد قرأ صلی اللہ علیہ وسلم بالسبع الطوال فی رکعۃ رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ وروی البخاری عن ابن مسعود انہ قال فی بنی اسرائیل والکھف ومریم وطٰہٰ انھن من العتاق الاول وھن من تلادی فذکرھا نسقا کما استقر ترتیبھا "

ابو جعفر زبیر کہتے ہیں کہ اکثر احادیث ابن عطیہ کے قول کی شہادت دے رہی ہیں اور جو تھوڑی سورتیں رہ جاتی ہیں اس میں اختلاف کا امکان ہے اس کے دلائل یہ ہیں۔ اللہ کے نبیؐ نے فرمایا تم زہراوین یعنی بقرہ اور آل عمران کی تلاوت کرو اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن خالد کی حدیث ہے کہ اللہ کے نبی نے ایک ہی رکعت میں سبع طوال کی تلاوت کرلی۔ ابن شیبہ کے مصنف میں یہ روایت ہے۔ امام بخاری حضرت ابن مسعودؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل، کہف

---

[1] مقالات شبلی ج ص ۱۱ بحوالہ فتح الباری ج ۹ ص ۳۸

[2] بدرالدین زرکشی البرہان فی علوم القرآن نوع ۱۴ و اتقان نوع ۱۸

اور انہیں ان سورتوں کے متعلق فرمایا کہ یہ عتاق اُولیٰ میں سے ہیں۔

"و فی صحیح البخاری انہ کان اذا اوی الی فراشہ کل لیلۃ جمع کفیہ ثم نفث فیہما فقرأ قل ھو اللہ احد والمعوذتین" [۱]

اور صحیح بخاری میں یہ بھی روایت ہے کہ ہر رات جب آپ بستر پر تشریف لاتے اپنی ہتھیلی کو ملاتے. سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر پھونک لیتے۔

علامہ زرقانی ابن عطیہ کے اس قول کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"وقد ذھب الی ھذا الرأی فطاھل من العلماء ولعلہ امثل الاراء لانہ وردت احادیث تفید ترتیب البعض وخلا البعض الآخر بما یفید التوقیف بل وردت آثار تصرح بان الترتیب فی البعض کان عن اجتھاد کالحدیث المروی عن ابن عباس" [۲]

اور اس قول کی طرف علماء کی ایک کثیر جماعت گئی ہے۔ اس لئے کہ بعض حدیثیں ایسی ہیں جو ترتیب پر دلالت کرتی ہیں لیکن اس کے علاوہ حدیثیں ترتیب کا فائدہ نہیں پہونچا رہی ہیں بلکہ چند حدیثیں ایسی ہیں جو اس بات پر وضاحت کرتی ہیں کہ بعض سورتوں کی ترتیب صحابہ کرام کی طرف سے ہوئی جیسے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اس پر دال ہے۔

اسی ضمن میں امام بیہقی کی وہ رائے بھی آجاتی ہے کہ سوائے سورۂ براءۃ اور انفال کے تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور علامہ سیوطی ان ہی کے ساتھ ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"والذی ینشرح لہ الصدر ماذھب الیہ البیہقی وھو ان جمیع السور ترتیبھا توقیفی الا براءۃ والانفال" [۳]

اور امام بیہقی کے قول سے انکو (یعنی علامہ سیوطی کو) شرح صدر ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے سوائے سورۂ براءۃ اور انفال کے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی آیات کی طرح توقیفی ہے۔ [۴] جو حضرات سورتوں کی

۱۔ البرہان نوع ۱۴۔ و اتقان نوع ۱۸

۲۔ محمد عبد العظیم الزرقانی، مناھل العرفان فی علوم القرآن ص ۳۴۹

۳۔ الاتقان نوع ۱۸۔ [۴] دیکھئے اتقان ۱۸، برہان، مناھل العرفان۔ مباحث فی علوم القرآن مناع القطان

ترتیب کو توقیفی مانتے ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے جس میں امام مالک (۱۷۰ھ) قاضی ابوجعفر احمد النحاس (۳۳۹ھ) ابوبکر الانباری (۳۲۸ھ) ابوالقاسم الکرمانی (متوفی بعد ۵۰۰ھ) طیبی (۷۸۱ھ) امام بغوی (۵۱۰ھ) ابراہیم بن الزبیر الغرناطی (۷۰۸ھ) علامہ ابن حزم (۴۵۶ھ) ابن حصار (۴۵۷ھ) مولانا مودودی (۱۹۷۹ء) مولانا حمید الدین فراہی (۱۳۴۹ھ) ڈاکٹر صبحی صالح اور مولانا اشرف علی تھانوی (۱۳۲۳ھ) کے اسماء گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ [1]

ان حضرات نے متعدد قرآنی آیات، بہت سی صحیح احادیث اور بے شمار عقلی و نقلی دلائل پیش کئے ہیں۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام نے حضرت عثمانؓ کے مرتب کردہ مصحف پر اجماع کر لیا اور کسی نے مخالفت نہیں کی اگر وہ ترتیب سور و آیات کے معاملہ کو اجتہاد پر مبنی تصور کرتے تو اپنے ذاتی نسخوں پر قائم رہتے اور حضرت عثمانؓ کے نسخہ سے متفق نہ ہوتے۔ [2]

اس کے بعد وہ لوگ ان روایتوں کو پیش کرتے ہیں:

ایک روایت وہ ہے جسے امام احمد اور ابو داؤد حضرت اوس بن ابی حذیفہ سے روایت کرتے ہیں۔

"قال كنت فى الوفد الذين اسلموا من ثقيف فقال لنا رسول الله طرأ علىّ حزب من القرآن فاردت ألا اخرج حتى اقضيه فسألنا اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قلنا كيف تحزبون القرآن؟ قالوا نحزبه ثلاث سور و خمس سور و سبع سور و تسع سور و احدى عشرة سورة و ثلاث عشرة و حزب المفصل من "ق" حتى نختم۔

---

[1] اتقان۔ ابن حزم الظاہری بکتاب الفصل فی الملل والاہواء ج ۴ ص ۲۲۱۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۸۔ مولانا حمید الدین فراہی تفسیر سورۃ القیامہ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی ص ۴۸۔ ۵۲ ڈاکٹر صبحی صالح مباحث فی علوم القرآن ص ۷۱، تفسیر بیان القرآن سورتوں کی شروعات و خاتمہ کے مباحث۔ دیکھئے قرآن میں سورتوں کی ترتیب۔ مولانا شہید رفیق ندوی۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی جولائی، ستمبر ۱۹۸۸ء

[2] مناهل العرفان فی علوم القرآن ص ۳۴۷۔

مریم، طٰہٰ اور انبیاء ان سورتوں کے متعلق فرمایا کہ یہ عتاق اُلیٰ میں سے ہیں۔

"وفی صحیح البخاری انہ کان اذا اوی الی فراشہ کل لیلۃ جمع کفیہ ثم نفث فیہما فقرأ قل ھو اللہ احد والمعوذتین" ؎۱

اور صحیح بخاری میں یہ بھی روایت ہے کہ ہر رات جب آپ بستر پر تشریف لاتے اپنی ہتھیلی کو جمع کرتے۔ سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر پھونک لیتے۔

علامہ زرقانی ابن عطیہ کے اس قول کے متعلق رقمطراز ہیں:

"وقد ذھب الی ھذا الرأی فطاحل من العلماء ولعلہ امثل الآراء لانہ وردت احادیث تفید ترتیب البعض وخلا البعض الآخر بما یفید التوقیف بل وردت آثار تصرح بان الترتیب فی البعض کان عن اجتہاد کالحدیث المروی عن ابن عباس" ؎۲

اور اس قول کی طرف علماء کی ایک کثیر جماعت گئی ہے۔ اس لئے کہ بعض حدیثیں ایسی ہیں جو ترتیب پر دلالت کرتی ہیں لیکن اس کے علاوہ حدیثیں ترتیب کا فائدہ نہیں پہونچا رہی ہیں بلکہ چند حدیثیں ایسی ہیں جو اس بات پر وضاحت کرتی ہیں کہ بعض سورتوں کی ترتیب صحابہ کرام کی طرف سے ہوئی ہے جیسے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اس پر دال ہے۔

اسی ضمن میں امام بیہقی کی وہ رائے بھی آجاتی ہے کہ سوائے سورۂ براءۃ اور انفال کے تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور علامہ سیوطی ان ہی کے ساتھ ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"والذی ینشرح لہ الصدر ما ذھب الیہ البیہقی وھو ان جمیع السور ترتیبہا توقیفی الا براءۃ والانفال" ؎۳

اور امام بیہقی کے قول سے انکو (یعنی علامہ سیوطی کو) شرح صدر ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے سوائے سورۂ براءۃ اور انفال کے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی آیات کی طرح توقیفی ہے۔ ؎۴ جو حضرات سورتوں کی

؎۱ البرہان نوع ۱۴۔ والاتقان نوع ۱۸

؎۲ محمد عبدالعظیم الزرقانی، مناہل العرفان فی علوم القرآن ص ۳۴۹

؎۳ الاتقان نوع ۱۸۔ ؎۴ دیکھئے اتقان ۱۸، برہان، مناہل العرفان۔ مباحث فی علوم القرآن مناع القطان

ترتیب کو توقیفی مانتے ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے جس میں امام مالک (۱۷۰ھ) قاضی ابو جعفر احمد النحاس (۳۳۹ھ) ابو بکر الانباری (۳۲۸ھ) ابو القاسم الکرمانی (متوفی بعد ۵۰۰ھ) طیبی (۹۸۱ھ) امام بغوی (۵۱۰ھ) ابراہیم بن الزبیر الغرناطی (۷۰۸ھ) علامہ ابن حزم (۴۵۶ھ) ابن حصار (۴۵۷ھ) مولانا مودودی (۱۹۷۹ء) مولانا حمیدالدین فراہی (۱۳۴۹ھ) ڈاکٹر صبحی صالح اور مولانا اشرف علی تھانوی (۱۳۶۲ھ) کے اسمار گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ [1]

ان حضرات نے متعدد قرآنی آیات، بہت سی صحیح احادیث اور بے شمار عقلی و نقلی دلائل پیش کئے ہیں۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام نے حضرت عثمانؓ کے مرتب کردہ مصحف پر اجماع کر لیا اور کسی نے مخالفت نہیں کی اگر وہ ترتیب سور و آیات کے معاملہ کو اجتہاد پر مبنی تصور کرتے تو اپنے ذاتی نسخوں پر قائم رہتے اور حضرت عثمانؓ کے نسخہ سے متفق نہ ہوتے۔ [2]

اس کے بعد وہ لوگ ان روایتوں کو پیش کرتے ہیں:

ایک روایت وہ ہے جسے امام احمد اور ابو داؤد حضرت اوس بن ابی حذیفہ سے روایت کرتے ہیں۔

" قال كنت في الوفد الذين اسلموا من ثقيف فقال لنا رسول الله طرأ علي حزب من القرآن فاردت الا اخرج حتى اقضيه فسألنا اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قلنا كيف تحزبون القرآن؟ قالوا نحزبه ثلاث سور وخمس سور وسبع سور وتسع سور واحدى عشرة سورة وثلاث عشرة وحزب المفصل من "ق" حتى نختم۔

---

[1] اتقان۔ ابن حزم الظاہری، کتاب الفصل فی الملل والاہواء ج ۴ ص ۲۲۱۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۸۔ مولانا حمیدالدین فراہی تفسیر سورۃ القیامہ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی ص ۴۸، ۵۲، ڈاکٹر صبحی صالح مباحث فی علوم القرآن ص ۷۰، تفسیر بیان القرآن سورتوں کی شروعات و خاتمہ کے مباحث۔ دیکھئے قرآن میں سورتوں کی ترتیب۔ مولانا اشہد رفیق ندوی سہ ماہی تحقیقات اسلامی جولائی، ستمبر ۱۹۸۸ء

[2] مناہل العرفان فی علوم القرآن ص ۳۴۷۔

"وہ کہتے ہیں کہ میں اس وفد میں شریک تھا جو قبیلہ ثقیف سے مسلمان ہوکر آیا تھا۔ جب رسول اللہ کو آنے میں تاخیر ہوگئی تو آپ نے وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں قرآن پڑھنے میں مشغول تھا اس لئے خیال ہوا کہ اس کو پورا کر کے نکلوں۔ پھر ہم اصحاب رسولؐ سے دریافت کیا قرآن پڑھنے میں آپ لوگوں کا کیا معمول ہے۔ انہوں نے کہا پہلے دن تین سورتیں، پھر پانچ، پھر نو، پھر تیرہ اور آخر میں حزب مفصّل کی تمام سورتیں یعنی سورہ ق سے خاتم قرآن تک۔

قالوا فهذا يدل على ان ترتيب السور على ما هو في المصحف الآن كان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱

تو محققین کا خیال ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دال ہے کہ موجودہ سورتوں کی ترتیب رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوچکی تھی۔

ابن اشتہ نے "مصاحف" میں ابن وہب عن سلیمان بن بلال کے طریق سے ایک روایت نقل کی ہے۔

" قال سمعت ربيعة يسال لم قدمت البقرة وآل عمران وقد انزل قبلهما بضع وثمانون سورة بمكة وانما انزلت بالمدينة؟ فقال قد منا والف القرآن على علم ممن الف به الى ان قال فهذا مما ينتهي اليه ولا يسال عنه ۲

وہ کہتے ہیں میں نے ربیعہ کو سوال کرتے ہوئے سنا کہ آپ نے سورۂ بقرہ اور آل عمران کو کیوں مقدم رکھا حالانکہ ان دونوں سے پہلے اسّی سے زائد سورتیں مکّہ میں نازل ہوچکی ہیں اور یہ دونوں سورتیں مدینہ میں، تو انہوں نے کہا یہ سب رسول اللہ کی موجودگی میں ہوا ہے اور اس کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا۔

مشہور روایت ہے کہ قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوچکا ہوتا تھا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک میں حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ اس کا دورہ کرتے تھے، آخری بار رمضان میں آپ نے دو بار دورہ فرمایا۔ بخاری کی روایت ہے۔

---

۱ بحوالہ سابق ۲ ایضاً

"عن عائشة عن فاطمة اسرالی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان جبریل یعارضنی بالقرآن کل سنة وانه عارضنی العام مرتین ولا اراہ الاحضر اجلی" [۱]

حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے راز کے طور پر یہ بات بتائی کہ حضرت جبریل ہر سال میرے ساتھ قرآن کا دورہ کرتے تھے لیکن اس سال انھوں نے میری معیت میں دو بار دورہ کیا ہے۔ غالباً میری موت کا وقت قریب آگیا ہے۔

واثلہ بن اصقع کی روایت ہے۔

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اعطیت مکان التوراۃ السبع الطوال و اعطیت مکان الزبور المئین واعطیت مکان الانجیل المثانی و فضلت المفصل"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے توراۃ کی جگہ سبع طوال، زبور کی جگہ مئین اور انجیل کی جگہ مثانی دیا گیا اور مفصل سے مجھے فضیلت دی گئی۔

قاضی ابوجعفرنی تحریر فرماتے ہیں۔

"المختار ان تالیف السور علی هذا الترتیب من رسول اللہ واثلة اعطیت مکان التوراۃ السبع الطوال قال فهذا الحدیث یدل علی ان تالیف القرآن ماخوذ عن النبی وانه من ذالک الوقت وانما جمع فی المصحف علی شئ واحد لانه قد جاء هذا الحدیث بلفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی تالیف القرآن قال بمایدل علی ان ترتیبها توقیفی ما اخرجه احمد و ابوداؤد عن اوس بن ابی اوس حذیفة الثقفی" [۲]

صحیح بات یہی ہے کہ سورتوں کی یہی ترتیب رسولؐ کی دی ہوئی ہے جیسا کہ حدیث واثلہ سے معلوم ہوتا ہے جس سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی ترتیب آنحضرتؐ سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اسی وقت کی ہے اور اس وقت کا قرآن اسی ترتیب پر ہے اس لئے کہ یہ حدیث ترتیب قرآن کے متعلق خود آنحضرتؐ کے بارے میں ہے ابوجعفر مزید یہ بھی فرماتے ہیں کہ ترتیب توقیفی ہونے پر اوس بن ابی اوس کی روایت بھی دلالت کرتی ہے۔

ابوبکر بن انباری بیان کرتے ہیں:

---

[۱] صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن باب کان جبریل یعرض القرآن [۲] اتقان نوع ۱۸۔

"انزل اللّٰہ القرآن کلہ الی سماء الدنیا ثم فرق فی بضع وعشرین فکانت السورۃ تنزل لامر یحدث والایۃ جواب لمستخبر ویقف جبریل النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی موضع السورۃ والایۃ فاتساق السور کاتساق الایات والحروف کلہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فمن قدم سورۃ اواخرھا فقد افسد نظم الایات۔" [1]

اللہ تعالیٰ نے پورا قرآن سماء دنیا پر نازل فرما دیا پھر بیس سال سے کچھ زیادہ میں اس کو بانٹ دیا۔ چنانچہ سورہ کسی پیش آمدہ واقعے کے لئے اور آیت سائل کے سوال کے جواب میں اترتی تھی۔ تو جبریل آنحضورؐ کو آیت اور سورہ کی جگہ بتا دیتے تھے۔ اس لئے سورتوں کی ترتیب بھی آیتوں اور حروفوں کی ترتیب کے مثل ہے اور یہ تمام رسول اللہ کی ترتیب کردہ ہے اگر کوئی شخص کسی سورہ کو مقدم یا مؤخر کر دے تو وہ نظم قرآن کو بگاڑ دے گا۔

ابوالقاسم کرمانی ارشاد فرماتے ہیں:

ترتیب السور ھکذا ھو عند اللّٰہ فی اللوح المحفوظ علی ھذا الترتیب وعلیہ کان صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعرض علی جبریل کل سنۃ ماکان یجتمع عندہ منہ وعرضہ علیہ فی السنۃ التی توفی فیھا مرتین وکان آخر الایات نزولا واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللّٰہ فامرہ جبریل ان یضعھا بین آیتی الربٰو والدین۔" [2]

سورتوں کی ترتیب اسی طرح اللہ کے ہاں لوح محفوظ میں ہے اور اسی ترتیب کے مطابق آنحضرتؐ ہر سال جبریل سے جمع شدہ قرآن کا دورہ کرتے تھے۔ سال وفات میں دوبار حضرت جبریل کے ساتھ دورہ ہوا۔

امام طیبی فرماتے ہیں:

"انزل القرآن اولا جملۃ واحدۃ من اللوح المحفوظ الی السماء الدنیا ثم نزل مفرقا علی المصالح ثم اثبت فی المصاحف علی التالیف والنظم المثبت فی اللوح المحفوظ،" [3]

قرآن مجید پہلے مجموعی طور پر لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر نازل ہوا پھر ضرورت کے مطابق

---

[1] برہان نوع ۱۴۔ [2] اتقان نوع ۱۸۔ [3] بحوالہ سابق

والا ہوتا تھا پھر اسی ترتیب کے مطابق جو لوح محفوظ میں ہے مصاحف میں لکھا گیا۔

علامہ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں:

"والقول بان تقسیم آیات القرآن و ترتیب مواضع سورہ شیٔ فعلہ الناس لیس ھو من امر رسول اللّٰہ فقد کذب ھذا الجاھل وافک اتراہ ما سمع قول اللّٰہ تعالیٰ ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا و قول رسول اللّٰہ فی آیۃ الکرسی و آیۃ الکلالۃ والخبر انہ کان یامر اذا انزلت الآیۃ ان تجعل فی سورۃ فی موضع کذا ولو ان الناس رتبوا سورۃ لما تعدو احد وجوہ ثلثۃ اما یرتبوھا علی الاول فالاول نزولا او الاطول فما دونہ او الاقصر فما فوقہ فاذا لیس کذلک فقد صح انہ امر رسول اللّٰہ لا یعارض من اللّٰہ عزوجل لا یجوز غیر ذلک اصلا"۔[1]

یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ قرآن مجید میں آیتوں اور سورتوں کی ترتیب رسول اللّٰہ کی ہدایت کے موافق نہیں ہے تو اس نے جھوٹ کہا۔ ایسا شخص جاہل اور بہتان باندھنے والا ہے کیا اس نے یہ آیت ما ننسخ الخ نہیں سنی آیۃ الکرسی اور کلام کے متعلق رسول اللّٰہ کے فرمان کو نہیں جانا۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے یہ آیت فلاں سورۃ میں فلاں جگہ لکھ دی جائے۔ اگر لوگوں نے قرآن کو ترتیب دیا ہوتا تو وہ اس کے تین ہی طریقے اختیار کرتے۔ نزولی ترتیب دیتے یا پہلے بڑی سورتیں رکھتے اس کے بعد چھوٹی یا پہلے چھوٹی رکھتے اس کے بعد بڑی۔ لیکن جب یہ صورتِ حال نہیں ہے تو یقیناً آنحضرتؐ ہی کے حکم سے مرتب ہونا ثابت ہے اور یہ منشا نبی اللّٰہ ہونے کے معارض نہیں ہے اس کے علاوہ کوئی بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔

امام مالکؒ سے علامہ سیوطی نقل کرتے ہیں:

"عن ابی وھب سمعت مالکا یقول انما الف القرآن علی ما کانوا سمعوا من النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم"۔[2]

امام بغویؒ شرح سنہ میں لکھتے ہیں:

"الصحابۃ جمعوا بین الدفتین القرآن الذی انزلہ اللّٰہ علی رسولہ فکتبوہ کما

---

[1] کتاب الفصل ج ۴، ص ۲۲۱ [2] اتقان نوع ۱۸۔

سمعوه من [illegible] من غير ان قدموا شيئا او اخروا او وضعوا له ترتيبا لم ياخذوه من رسول الله وكان رسول الله يلقن اصحابه ويعلمهم ما نزل عليه من القرآن على الترتيب الذی هو الآن فی مصاحفنا بتوقیف جبریل ایاه علی ذلک واعلامه عند نزول کل آیة ان هذه الآیة تکتب عقب آیة کذا فی سورة کذا "[1]

صحابہؓ نے دو دفتیوں کے اندر اسی قرآن کو لکھا جس کو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا تھا جیسا انہوں نے سنا ویسا ہی لکھا بغیر کسی تقدیم و تاخیر اور نہ ہی کوئی ایسی ترتیب دی جس کو رسول اللہ سے حاصل نہ کیا ہو۔ کیونکہ اللہ کے رسول صحابہ کو اسی ترتیب پر جو آج ہمارے مصحفوں میں ہے تعلیم و تلقین کیا کرتے تھے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ حضرت جبریل بوقتِ نزول آپ کو باخبر کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں آیت فلاں سورہ میں لکھی جائے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ہے۔

ان الحجاج خطب فقال ان ابن الزبیر بدل کلام اللہ فقام ابن عمر فقال کذبت لم یکن ابن الزبیر یستطیع ان یبدل کلام اللہ ولا انت "[2]

حجاج نے اپنے خطبہ کے دوران کہا کہ ابن زبیر نے کلام الٰہی کو بدل دیا ہے تو حضرت عبداللہؓ بن عمر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ اس نے جھوٹ کہا نہ زبیر کے اندر استطاعت ہے کہ وہ خدا کے کلام کو بدل دیں اور نہ تیرے اندر۔

مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے آیت ان علینا جمعہ وقرآنہ الخ سے جو مسائل استنباط کئے ہیں وہ یہ ہیں "قرآن حضورؐ کی زندگی ہی میں جمع کر کے ایک خاص ترتیب سے آپکو سنا دیا گیا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قرأت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا جیسا کہ دیا گیا ہے۔ فاذا قرأنا فاتبع قرآنه۔

(باقی آئندہ)

---

[1] ایضاً [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۴

از: حکیم وسیم احمد اعظمی (نئی دہلی)

ابن الجزار، چوتھی صدی ہجری کا ایک ممتاز طبیب

ولادت، تعلیم و تربیت

ابوجعفر، احمد بن ابراہیم بن ابی خالد بن الجزار کا شمار چوتھی صدی ہجری، دسویں صدی عیسوی کے تونس کے مشاہیر اطبا میں ہوتا ہے، وہ تونس کے قیروان نامی شہر میں پیدا ہوا، تذکروں میں اس کے سنہ ولادت کا تذکرہ نہیں ملتا، البتہ سنہ وفات کی تعیین بیشتر تذکرہ نگاروں نے کی ہے، چنانچہ یاقوت حموی[1] نے ۳۴۳ھ، ابن عذاری[2] اور راکمل الدین احسان روغلی[3] نے ۳۶۹ھ/۹۷۹ء، بروکلمان[4] نے ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء اور کمال سامرائی[5] نے تقریباً ۳۹۹ھ/۱۰۰۵ء لکھا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے اگرچہ سنہ وفات کی تعیین نہیں کی ہے تاہم لکھا ہے کہ وہ فاطمی خلیفہ معد[6] کے عہد میں حیات تھا اور اسّی سال کی عمر میں قیروان میں فوت ہوا[7]، حاجی خلیفہ اور جارج سارٹن نے ابن عذاری کے بیان کردہ سنہ وفات کو ترجیح دیا ہے۔

ابن الجزار قیروانی کا خاندان قیران (تونس) کے نامور طبی خانوادوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے والد ابراہیم بن ابی خالد قیروانی اور چچا ابوبکر محمد بن ابی خالد قیروانی کا شمار مشاہیر اطبا میں ہوتا تھا، ابن الجزار کے عہد طفولیت میں قیروان اور رقادہ علم و حکمت کی بیداری کے دو اہم مراکز تھے، اور فاطمیوں کے دار الخلافہ ہو جانے کے بعد تو ادبا، شعرا، حکما اور علما کا یہاں مرجوعہ ہو گیا تھا۔ گویا ابن الجزار نے بچپن سے ہی علمی و ادبی ماحول پایا تھا، اس وقت آسمان طب پر ابن الجزار کے والد اور چچا کے علاوہ اسحاق بن سلیمان اسرائیلی (متوفی ۳۴۴ھ/۹۴۱ء) اور زیاد بن خلفون (متوفی ۳۰۸ھ/۹۲۰ء) وغیرہ چند سے آفتاب اور چند سے ماہتاب کی حیثیت رکھتے تھے، ابن الجزار نے ان اکابرین فن سے اکتساب فیض کیا، زمانۂ طالب علمی میں اس کا شمار ذہین طلبا میں ہوتا تھا، مطالعہ کا شیدائی اور غیر معمولی قوت حافظہ کا مالک تھا جس کے اثرات اس کی آئندہ زندگی پر بھی پڑے۔

طب کی تعلیم کے حصول کے بعد اس نے اپنے گھر پر ہی شفاخانہ کھولا، وہ مریض کا نظری معائنہ اور قارورہ وغیرہ دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیتا اور شفاخانے سے متصل ہی دروازے پر اس کا غلام رشیق، نسخہ دیکھ کر دوائیں دیتا۔ اس کے مطب میں مفرد اور مرکب دونوں طرح کی دواؤں کا رواج تھا۔ مطب میں غریب اور نادار مریضوں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی؛ چنانچہ ان کو دوائیں مفت دی جاتی تھیں اور صاحب حیثیت وثروت لوگوں سے دواؤں کا مناسب دام لیا جاتا تھا۔ اس اخلاق کریمانہ کی وجہ سے اس کا شہرہ دور دور تک ہوا اور مطب میں مریضوں کا اژدہام سا رہنے لگا، ایک مرتبہ قاضی شہر نعمان (متوفی ۳۷۴ھ/ ۹۸۴ء) کا بھتیجا اس کے پاس علاج کے لئے آیا، ابوجعفر ابن الجزار نے اس کو ترجیحی حیثیت نہیں دی اور مریضوں کے معائنہ میں مشغول رہا اور باری آنے پر قاضی نعمان کے بھتیجے کو بھی نسخہ تجویز کر دیا، کچھ عرصہ کے بعد قاضی کا بھتیجہ صحت یاب ہو گیا تو قاضی نعمان نے اظہار تشکر وامتنان کے ایک پروانے کے ساتھ خلعت فاخرہ اور تین سو اشرفیاں ابن الجزار کی خدمت میں بھجوائیں، ابن الجزار نے وہ مکتوب پڑھ کر مناسب جواب تحریر کروایا اور خلعت وانعام کو واپس لوٹا دیا۔ یہ واقعہ ابن جلجل (متوفی بعد ۳۷۷ھ/ ۹۸۷ء) سے بیان کرنے والے نے کہا کہ میں نے خود ابن الجزار سے کہا۔

یا اباجعفر رزق ساقہ اللہ الیک

اے ابوجعفر! یہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بھیجا ہے تو اس نے جواب دیا۔

واللہ لا کان لرجال معد قبلی نعمتہ

یہاں یہ تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابوجعفر ابن الجزار مزاجی اعتبار سے کم آمیز تھا، امراء اور رؤسا سے رسم و راہ رکھنے میں بہت محتاط رہتا تھا، شادی اور غم وغیرہ مواقع پر لازمی طور پر شریک ہوتا تھا مگر کہیں کھانا وغیرہ نہیں کھاتا تھا، خلیفہ معد کے چچا ابوطالب سے اس کی رسم وراہ ضرور تھی، چنانچہ جمعہ جمعہ ان کے یہاں جاتا تھا۔

ابن الجزار خوبیٔ درس کے ساتھ بھی متصف تھا اور دوسرے علوم حکمیہ پر بھی وسیع نظر رکھتا تھا، چنانچہ مطب کے ساتھ وہ طلباء طب کو درس بھی دیا کرتا، طب عملی پر خصوصیت سے زور دیتا نتیجہ کے طور پر سریری مناظر اس کے مطب کا طرۂ امتیاز تھے، اس موضوع پر اس نے

ایک کتاب بھی لکھی تھی، اس کے شاگردوں میں ابوحفص بن بریق اندلسی کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

ایک بہتان:۔ ابن الجزار کے معمولات میں سے تھا کہ وہ موسم گرما میں اپنی طبی اور معالجاتی سرگرمیوں سے دست بردار ہو کر بحر روم کے ساحل کی طرف چلا جاتا اور وہاں ایک خانقاہ میں عبادت کرتا اور موسم سرما شروع ہونے پر پھر افریقہ واپس آجاتا تھا۔[۱۲]
لیکن مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ۔ جی براؤن کو ابن الجزار کی یہ روش پسند نہیں آئی۔ انھوں نے لندن کے رائل کالج آف فزیشینز میں دیئے گئے اپنے خطبات[۱۳] میں اس کو "بحری قزاقی" کہہ ڈالا، براؤن کے بقول۔

"ابن الجزار نے اپنے پیشے کی زحمت سے بچنے کے لئے بڑے بڑے سمندروں میں بحری قزاقی اختیار کر لی تھی۔"[۱۴]

بھلا ہو حکیم سید علی احمد نیر واسطی (متوفی ۱۹۸۵ء) کا، جنھوں نے براؤن کی اس بہتان تراشی کا اریبین میڈیسن کے اردو ترجمہ "طب العرب" کی تنقیدات و تشریحات میں عالمانہ جائزہ لیا۔ پروفیسر براؤن کا رویہ صرف ابن الجزار کے ساتھ ہی اس طرح کا نہیں ہے بلکہ ان کی بیشتر تحریروں میں بے بنیاد اور نادرست الزامات ملتے ہیں اور حد تو یہ کہ وہ تحقیق کے مبادیات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی مستند حوالہ دینے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے، حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کسی غیر مسلم طبیب یا دانشور کا اس طرح کا عمل ہوتا تو یہی پروفیسر براؤن اس عمل کو فن کے مفاد کے تناظر میں دیکھتے، براؤن کی اس "بحری قزاقی" والی بہتان تراشی کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے لئے میں نے متعدد تذکروں اور تاریخی کتابوں کو پڑھا کہ شاید براؤن کی بات صحیح ہو جائے، لیکن مطالعہ کے بعد جو باتیں سامنے آئیں وہ بحری قزاقی تو کجا ابن الجزار کے اخلاق کریمانہ اور علمی رفعت کا ہی پتہ دیتی ہیں، ابن ابی اصیبعہ لکھتے ہیں

"کان ابن الجزار من اهل الحفظ والتطلع والدراسة للطب سائر العلوم"۔[۱۵]

کناجم جو سندی کے نام سے بھی متعارف ہے اور ادب الندیم جس کی تالیف ہے، وہ

ابن الجزار کی کتاب علاج الامراض المعروف بہ زاد المسافر کے بارے میں لکھتا ہے۔

اباجعفر ابقیت حیا ومیتا	مفاخر فی ظهر الزمان عظاماً
رأیت علی زاد المسافر عندنا	من الناظرین العارفین زحاماً
فایقنت ان لو کان حیا لوقته	یحنا لماسمی التمام قاماً
ساحمد افعالا لاحمد لم تزل	مواقعها عند الکرام کراماً

ابن الجزار کی علمی حیثیت

ابن الجزار بلاد مغرب کے ان چند نامور (بلکہ خوش نصیب) اطبار میں سے ہے جس کی علمی حیثیت کا بیشتر تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے[۱۸] ان میں صفدی، یاقوت الحموی، ابن صاعد اندلسی، ابن القفطی، ابن ابی اصیبعہ، ابن جلجل، ابن شاکر، ابن عذاری، حاجی خلیفہ خیرالدین زرکلی، عمر رضا کحالہ، اکمل الدین احسان، روفی، کمال سامرائی، مایرہوف، عبدالوہاب محمد الحبیب، بروکلمان، غلام جیلانی، نیّر واسطی اور سید محمد حسان نگرامی وغیرہ شامل ہیں۔

اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ابن الجزار کی وفات کے ۔۶ سال بعد تک اندلس کے اطبار اس عظیم مفکر و طبیب کی آرار اور تالیفات سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ ان اطبار میں ابن ابیطار[۱۹] اور تونسی طبیب احمد الحمیری وغیرہ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ احمد الحمیری تحفۃ القادم میں لکھتے ہیں۔

"اس (ابن الجزار) کی بیشتر تصانیف فن طب میں تھیں اور وہ افریقہ کے اطبار میں علمی و عملی اعتبار سے سب سے قدر آور تھا، اس کی تصانیف بو علی ابن سینا (متوفی ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) ابو بکر محمد بن زکریا رازی (متوفی ۳۱۳ھ/۹۲۵ء) اور علی بن العباس المجوسی (متوفی ۳۸۴ھ/۹۹۴ء) کی تصانیف سے کسی بھی طرح کم نہ تھیں بلکہ افریقہ نژاد ہونے کے سبب اس کی تصانیف کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔"[۱۹]

ابن الجزار کا خیال تھا کہ عطائی اس فن کی بدنامی کا باعث ہیں، وہ معالجہ میں مریض کی طبیعت، ملکی آب و ہوا، عادات و اطوار کو بہت اہمیت دیتا تھا، اس طرح دواؤں کے مزاج اور

افعال میں علاقائی اور اقلیمی اختلاف کو مؤثر تصور کرتا تھا، مرض کے ازالہ کے لئے مریض کا اعتماد حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا اور معالج کی خوش طبعی اور خوش خلقی کو بھی بہت اہمیت دیتا تھا، موسمی اثرات کا بھی قائل تھا اور اپنی تصانیف میں افریقہ کی مخصوص بیماریوں کا بطور خاص تذکرہ کرتا تھا، مصر میں پھیلی ہوئی وبا کے اسباب پر اس نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا، اس کتاب کے جواب میں علی بن رضوان (متوفی ۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء) نے دفع مضار الابدان بارض مصر کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی [1]

ابن الجزار کے مطالعہ کا ذوق اس قدر بالیدہ تھا کہ متقدمین اطبا کی بیشتر غیر طبی و طبی تصانیف اس کے کتاب خانے میں موجود تھیں، چنانچہ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کی وفات کے بعد اس کے کتاب خانے سے طب اور دوسرے علوم سے متعلق ۲۵ گٹھے مخطوطات برآمد ہوئے تھے۔ [2]

ابن الجزار بحیثیت مصنف

ابن الجزار نے مختلف علوم و فنون میں کتابیں تصنیف کیں جن میں طب کے علاوہ فلسفہ، اخلاق اور تاریخ وغیرہ فنون شامل ہیں۔ وہ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی بعض مشہور تصانیف کا دنیا کی مختلف علمی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ نتیجہ کے طور پر اس کی نظریات کو وسیع تر حلقوں میں جانچا اور پرکھا گیا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کی تصانیف کی فہرست بھی مرتب کی ہے، چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں ۲۰، عبدالوہاب نے کتاب الورقات میں، محمد الحبیب الہیلہ نے الفیصل میں ۴۴ اور کمال سامرائی نے مختصر تاریخ الطب العربی (جلد اول) میں ۴۳ کتابوں کی فہرست دی ہے تاہم یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بیشتر تصانیف اس دور میں نایاب ہیں۔

آئندہ سطور میں ابن ابی اصیبعہ اور کمال سامرائی کے حوالے سے ابن الجزار کی تصانیف کی ایک فہرست مرتب کی جارہی ہے، اور دستیاب مطبوعہ یا مخطوطہ کی نشاندہی علیحدہ سے کی جارہی ہے۔

ب

کتاب فی علاج الامراض (دو جلدیں) اس کا دوسرا نام زادالمسافر وقوت الحاضر ہے۔
ر کی حیات میں ہی اس کو قبول عام حاصل ہو گیا تھا، اس کے شاگرد رشید عمر بن بریق
کے ذریعے یہ کتاب اندلس پہونچی، قسطنطین افریقی نے اس کا لاطینی ترجمہ کیا، اور موسیٰ
"تزدادہا وار یاخیم" کے نام سے اس کا عبرانی ترجمہ کیا۔

تاب فی الادویۃ المفردۃ : اس کا دوسرا نام "اعتماد" بھی ہے، ڈاکٹر کمال سامرائی
و "کتاب الاعتماد فی الادویۃ المفردۃ" کا نام دیا ہے، [۲۱] ابن الجزار کی اس
بھی قبول عام حاصل ہوا، بعض حلقوں سے تسامحات یا اغلاط کی نشاندہی کے طور
لکھی گئیں، ماہرین فن نے اس تصنیف کو منفرد و یکتا قرار دیا، راہب اصطیفن
نے ۱۲۳۳ء/۱۲۳۳ء میں اس کا لاطینی ترجمہ کیا۔ قسطنطین نے بھی لاطینی ترجمہ کیا
عادت اپنی طبعزاد کتاب قرار دیا، موسیٰ بن طبون نے عبرانی ترجمہ کیا، عبدالرحمٰن
بن رشیم القرطبی نے اس کتاب کی فروگذاشتوں اور غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے
ار والایجاد فی خطاء ابن الجزار فی الاعتماد" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی۔

کتاب الادویۃ المرکبہ : اس کا دوسرا نام "بغیہ" ہے۔

کتاب المعدۃ لطول المدۃ : یہ ابن الجزار کی ضخیم ترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔

تاب فی المعدہ وامراضہا ومداواتہا : یہ کتاب چار فصول پر مشتمل ہے۔

تاب طب الفقراء (والمساکین) بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا نام علاج الغرباء بھی
، [۲۲] جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں سستی، کم قیمت دواؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے
ار کی اس کتاب کی بھی بھرپور پذیرائی ہوئی اور لاطینی و عبرانی زبانوں میں اس کے تراجم

سالہ فی ابدال الادویہ : اس کو کتاب الابدال اور اعلاء العقاقیر کے نام سے بھی
نگاروں نے تحریر کیا ہے [۲۳]۔ فنی نقطۂ نظر سے زبردست اہمیت کی حامل ہے۔

۸ - کتاب فی الفرق بین العلل التی تشتبہ اسبابھا وتختلف اعراضھا:۔ بعض تذکرہ نگاروں نے "فی الفرق" کی بجائے "التفریق" لکھا ہے۔[۲۴]

۹ - رسالہ فی التحذر من اخراج الدم من غیر حاجتہ دعت الی اخراجہ:

۱۰ - رسالہ فی الزکام واسبابہ وعلاجہ

۱۱ - رسالہ فی النوم والیقظہ

۱۲ - مجربات فی الطب: بعض تذکروں میں "مجربات" "یا" کے ساتھ تحریر ہے۔[۲۵]

۱۳ - مقالہ فی الجذام واسبابہ وعلاجہ - ابن الجزار کے اس رسالے کا لاطینی ترجمہ قسطنطین افریقی نے کیا اور اپنی عادت کے مطابق طبعزاد قرار دیکر اپنی طبی کاوشوں میں شامل کرلیا۔

۱۴ - کتاب الخواص۔ اس کتاب کا لاطینی اور عبرانی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔[۲۶]

۱۵ - کتاب فی نعت الاسباب المولدہ للوباء فی مصر وطریق الحیلۃ فی دفع ذلک وعلاج مایتخوف منہ

۱۶ - رسالہ الی بعض اخوانہ فی الاستھانہ بالموت۔ کمال سامرائی نے "رسالہ فی اسباب الوفات" کے نام سے ایک رسالے کا تذکرہ کیا ہے، قرین قیاس ہے کہ وہ یہی رسالہ ہے۔

۱۷ - رسالہ فی المعدہ واوجاعھا:

۱۸ - کتاب نصائح الابرار۔ کمال سامرائی نے کتاب نصائح الابرار کے علاوہ کتاب النصح کے نام سے بھی ایک کتاب تحریر کی ہے ممکن ہے دونوں ایک ہی ہوں۔ کتاب نصائح الابرار کا حوالہ طب المشائخ میں جا بجا ملتا ہے۔

۱۹ - کتاب البلغۃ فی حفظ الصحت۔

۲۰ - کتاب فی الحمامات۔

۲۱ - کتاب المختبرات: (نام کے اعتبار سے یہ بھی طبی کتاب معلوم ہوتی ہے اس لئے طب کے ذیل میں تحریر کردی گئی ہے۔

ڈاکٹر کمال سامرائی نے ابن ابی اصیبعہ کی طبی فہرست میں درج ذیل کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔

۲۲ ۔ طب المشائخ وحفظ صحتہم ۔

۲۳ ۔ سیاسۃ الصبیان وتدبیرھم ۔

۲۴ ۔ کتاب فی الکلی والمثانہ ۔

۲۵ ۔ کتاب مداواۃ النسیان وطرق تقویۃ الذاکرہ : ابن الجزار کی اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ہو چکا ہے ۔

۲۶ ۔ کتاب المالنخولیات

۲۷ ۔ اصول الطب ۔ اس کتاب کا حوالہ ابن الجزار کی تالیف طب المشائخ وحفظ صحتہم میں ملتا ہے ۔

۲۸ ۔ کتاب العصر ، اس کا بھی حوالہ طب المشائخ وحفظ صحتہم میں ملتا ہے ۔

۲۹ ۔ قوت المقیم فی الطب ۔ اس کتاب کے بارے میں جمال الدین ابن القفطی نے لکھا ہے کہ قفط میں اس نے بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا ، جو بیس جلدوں میں تھی ، ایک خیال یہ بھی ہے کہ "کتاب العدہ لطول المدہ" اور یہ ، دونوں ایک ہی ہیں ۔

۳۰ ۔ کتاب السموم ، اس کا حوالہ ابن البیطار (متوفی ۶۴۶ھ) نے کتاب الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیہ میں دیا ہے ۔

۳۱ ۔ کتاب النصح ، عین ممکن ہے کہ یہ کتاب نصائح الابرار ہی ہو ۔

۳۲ ۔ کتاب فی فنون الطیب والعطر

۳۳ ۔ کتاب الاحجار

(ب) علوم متفرقہ

۳۴ ۔ کتاب التعریف بصحیح التاریخ ۔ اس کتاب میں اس عہد کے علماء اور حکماء کے احوال درج ہیں ۔

۳۵ ۔ رسالہ فی النفس وفی ذکر اختلاف الاوائل فیھا

۳۶ ۔ کتاب المکلل فی الادب

۳۷۔ کتاب اخبار الدولۃ۔ اس میں بلاد غرب سے ظہور مہدی کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔
۳۸۔ کتاب الفصول فی سائر العلوم والبلاغات، ڈاکٹر کمال سامرائی کے حوالے سے اس فہرست میں درج ذیل کتابوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔[۲۱]
۳۹۔ کتاب مغازی افریقیا فی فتوحات العرب لتونس
۴۰۔ عجائب البلدان

ابن الجزار کے دستیاب مخطوطات

۱۔ کتاب فی الادویۃ المفردہ یا کتاب الاعتماد فی الادویۃ المفردۃ۔ اس کے قلمی نسخے مکتبۃ الجزار، اسکوریال، آیا صوفیا اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ یہ کتاب چار مقالات پر مشتمل ہے، آیا صوفیا کا نسخہ ۳۵۶۴ کے تحت مندرج ہے۔ پہلے مقالے کو خط نسخ میں ابوالفرج نے نقل کیا ہے اور دوسرا، تیسرا و چوتھا خط نسخ میں الفوز بن ابی الحسن الصوری نے ۵۳۹ھ میں نقل کیا۔

۲۔ کتاب فی علاج الامراض یا کتاب زاد المسافر فی قوۃ الحاضر۔ اس کے قلمی نسخے پیرس، فاتیکان، فلورنس، اسکوریال بوڈلن (آکسفورڈ) از میر ملی، کمانکش اور ہندوستان میں رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں۔ از میر ملی والا نسخہ اندراج نمبر ۴۷/۵ کے تحت ۱۷۵ اوراق پر مشتمل۔ خط نسخ میں ہے، سنہ کتابت ۴ شوال ۹۷۲ھ ہے، نسخہ کمانکش ناقص الآخر ہے۔ اندراج نمبر ۳۵۳ کے تحت محفوظ ہے۔ یہ صفحہ ۲ ب سے شروع ہو کر ۶۲ ب پر (ناقص الآخر کے طور پر) ختم ہوتا ہے۔ خط مغربی اور سنہ کتابت دسویں صدی ہجری ہے۔

۳۔ رسالۃ فی ابدال الادویہ۔ اس کے تین نسخے ابتک دریافت ہو سکے ہیں۔ مکتبہ احمد خیری (مصر) میں رسالہ فی ابدال الادویہ کے نام سے۔ دوسرا برلن لائبریری میں کتاب الابدال کے عنوان سے اور تیسرا اسکوریال میں اعداد العقاقیر کے نام سے۔

۴۔ کتاب طب الفقراء والمساکین۔ اس کے قلمی نسخے غوطہ، اسکوریال اور خراجی اوغلی کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں، خراجی اوغلی والا نسخہ ۴۸ اوراق پر مشتمل، ۱/۱۲۶۷ کے تحت مندرج

ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۸۰۵ھ ہے۔

۵۔ طب المشائخ وحفظ صحتھم۔ اس کے دو نسخے مصر کے دو کتاب خانوں دار الکتب اور (مکتبہ) احمد خیری میں موجود ہیں۔

۶۔ سیاستہ الصبیان وتدبیرھم۔ یہ کتاب بائیس ابواب پر مشتمل ہے اور اپنے موضوع پر نہایت جامع تصور کی جاتی ہے۔ محمد الحبیب الہیلہ نے اس کو ایڈٹ کر کے ۱۹۷۰ء میں تونس سے شائع کیا ہے اس بابت حسین عمر حمادہ کا ایک تقابلی مضمون اور فاروق بن منصور کا ایک تعارفی مضمون المعہد التراث العلمی العربی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ہے، قلمی نسخے اسکوریال اور تاتیانا میں موجود ہیں۔

۷۔ کتاب فی الکلی والمثانہ۔ اس کا قلمی نسخہ بوڈلین کے کتاب خانے میں موجود ہے۔

۸۔ کتاب فی المعدہ وامراضہا ومداواتہا۔ اس کے قلمی نسخے اسکوریال اور عراق کے نیشنل میوزیم میں موجود ہے۔ عراق کے نیشنل میوزیم میں یہ "طب المعدہ" کے نام سے ہے۔ یہ چار فصول پر مشتمل ہے، عربی متن سلمان قطایہ نے ایڈٹ کر کے ۱۹۸۱ء میں بغداد سے شائع کیا ہے۔

۹۔ کتاب المالنخرلیات۔ اس کا قلمی نسخہ بوڈلین کے کتاب خانے میں کتاب فی الکلی والمثانہ کے ساتھ موجود ہے۔

۱۰۔ کتاب فی الادویۃ المرکبہ یا البغیہ۔ اس کا قلمی نسخہ مکتبہ جراح، حلب میں موجود ہے۔

۱۱۔ کتاب فی فنون الطب والعطر۔ اس کے قلمی نسخے اسماعیل صائب اور بغدادی وہبی کے کتاب خانوں میں موجود ہیں، نسخہ اسماعیل صائب ۱۸ اوراق پر مشتمل ہے اور سنہ کتابت آٹھویں صدی ہجری ہے، نسخہ بغدادی وہبی ۶۲ اوراق پر مشتمل ہے، خط نستعلیق میں وہبی الدوری نے ۱۳۲۲ھ میں لکھا ہے۔

۱؎ معجم البلدان ۲/۱۲۶

۲؎ البیان المغرب ۱/۲۳۸

۳۔ فہرس مخطوطات الطب الاسلامی باللغات العربیہ والترکیہ والفارسیہ فی مکتبات ترکیا ۲۹۔
۴۔ بروکلمان ۱/ ۲۳۸
۵۔ مختصر تاریخ الطب الاسلامی ۱/ ۶۴۱
۶۔ فاطمیوں میں معد نام کے دو حکمراں ہوئے ہیں۔ جنھوں نے تونس پر حکومت کی تھی اول ابوتمیم معد المعزلدین اللہ (۹۵۲-۹۷۵) دوم ابوتمیم معد المستنصر باللہ (۱۰۳۵-۱۰۹۴ء) قرین قیاس یہ ہے کہ ابوتمیم معد المعزلدین اللہ کے عہد میں ابن الجزار حیات تھا (وسیم احمد اعظمی)
۷۔ عیون الانبار فی طبقات الاطبار ۴۸۱،
۸۔ یہ اسماعیلی فقہا میں سے تھا اور مصر کے فاطمی خلفار کے اولین انصار میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے تاریخ۔ فلسفہ اور فقہ کا درس بھی دیا تھا، مصر میں ۹۰۷ء میں فوت ہوا۔ (حاشیہ عیون الانبار فی طبقات الاطبار ۴۸۱)
۹۔ عیون الانبار فی طبقات الاطبار ۴۸۱،
۱۰۔ ایضاً، ۴۸۱۔
۱۱۔ ایضاً، ڈاکٹر کمال سامرائی کے بقول عبیداللہ الفاطمی سے اس کی راہ ورسم تھی، وہ اس سے خصوصی تعلق رکھتا تھا اور اس کی صحتی تدابیر کی فکر میں رہتا تھا۔ (ملاحظہ کریں مختصر تاریخ الطب العربی) یہ ممکن ہے کہ عبیداللہ الفاطمی کی کنیت ابوطالب ہو۔ اس طرح ابن ابی اصیبعہ اور کمال سامرائی کے اقوال میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا۔ (وسیم احمد اعظمی)
۱۲۔ ملاحظہ کریں عیون الانبار فی طبقات الاطبار ۴۸۰۔ واضح رہے کہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ موسم گرما میں اپنی معالجاتی طبی سرگرمیوں سے دستبردار ہو کر ساحلی علاقوں میں چلا جاتا اور سیر و تفریح کرتا، مچھلیوں کا شکار کرتا" (کمال سامرائی) حکیم سید محمد حسان نگرامی اپنی کتاب میں موسم گرما کے علاوہ دوسرے موسموں میں بھی دریا کنارے جانے کی بات کرتے ہیں لکھتے ہیں "مختلف موسموں میں وہ دریا کے کنارے چلا جاتا اور وہاں تصنیف و تالیف اور مطب کا کام جاری رکھتا تھا۔" (تاریخ طب۔ ابتدا تا عہد حاضر ۲۴۹) اس بابت موصوف نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ تصنیف و تالیف کی بات تو قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

۱۳؎ براؤن کے یہ خطبات ۱۹۲۱ء میں اریبین میڈیسن کے نام سے کتابی شکل میں لندن سے شائع ہوئے، اریبین میڈیسن کا اردو ترجمہ مع تنقیحات وتشریحات حکیم سید علی احمد نیر واسطی (متوفی ۱۹۸۵ء) نے ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور (پاکستان) سے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا، اس سے پہلے یہ ترجمہ بالاقساط ماہنامہ الحکیم لاہور میں بھی شائع ہوا تھا۔

۱۴؎ اریبین میڈیسن

۱۵؎ عیون الانبار فی طبقات الاطبار ۴۸۰۔ عین ممکن ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کے اس اخلاق کریمانہ والے تذکرے نے پروفیسر ای۔ جی براؤن کو سوچنے پر مجبور کیا ہو کہ آخر ابن ابی اصیبعہ کو اس تذکرے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ پھر اس نے اپنی خاص ذہنی روش سے مجبور رہو کر واقعات کا تانے بانے سے "بحری قزاقی" کا تبیع عمل تلاش کر لیا۔

۱۶؎ عیون الانبار فی طبقات الاطبار ۴۸۱

۱۷؎ واضح رہے کہ ابن الجزار کے بارے میں بیشتر تذکرہ نگاروں نے تھوڑا بہت توالتزام کے ساتھ لکھا ہے۔ چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانبار فی طبقات الاطبار ۴۸۱۔ ۴۸۲ میں ابن جنجل نے طبقات الاطبار والحکمار ۸۸۔ ۹۰ میں، ابن شاکر نے عیون التواریخ ۱۲۸/۱ میں، صفدی نے الوافی بالوفیات ۱۱۰/۴۔ ۱۱۱ میں یاقوت حموی نے معجم البلدان ۱۲۶/۲۔ ۱۲۷ میں، ابن العذاری نے البیان المغرب ۱۳۳/۱ میں، حاجی خلیفہ نے ۲۷، ۱۲۰، ۲۱۵، ۲۵۳، ۴۲۰، ۱۴۸ میں، عمر رضا کمالہ نے معجم المؤلفین ۱۳۷/۱ میں، خیرالدین الزرکلی نے ۳۹۴/۳۔ ۳۹۵ میں، احسان اوغلی نے فہرس مخطوطات الطب الاسلامی باللغات العربیہ والترکیہ والفارسیہ فی مکتبات ترکیا ۲۹۔ ۳۰ میں، مایسر ہوف التراث الاسلامی ۴۷۴ میں، الفجر (تیونس) ۱۱۷/۱۔ ۱۲۰ میں، عبدالوہاب نے الورقات ۳۰۶/۱۔ ۳۲۲ میں، محمد الحبیب الہلیلہ نے ابن الجزار کی کتاب "سیاستہ الصبیان وتدبیرہم" کے مقدمہ میں، الفیصل شمارہ ۲۷، ۱۹۷۹ء میں، کمال سامرائی نے مختصر تاریخ الطب الاسلامی ۶۴۱/۱۔ ۶۴۷ میں، حسنین عمر حمادہ اور فاروق بن منصور نے العہد التراث الاسلامی ۱۹۸۳ء میں حکیم غلام جیلانی نے تاریخ الاطبار ۳۶۔ ۳۸ میں، حکیم سید علی احمد نیر واسطی نے طب العرب تشریحات وتنقیدات ۳۶۳۔ ۳۶۵ میں اور حکیم سید محمد حسان نگرامی نے تاریخ طب

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

چہار گلشن : ایک تنقیدی جائزہ

از: محمد ریاض الدین خاں

اسلامی ہند کی اہم ترین تاریخی تصنیفات میں چہار گلشن یا اخبار النوادر کا مقام بھی کسی اور تاریخی کتاب سے کم نہیں ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی معاشرت، میلے، ٹھیلے، رسم و رواج، آب و ہوا، مالگزاری کی آمدنی، زمین کی پیمائش ایسے موضوع بھی زیرِ بحث رہے ہیں۔ اس کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شوکت علی خاں "قصرِ علم" کے صفحہ نمبر ۵ پر اس طرح رقم طراز ہیں۔

"فارسی تاریخوں میں خصوصاً اسلامی ہند کی تاریخ کا بڑا ذخیرہ ہے۔ اکبر نامہ جہانگیر نامہ، تزکِ جہانگیری، امیر نامہ، تیمور نامہ، تاریخ نادری اور اس کے ساتھ تاریخ تاج محل، "چہار گلشن"، خلاصۃ التواریخ، سیر المتاخرین، طبقات اکبر شاہی شاہ جہاں نامہ، بادشاہ نامہ، ظفر نامہ تیموری، عالمگیر نامہ، مرأت، آفتاب نامہ واقعاتِ عالمگیری اور عالم آرائے عباسی وغیرہ کے قلمی نسخے ہیں۔"

مندرجۂ بالا سطور اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ وزیر غازی الدین خاں کے استصواب پر احمد شاہ ابدالی کے دہلی پر دوسرے حملے کے وقت فارسی زبان میں لکھی گئی ہندوستانی تاریخ موسوم "چہار گلشن" عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے غیر مطبوعہ تاریخی مخطوطات میں ایک اہم اور نادر مخطوطہ ہے۔ اس میں ہندوستان کی قدیم تاریخ سے عہدِ مغلیہ تک کے احوال ضبط تحریر ہیں۔ اس غیر مطبوعہ اہم فارسی مخطوطہ کے مصنف "رائے چتر من کایستھ" ہیں جنھوں نے ۱۱۷۳ھ میں اس کتاب کو تصنیف کیا تھا اور اس کے کچھ عرصہ بعد ان کی موت واقع ہو گئی۔ مصنف کی موت کے ۳۱ سال بعد ان کے پوتے رائے زادہ چندر بھان منشی کایستھ نے ۱۲۰۴ھ میں اس تاریخی دستاویز کو مرتب کر کے اس میں ایک مقدمہ شامل کیا۔ آنجہانی چتر من کایستھ کا یہ تاریخی مخطوطہ ان کی مسلسل اور سخت قلمی محنت کی دلیل ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو قدیم ہندوستان سے

لیکر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے عہد تک کی معلومات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے یہ مجموعۂ اوراق ایسے عظیم کرداروں اور ان کی کارکردگی اور کارناموں سے بھرا ہوا ہے جو ہندوستان کے تاریخی افق پر مختلف دور میں اختر سحر بن کر طلوع ہوئے اور اپنے پیچھے اپنی یادیں اور یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔ اس طرح کی تمام معلومات کو یکجا کر کے مصنف نے ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس کے باعث تاریخی دنیا میں اس کا نام نامی تا قیامت روشن، دائم اور قائم رہے گا۔ تاریخ کے طالب علموں، محققین، دانشوروں، ذی علم، ذی شعور اور ذی شوق قارئین کے لئے اس کتاب میں مصنف نے دہلی اور دکن کے سلاطین اور دہلی کے مختلف صوبوں کو جانے والی مختلف شاہراہوں۔ نیز منازل کے علاوہ ہند کے فقرار کا ذکر اور اس دور کی تاریخی معلومات کو یکجا کر کے اثر انگیز پیرائے میں لکھا ہے۔ مصنف نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کی آمدنی، زمین کی پیمائش وغیرہ اس کتاب میں درج کر کے اس مخطوطے کو دیگر تاریخی مخطوطوں سے منفرد، ممتاز اور اہم مقام عطا کر دیا ہے۔ یہاں یہ لکھنا بھی برمحل ہے کہ ان کے پوتے چندر بھان کایستھ نے اس کتاب کو مرتب کر کے ایک قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد مورخ اور محقق ہندوستان کی تاریخ کو ایک صحیح سمت دکھانے میں یقیناً گامزن ہو سکیں گے۔

اس چہار گلشن میں پانڈوں سے لیکر ۱۱۳۰ھ تک کی ہندوستان کی تاریخ درج ہے۔ متذکرہ کتاب میں چار گلشن ہیں گلشنِ اول در احوالِ بادشاہان ہندوستان ہے۔ اس میں ہندوستان کے فرماں رواؤں کے احوال کے ساتھ ساتھ وہاں کے صوبہ جات نیز فقرار قلعہ جات مشہور مقدس مقامات وغیرہ کے بارے میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرا گلشن بیانِ صوبہ جات جنوبستان سے متعلق ہے۔ اس میں دکن کے صوبے اور وہاں کے بادشاہوں کے حالات کے ساتھ ساتھ مقدس مقامات قلعہ جات، پیداوار، آب و ہوا، رسم و رواج، ندیاں، نالوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ گلشنِ اول اور دوم میں ہندوستان اور جنوبستان کے صوبوں کی سرکاریں، وہاں کی سالانہ آمدنی، زمین کا رقبہ وغیرہ بھی سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔ تیسرا گلشن در مسافات و منازل چہار سو شاہ جہاں آباد دہلی کے نام سے ہے اس میں بیجاپور، اورنگ آباد، برہان پور، اجین، بہرائچ، آگرہ، لاہور، اٹک، کابل، کشمیر، ملتان اجمیر، گجرات، احمد آباد، بھکر، الہ آباد، پٹنہ اور لکھنؤ وغیرہ تک کی منزلیں مرقوم ہیں۔ مصنف نے اپنے

طور پر قلم برداشتہ خاکے (FREEHANDSKETCHES) بنا کر ندیاں، پل، سرائے، گھاٹیاں درمیان کے قصبہ جات اور شہر وغیرہ بھی واضح کئے ہیں۔ چوتھا گلشن در ذکرِ سلاسلِ فقراء و درویشانِ اسلام و ہنود ہے اس میں مسلمان صوفیوں کے سلسلوں کا ذکر ہے۔ ہر سلسلہ کے پیشواؤں کا فلسفہ مسلک، ان کی ولادت اور وفات کی تاریخ۔ کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے مختصر احوال بھی درج ہیں۔ ہندو درویشوں کے ذکر سے پہلے تفصیل سے ان کے آغاز، درشن، فلسفۂ نظر بھی بیان کئے گئے ہیں

مخطوطہ اگرچہ نستعلیق ہے لیکن اس کے باوجود اکثر مقامات پر عبارت پڑھنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ کاتب نے خصوصاً ہندی ناموں اور ہندی الفاظ کی صحت کو مدِنظر نہیں رکھا۔ فارسی الفاظ میں بھی کہیں کہیں املا کی غلطی ہے اور کہیں تو الفاظ ہی غلط لکھ دیئے گئے ہیں۔

مثلاً "کتاب کے آغاز کو لیجیے جہاں کاتب نے "مظہرِ دانش و بینش" میں بینش لفظ کو "دائما سیراب بادا، چار گلشن در جہاں"

مصنف نے مخطوطہ میں جا بجا اسلامی مہینوں محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاوّل جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوّال، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور کہیں ایرانی مہینوں فروردین اردی بہشت، خورداد، تیر، مرداد، شہریور، مہر، آبان، آذر، دی، بہمن، اور اسفند کے ناموں سے عبارت کو تاریخی پس منظر میں باندھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

مخطوطہ کے گلشن دوم اور سوم کا اندازہ سیاق وسباق کی عبارت سے لگایا جا سکتا ہے مصنف یا کاتب نے گلشن دوم اور سوم کے لیئے الگ سے سرخی قائم نہیں کی ہے۔ گلشن اول کی عبارت میں جا بجا جگہ چھوڑی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں کیا لکھا ہونا چاہیئے تھا بعید از قیاس ہے۔ گلشن چہارم میں گرونانک سے گرو گوبند سنگھ تک جو دس گرو ہوئے ہیں۔ ان میں سکھوں کے گرو ارجن کے بعد ہونے والے گرو کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ انسٹی ٹیوٹ میں جناب شوکت علی خاں صاحب ڈائریکٹر نے فارسی زبان کے مخطوطات کو ہندی زبان میں ترجمہ کا جو اہم سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کے باعث اس مخطوطہ کا ترجمہ احقر نے موصوف کی زیرِ نگرانی مکمل کر لیا ہے جو اس وقت تصحیح، تقابل کی منزل میں ہے اور ان شاء اللہ بہت جلد انسٹی ٹیوٹ سے اس کی اشاعت متوقع ہے۔ آنجناب نے فارسی زبان

کے مخطوطوں کے ہندی تراجم کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کا عین مقصد اس ادارہ کو قومی دھارے سے جوڑنا اور جمہوری اقدار سے ان کی بے پناہ حب الوطنی کی دلیل ہے۔ یہ بات صاف ہے کہ اس طرح کے تراجم سے مورخ ملک کو صحیح سمت دکھا سکیں گے اور قومی یکجہتی اور قومی ایکتا ایسی ملک گیر تبلیغ میں معاون ثابت ہونگے۔

بقیہ: ابن الجزار چوتھی صدی ہجری کا ایک ممتاز طبیب

۳۴۸ - ۳۵۱ میں ابن الجزار کی شخصیت اور آثار پر روشنی ڈالی ہے۔ (وسیم احمد اعظمی)

۱۸ ابن البیطار (متوفی ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) نے کتاب الجامع المفردات الادویۃ والاغذیہ میں جا بجا اس کے حوالے دیئے ہیں۔ جوادویہ واغذیہ کے بارے میں اس کے مقام کی تعین کے لئے کافی ہیں

۱۹ سلمان قطایہ نے علی بن رضوان کی اس کتاب کا تعارف معہد التراث العلمی العربی اپریل ۱۹۸۰ء کے شمارے میں کرایا ہے۔

۱۹ بحوالہ مختصر تاریخ الطب الاسلامی مولفہ کمال سامرائی

۲۰ عیون الانباء فی طبقات اطباء ۴۸۱

۲۱ مختصر تاریخ الطب الاسلامی

۲۲ مخزن الجواہر کے مؤلف جناب حکیم غلام جیلانی مرحوم نے طب الفقراء کے ساتھ علاج الغرباء بھی لکھا ہے ملاحظہ کریں۔ ۱۳۰

۲۳ ملاحظہ کریں مختصر تاریخ الطب الاسلامی ۱/۶۴۱ - ۶۴۷

۲۴ ایضاً

۲۵ ایضاً

۲۶ بروکلمان ۱/۲۳۸

۲۷ ملاحظہ کریں مختصر تاریخ الطب الاسلامی ۱/۶۴۱ - ۶۴۷ -

برہان

جلد ۱۱۱ | نومبر ۱۹۹۲ء مطابق جمادی الاول ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۵

پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

معاہدہ حوالگی

حال ہی میں ہندوستان کے وزیر داخلہ مسٹر چوان انگلستان گئے تھے۔ تاکہ برطانیہ اور ہند کے درمیان دہشت گردوں اور مجرموں کی حوالگی کے معاہدہ پر دستخط کریں۔ اس معاہدہ کے تحت جہاں دونوں ملک مجرموں اور دہشت گردوں کو ایک دوسرے کے حوالے کرنے کے پابند ہوں گے۔ وہاں دہشت گردوں کے فنڈ کو بھی ضبط کرنے کا اختیار ہوگا۔

یہ معاہدہ بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ گذشتہ دس برسوں میں دہشت گردی۔ صرف کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں رہا۔ بلکہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گیا۔ ہاں مغربی ممالک نے اس پر بروقت توجہ کی۔ اور انہوں نے ایسی تدابیر اپنائیں کہ دہشت گردانہ تشدد اور اس قماش کے لوگوں سے بچاؤ ہوسکے۔ نئے قوانین بنائے گئے۔ اور ان میں عبرتناک سزائیں رکھی گئیں۔ ایشیائی ممالک اس معاملہ میں بھی ان سے پیچھے رہے۔ ایشیائی ملکوں میں ہندوستان میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ سنگین ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم نے انگلستان کے ساتھ حوالگی کا معاہدہ تو کرلیا۔ لیکن ابھی تک اندرون ملک ایک ایسا جامع قانون نہیں بنایا جاسکا۔ جس میں دہشت گردی کے جرم کی تمام شکلوں کے انسداد کا خیال رکھا جاتا۔

دہشت گردی یا مسلح حملوں کی تاریخ کی جڑیں بھی ایشائی دیشوں میں ملتی ہیں۔ شروع شروع میں ایشائی ملکوں میں، غیر ملکی سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد کا آغاز ہوا تو کچھ حریت پسندوں نے "مسلح شورش" یا مسلح اجتماعی حملوں" کے ذریعہ سامراج حکومت پر ضرب لگانے کا راستہ اپنایا۔ جبکہ کچھ حریت پسندوں نے پرامن جدوجہد اور ستیاگرہ کا راستہ اپنایا ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کی یہ دونوں شکلیں موجود رہی ہیں۔ جبکہ افریقہ کے ممالک میں مسلح جدوجہد کا رجحان چھایا رہا۔ جب یہ ایشائی ممالک آزاد ہوگئے تو قدرتی امر تھا کہ اس طرح کے طور طریقوں کو خیرباد کہہ دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب اہل ملک نے

اپنی ہی ملکی حکومتوں کے خلاف ایجی ٹیشن کے ان حربوں کو آزمانا شروع کردیا مثلاً ستیاگرہ کے حربہ کا ہندوستان میں انتہائی غلط استعمال ہوا۔ اسی طرح دھرنے کا حربہ تھا۔ جو کبھی انگریزی سامراج کے خلاف استعمال کیا گیا تھا۔ اب یہ شب و روز اپنی ہی حکومت کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ پہلے غیر ملکی حکومت سے اپنی بات منوانے کے لیے "چکہ جام" کیا جاتا تھا۔ اب یہ حربہ بھی اپنی ہی حکومت کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ پُر تشدد تدابیر کا ہے مسلح شورش بھی اب اپنی ہی حکومت کے خلاف ہو رہی ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ پنجاب کشمیر، شمالی مشرقی ریاستوں اور آندھرا میں یہ مسلح شورش کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ کہیں یہ حزب المجاہدین اور خالصتانیوں کے نام پر ہے تو کہیں الفا اور نکسلیوں کے نام پر۔

ہندوستان کے لئے یہ صورت حال انتہائی تشویشناک اور صبر آزما ہے۔ یہ صورت حال پیدا کیوں ہوئی پھوڑے کو ناسور کیوں بننے دیا گیا۔ اس کا جواب دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ دوراندیش حکومتیں، دوراندیشانہ منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ مرکزی حکومت کو صرف اقتدار سے دلچسپی ہے۔ اور اس کی خاطر وہ غلط سے غلط بات پر سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہوتی ہے یہ ابن الوقتی اور موقعہ پرستی۔ وقتی طور پر تو فائدہ پہونچاتی ہے۔ لیکن بعد میں دکھ دیتی ہے۔ آج ہمارے جتنے بھی قومی مسائل ہیں۔ وہ ہماری اسی روش کی پیداوار ہیں۔ ہم نے کسی بھی محاذ پر طویل المدت منصوبہ بندی نہیں کی۔ اب ہم ایک ایسی صورت حال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جس سے نکلنے کا راستہ نظر نہیں آتا مختصر یہ کہ حالات کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں۔

۴۷ء کے بعد۔ فرقہ وارانہ تشدد ایک سنگین مسئلہ بن کر ابھرا تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ ہماری ہندوستانی زندگی کا ایک مستقل عنصر بن گیا۔ مدبر سیاستدانوں نے جن میں مولانا ابوالکلام آزاد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی شامل تھے۔ اسی وقت کہا تھا کہ تشدد کے اس رجحان کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اسی تشدد نے مہاتما گاندھی کی جان لی، افسوس کہ حکومت پھر بھی نہ جاگی۔ اور اس معاملہ میں قومی پیمانہ پر بیداری کی کوئی تحریک نہ چلائی۔ آر ایس ایس کے کیمپوں میں مسلسل مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں، تشدد کا پرچار جاری رہا۔ اور فرقہ پرست ہندو تنظیمیں، مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتی رہیں۔ فرقہ وارانہ

فسادات روزمرہ کی زندگی بن گئے۔ ان فسادات میں سینکڑوں بے گناہ مرد عورتیں اور بچوں کے خون سے ہاتھ رنگے جاتے۔ آزاد ہندوستان کے ریکارڈ پر چار ہزار سے زائد فسادات ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت یا تو نااہل ہے۔ یا ان فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ حکومت کے کچھ مقاصد کی بالواسطہ تکمیل ہوئی ہے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک شرمناک باب ہے۔

تشدد کا ہی رجحان بڑھ کر صوبہ پرستی، علاقہ پرستی، نکسلی اور قبائلی تشدد، ذات پات کے تشدد اور مذہب کے نام پر تشدد کا بھیانک روپ دھار گیا۔ آج یہ ایک ایسا جن بن چکا ہے۔ جو بوتل سے باہر ہے۔ حکومت ہاتھ پاؤں مار رہی ہے لیکن۔ ع

خود کردہ را علاج نیست

جو ہم نے بویا تھا۔ وہ کاٹنا بھی ہوگا۔ ہم کانٹے بو کر پھول چاہتے ہیں، ہم سے بڑا نادان کون ہوگا۔

مہلت ختم ہونے والی ہے

بابری مسجد تنازعہ کے حل کے لئے وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ نے وشو ہندو پریشد اور ایودھیا کے سنتوں سے تین ماہ کی مہلت مانگی تھی، وہ جلد ختم ہونے والی ہے۔ اس دوران میں اب تک جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

ایودھیا تنازعہ سے متعلق تمام دستاویزات اور ریکارڈ کی زمرہ بندی کی گئی۔ حکومت نے مختلف افراد اور تنظیموں سے اس سلسلہ میں تجاویز مانگی تھیں۔ ان سب کی بھی زمرہ بندی کی گئی۔ یہ کام اس سلسلہ میں قائم کردہ خاص شعبہ نے کیا۔ وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ نے وشو ہندو پریشد کے لیڈروں اور آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ممبران کو گفت و شنید کے لئے بلایا۔ چنانچہ اس وقت تک مذاکرات کے تین دور ہو چکے ہیں۔ مذاکرات کا تیسرا دور جو ۸ نومبر کو ہوا اس میں ان دستاویزات اور شواہد پر غور ہونا تھا جو ان دونوں فریقوں نے حکومت ہند کے سپرد کیے تھے لیکن قبل اس کے کہ ان دستاویزات اور شواہد پر غور شروع ہوتا۔ وشو ہندو پریشد کی طرف سے ۶ دسمبر سے مسلسل کارسیوا کے اعلان پر گفت و شنید کا مسئلہ تعطل کا شکار ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف

ے اس اعلان کے بعد کہ کارسیوا ۶ دسمبر سے شروع ہو جائیگی اور بغیر رکے ہوئے اس وقت تک جاری رہے گی کہ جب تک کہ مندر کی تعمیر کا کام مکمل نہیں ہو پاتا۔ خوش اسلوبی اور باہمی افہام و تفہیم سے ایودھیا مسئلے کے حل ہونیکے امکانات تقریباً معدوم ہو گئے ہیں اور اس کے لئے بلاشبہ وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی ذمہ دار ہے۔

مسئلہ کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ وشو ہندو پریشد کا جارحانہ رویہ ہے۔ پریشد عدالتی فیصلہ پر رضا مند نہیں۔ حالانکہ اس مسئلہ کا اس سے بہتر حل اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ فریقین عدالتی فیصلہ کو مان لیں۔ وشو ہندو پریشد کا یہ رویہ جہاں ایک طرف اس مسئلہ کے حل میں بڑی رکاوٹ ہے۔ وہاں دوسری طرف عدلیہ کے وقار اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے لئے ایک چیلنج بھی ہے۔ ادھر بابری مسجد کے پاس ایکوائر شدہ زمین پر وشو ہندو پریشد کے زیر نگرانی ایک ٹھوس چبوترہ تعمیر کرایا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ کی مقرر کردہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ سپریم کورٹ میں داخل بھی کر دی ہے۔ بظاہر یہ چبوترہ آگے چل کر رام مندر کی تعمیر کے کام آسکتا ہے۔

مسٹر نرسمہا راؤ کہہ چکے ہیں کہ مندر تعمیر ہو گا۔ لیکن مسجد گرا کر نہیں۔ جبکہ فرقہ پرست تنظیموں کا سارا زور اس پر ہے کہ مسجد کو گرا کر مندر تعمیر کیا جائے گا۔ اور اسی پر انہوں نے عوام سے فتویٰ لیا ہے۔ فرقہ پرستوں کی لابی مسلسل اس کا پرچار کرتی رہی ہے کہ بابر غیر ملکی حملہ آور تھا۔ اور اس نے مندر گرا کر مسجد تعمیر کرائی تھی۔ لہٰذا اس مسجد کو گرا کر مندر بحال کیا جائے۔ اس دعوے کا پہلا ٹکڑا بنیادی طور پر غلط ہے۔ بابر نے ایک مسلم سلطنت پر حملہ کیا تھا ابراہیم لودی سے سلطنت چھینی تھی۔ ہندو مسلمان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ بابر اور اس کے جانشینوں کے لئے اس کا پورا پورا موقعہ تھا کہ بے شمار مندروں کو گرا کر مسجدوں میں تبدیل کر دیں۔ مسلم حکمرانوں نے اپنی طاقت کا بیجا استعمال کبھی نہیں کیا۔ یہ مغل حکمراں تھے۔ جنھوں نے رواداری کی ایک مثال قائم کی۔ بابر نے مغل حکمت عملی مرتب کی تھی کہ اس ملک کے لوگ گائے کی پوجا کرتے ہیں اس لئے گائے کا ذبیحہ رضاکارانہ طور پر بند کر دینا چاہیئے۔ اور ہندوؤں کے عقائد کا احترام کیا جانا چاہیئے۔ اکبر نے ستی پر پابندی لگانی چاہی۔ لیکن اسے مذہبی رسم کا درجہ دیا گیا تھا۔ اس لئے مکمل طور پر ستی کا انسداد نہ ہو سکا۔ ہاں ستی کے ساتھ کچھ شرطیں جوڑ دیں۔ ان میں ایک شرط یہ تھی کہ جو عورت ستی ہونا چاہتی تھی۔ حاکم عورتوں کے ذریعہ اس کی حقیقی مرضی معلوم کرے گا۔

حاکم کی عورتیں جاتی تھیں ۔ اور اسے ستی سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھیں ۔ اس بدترین لعنیت کا خاتمہ مغل نہ کر سکے تو اس لئے کہ وہ مذہب میں عدم مداخلت کے اصول پر کار بند تھے ۔ آخر کار راجہ رام موہن رائے کی کوششوں سے برطانوی حکمران ستی کے خلاف قانون بنانے میں کامیاب ہوئے ۔

ہم وشو ہندو پریشد کو مشورہ دیں گے کہ وہ تاریخی حقائق کا سامنا کرے ۔ اور اس دعوے سے دست بردار ہو جائے کہ یہ مسجد، مندر توڑ کر بنائی گئی ہے ۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے ۔

اردو یونیورسٹی

مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل مسٹر ارجن سنگھ کی جانب سے اعلان کیا گیا ہے کہ مرکزی سطح پر ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے اس کے لئے ایک گیارہ ممبری کمیٹی بنادی گئی ہے ۔ ان کے اس اعلان کا اردو نوازوں کے حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا ہے ۔

اردو کے سلسلہ میں مرکزی حکومت اور بعد ازاں صوبائی حکومتوں کا جو رویہ رہا ہے اس کے پس منظر میں ، حکومت کے اس اعلان کو بھی ایک سیاسی اسٹنٹ سے کچھ زیادہ سمجھنے پر دل کو آمادہ کرنا مشکل ہے ۔ لیکن فی الواقع حکومت کو اگر اپنی پچھلی وعدہ فراموشیوں کا احساس ہے ۔ اور اردو کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا واقعی طور پر وہ ازالہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے اس منصوبہ کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے ۔ ادھر کچھ مدت سے مسٹر ارجن سنگھ ایک سیکولر سیاستدان کے طور پر ابھرے ہیں ، ان کی طرف سے بار بار فرقہ پرست طاقتوں کو وارننگ ، اور سیکولر قوتوں کے اتحاد پر زور دیئے جانے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ اقلیتوں کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں بہر حال یہ ایک نیک فال ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ حکومت کے رویّہ میں تبدیلی آرہی ہے ۔

اردو یونیورسٹی کو کہاں ہونا چاہیئے ۔ اس کا فیصلہ تو کمیٹی ہی کرے گی ۔ لیکن اردو سے متعلق جو اعداد و شمار موجود ہیں ۔ ان کی بنیاد پر اردو یونیورسٹی کو آندھرا کے خطّہ تلنگانہ میں ہونا چاہیئے ۔ یوپی میں اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہے ۔ لیکن وہاں سے

ایک بھی اردو میڈیم ہائی اسکول اور سینئر سیکنڈری اسکول نہیں ہے۔ دلی میں ایسے اسکولوں کی تعداد خاصی ہے۔ لیکن یہاں پہلے سے پانچ یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک اور یونیورسٹی میں اضافہ کا کیا مطلب ہے۔ بہار کے ایک خطّہ میں اردو سیکنڈری اسکولوں کی بھاری تعداد ہے۔ لیکن وہاں بھی سینئر سیکنڈری اسکولوں کی گنی چنی تعداد ہے۔ یونیورسٹی کے لئے ۱۲ ویں پاس طلباء کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے اسکولوں کی بھاری تعداد تلنگانہ اور مہاراشٹر میں ہے۔ اس لئے اردو یونیورسٹی کے لئے موزوں ترین مقام تلنگانہ یا مہاراشٹر میں ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سابق ریاست حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو میڈیم کا کامیاب تجربہ ہو چکا ہے۔ کیوں نہ تلنگانہ ہی کے کسی شہر میں اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ کمیٹی کو ہمدری اس تجویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے۔

ترتیبِ مصحف ایک جائزہ

(حافظ سید ظفر علی، دارالسلام عمر آباد)

آخری قسط

آپکو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد جس طرح آپکو قرآن سنایا جائے اس طرح آپ اسکو پڑھیں۔ اس حکم کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور نے امت کو اس ترتیب کے مطابق سنایا ہو جس پر اس کی آخری قرأت ہوئی اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔

یہ ساری باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے چنانچہ آنحضرتؐ قرآن کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ اس خاص ترتیب پر آپکو سنائی گئی ہوں۔ صحابہ اسی ترتیب پر قرآن سنتے اس کو محفوظ کرتے اور اس کی پابندی کرتے۔ [1]

علامہ مودودیؒ رقمطراز ہیں؛

"ترتیب قرآن کے سلسلہ میں یہ بات بھی ناظرین کو معلوم ہونی چاہیئے کہ یہ ترتیب بعد کے لوگوں کی دی ہوئی نہیں ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت نبیؐ ہی نے قرآن کو اس طرح مرتب فرمایا تھا۔ پھر اسی ترتیب سے آپ خود بھی نماز میں اور دوسرے مواقع پر قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے۔ اور اسی ترتیب کے مطابق صحابہ کرام بھی اس کو یاد کرتے تھے لہٰذا یہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا نزول جس روز مکمل ہوا اس روز اس کی ترتیب بھی مکمل ہو گئی جو اس کا نازل کرنے والا تھا وہی اس کا مرتب کرنے والا بھی تھا۔ جس کے قلب پر وہ نازل کیا گیا اسی کے ہاتھوں اسے مرتب بھی کرا دیا گیا۔ کسی دوسرے کی مجال نہ

---

[1] تفسیر سورۂ قیامہ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی

تھی کہ اس میں مداخلت کرتا۔" [1]

ان کے علاوہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

"الاصح ان ترتیب السور توقیفی ایضاً وان کانت مصاحفهم مختلفة قبل العرضة الاخیرة التی علیها مدار جمع عثمان" [2]

صحیح بات یہی ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ اگرچہ کہ ان کے صحیفے آخری دورہ سے قبل مختلف تھے اور عرضۂ اخیرہ پر ہی جمع عثمان کا دار و مدار تھا۔

ملا عبد العلی بحر العلوم شرح سلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"اجمع اهل الحق علی ان ترتیب الای کل سورة توقیفی بامر الله و بامر الرسول و المحققون علی ان ترتیب السور من امر رسول الله صلی الله علیه وسلم" [3]

تمام علماء اہل حق کا اجماع ہے کہ تمام سورتوں کی آیتوں کی ترتیب اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ہے یعنی توقیفی ہے اور محققین علماء کا خیال ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہے۔

علامہ زرکشی تحریر فرماتے ہیں:

"لترتیب وضع السور فی المصحف اسباب تطلع علی انه توقیفی صادر عن حکیم احدها بحسب الحروف کما فی الحوامیم و ثانیها لموافقة اول السورة لآخر ما قبلها کآخر الحمد فی المعنی و اول البقرة و ثالثها للوزن فی اللفظ کآخر تبت و اول الاخلاص ورابعها لمشابهة جملة السورة لجملة الاخری مثل والضحی والم نشرح" [4]

ترتیب سور کے توقیفی ہونے کے چند دلائل ہیں۔ پہلی دلیل حروف کے اعتبار سے قرآن کی ترتیب ہے جیسے حوامیم۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ سورہ کی ابتداء ما قبل کی سورۃ کے آخر سے موافق ہے۔ تیسری دلیل لفظوں کے وزن کا ہے۔ اور چوتھی دلیل یہ ہے کہ پوری سورۃ ما قبل کی سورۃ کے مضمون سے ہم آہنگ ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۸ [2] مرقات ج ۲ ص ۶۲۳

[3] شرح سلم الثبوت ج ۲ ص ۱۲، ۱۱ [4] البرہان فی علوم القرآن

اس کے بعد ان محققین نے اپنے مخالفین کے دلائل کا تنقیدی جائزہ لے کران کا جواب دیا ہے جمہور جو سورتوں کی ترتیب کے غیر توقیفی ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے بارے میں علامہ زرکشی فرماتے ہیں کہ ترتیب سور کے اجتہادی اور توقیفی ہونے کے بارے میں علماء کا اختلاف لفظی ہے۔

"والخلاف يرجع الى اللفظ لان القائل بالثانى يقول انه رمز اليهم بذلك لعلمهم باسباب نزوله ومواقع كلماته" [1]

اور اختلاف دونوں فریقین کے درمیان لفظی ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب غیر توقیفی ہے کہ نبی اکرم ؐ نے ان کی طرف اس کام کو سونپا اس لئے کہ ان کو اسباب نزول اور مواقع کلمات کا علم تھا۔

جمہور نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں حضرت حذیفہ رض اور حضرت ابن عباس رض کی روایات ہیں۔ حضرت حذیفہ کی حدیث اس سے پہلے گذر چکی اور اس کے متعلق قاضی عیاض کا بھی قول گذر چکا ہے۔ قاضی عیاض ؒ نے ابو بکر باقلانی کے قول کا حوالہ دیا ہے اس کے بعد قاضی ابو بکر باقلانی فرماتے ہیں:

"واما من قال من اهل العلم ان ذلك بتوقيف من النبى صلى الله عليه وسلم كما استقل فى مصحف عثمان وانما اختلفت المصاحف قبل بيلغهم التوقيف فيتأول قراءته صلى الله عليه وسلم النساء ثم ال عمران هنا على انه كان قبل التوقيف والترتيب. قال ولا خلاف انه يجوز للمصلى ان يقرأ فى الركعة الثانية سورة قبل التى قرأها فى الاولى. . ." [2]

دوسری بات یہ کہ حضرت حذیفہ رض کی حدیث مضمون کی تنہا ایک روایت ہے۔ ذخیرۂ احادیث میں تلاش بسیار کے باوجود کوئی ایسی روایت نہ مل سکی جس سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہو بلکہ اس کے برعکس خود حضرت حذیفہ رض سے مستدرک، حاکم، سنن ابی داؤد اور شرح معانی الآثار میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ ایسی روایت موجود ہے جس میں ان سورتوں

---

[1] البرہان نوع ۱۴ [2] نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۳۰ مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ۔

کی ترتیب مصحف کی موجودہ ترتیب کے بالکل مطابق ہے۔ مستدرک حاکم کے الفاظ یہ ہیں:

من حذیفۃ قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من رمضان فی حجرۃ فقام فکبر ثم افتتح البقرۃ فقلت یبلغ راس المائۃ ثم قلت یبلغ راس المائتین قال ثم ختمھا ثم افتتح ال عمران فقرأھا ثم افتتح النساء فقرأھا ...." [1]

سنن ابی داؤد میں ایک مرفوع حدیث نقل ہوئی ہے اس میں بھی سورۂ بقرہ کے معاً بعد سورۂ آل عمران کا ذکر کیا گیا ہے جس سے مذکورہ بالا باتوں کو مزید تقویت پہونچتی ہے۔ روایت ہے۔

عن عوف بن مالک الاشجعی قال قمت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ فقام فقرا سورۃ البقرۃ ثم رکع بقدر قیام ثم سجد بقدر قیامہ ثم قام فقرا بال عمران ثم قرأ سورۃ سورۃ " [2]

دوسری روایت حضرت ابن عباس کی ہے۔ اس پر ناقدین حدیث نے کئی حیثیات سے سخت کلام کیا ہے "سند کے اعتبار سے اس میں یہ خرابی ہے کہ تمام طرق "عوف بن ابی جمیلہ" سے چلتے ہیں اور اس کا یہ حال ہے کہ ابن مبارک نے اس کو قدری شیعی کہا ہے [3] پھر اسی کتاب میں اسی صفحہ پہ میزان الاعتدال کے حوالے سے اس کو رافضی لکھا ہے ایک اور خرابی اس روایت میں یہ کہ "یزید الفارسی" مجہول شخص ہے۔ چنانچہ تہذیب التہذیب جلد یازدہم میں ہے یحییٰ ابن سعید لم یعرفہ۔ [4]

مناع القطان اس پر مناقشہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" یدور اسنادہ فی کل روایاتہ علی "یزید الفارسی" الذی یذکرہ البخاری فی الضعفاء وفیہ تشکیک فی اثبات البسملۃ فی اوائل السور کان عثمان کان یثبتھا برأیہ

---

[1] حاکم۔ المستدرک ج ۱ ص ۳۱۲ تحقیقات ۱۹۸۹ء

[2] سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب مایقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ بحوالہ سابق۔

[3] ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۱۶۷ بحوالہ عہد نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب از مولانا بدرالدین صاحب علوی دارالعلوم دیوبند ۱۹۵۱ء [4] بحوالہ سابق۔

قال فیه الشیخ احمد شاکر فی تعلیقه علیه مسند الامام
... اصل له"[1]

(۱) ان حدیث ابن عباس هذا غیر صحیح لان الترمذی قال فی تخریجه انه حسن غریب لا یعرف الا من طریق یزید الفارسی عن ابن عباس ویزید هذا مجهول الحال فلا یصح الاعتماد علی حدیثه الذی انفرد به فی ترتیب القرآن۔
(۲) انه علی فرض صحته یجوز ان جواب عثمان لابن عباس کان قبل ان یعلم بالتوقیف ثم علمه بعد ذلک"[2]

علامہ طیبی حضرت ابن عباس کے سوال کی توجیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"قال الطیبی توجیه السوال ان الانفال لیست من السبع الطوال لقصرها عن المائین لانها سبع وسبعون آیة ولیست غیرہا لعدم الفصل بینہا وبین براءة فاجاب عثمانؓ بما یشبه کل ما وجدہ فعلم من جوابه ان الانفال والبرأة نزلتا منزلة سورة واحدة وکملت السبع الطوال لہا"[3]

دوسرا قول جو ابن عطیہ کا ہے اس کا جواب مناع قطان اس طرح دیتے ہیں۔

"الذی یری ان بعض السور ترتیبہا توقیفی وبعضہا ترتیبه اجتہادی فان ادلته ترتکن علی ذکر النصوص الدالة علی ماہو توقیفی۔ اما القسم الاجتہادی فانه لا یستند الی دلیل یدل علی ان ترتیبه اجتہادی"[4]

امام بیہقی جن کی طرف علامہ سیوطیؒ کا بھی میلان ہے علامہ آلوسیؒ ان کا جواب یہ دیتے ہیں:

"ذهب البیهقی الی ان جمیع السور ترتیبہا توقیفی الا براءة والانفال ولله انشرح صدر الامام السیوطی لما ضاق ذرعا عن الجواب. والذی ینشرح له صدر هذا الفقیر هو ما انشرحت له صدور الجمع الغفیر من ان مابین الدفتین الآن موافق لما فی اللوح من باقی

[1] مباحث فی علوم القرآن مناع قطان ص ۱۴۴ [2] مناہل العرفان فی علوم القرآن
[3] حاشیہ ترمذی ص ۱۳۴ [4] مباحث فی علوم القرآن مناع القطان۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت کا تحقیقی جائزہ

(از شہاب الدین انصاری ایم۔ اے)

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ (یونس: ۵)

در اصل یہ موضوع ایسا ہے جو بہت ہی پیچیدہ ہے۔ محققین اور مورخین نے تمام مذہبی فرقوں اور خاص طور پر عیسوی تقویموں کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی مختلف تاریخوں کا تعین کیا ہے، جس سے یہ پتہ لگانا کہ کون سی تاریخ صحیح ہے اور کون سی نہیں، مشکل کام ہے۔ یہ طے امر ہے کہ اتنی تاریخوں میں سے سبھی تاریخیں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ پھر وہ کون سی ایسی تاریخ ہوگی جو صحیح ہوگی؟ اسی کی تلاش پر یہ تحقیق مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے محدود علم کے مطابق اختصار کے ساتھ پہلے قمری تاریخوں کا اور بعد میں عیسوی تاریخوں کا جائزہ پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں تاکہ ہر تاریخ کی اپنی انفرادی حیثیت معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں تک درست ہے۔

سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ ۳۰۰ھ کے بعد جو بھی سیرت کی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں آپ کی تاریخ ولادت ۱۲ ربیع الاول کے علاوہ کچھ دوسری تاریخیں بھی ساتھ میں نقل کی گئی ہیں اس طرح سے زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ اختلاف کی خندق بھی گہری ہوتی گئی ہے۔ محققین اپنی تحقیق کی بنا پر اپنی خود کی متعین کی ہوئی تاریخوں کا اضافہ کرتے رہے ہیں (خاص طور پر عیسوی تاریخوں میں) جس سے یہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ بعد کے مورخین و اہل سیر حضورؐ کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ آپؐ کی ولادت عام الفیل کے واقعہ سے ۱۵ سال قبل ہوئی۔ جبکہ دوسرے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپؐ کی ولادت اس واقعہ سے ۳۰ سال یا ۴۰ سال کے بعد ہوئی[1] یہاں تک کہ بعض مورخین کا یہ دعویٰ ہے کہ آپ کی ولادت اس واقعہ سے ۵۰ دن یا ۵۵ دن بعد ہوئی[1]

يشعيها برأيه ولذا قال فيه الشيخ احمد شاكر في تعليقه عليه عسند الامام

احمد انه حديث لا اصل له"[1]

علامہ زرقانی لکھتے ہیں :

(۱) "ان حدیث ابن عباس هذا غیر صحیح لان الترمذی قال فی تخریجه انه حسن

غریب لا یعرف الا من طریق یزید الفارسی عن ابن عباس و یزید هذا مجهول الحال

لا یصح الاعتماد علی حدیثه الذی انفرد به فی ترتیب القرآن .

(۲) انه علی فرض صحته یجوز ان جواب عثمان لابن عباس کان قبل ان یعلم بالتوقیف

ثم علمه بعد ذلک"[2]

علامہ طیبی حضرت ابن عباس کے سوال کی توجیہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

" قال الطیبی توجیه السوال ان الانفال لیست من السبع الطوال لتصریا

عن المائین لانها سبع و سبعون آیة ولیست غیریا لعدم الفصل بینها و بین

براءة فاجاب عثمانؓ بما یشبه کل ما وجده فعلم من جوابه ان الانفال والبرأة

نزلنا منزلة سورة واحدة و کملت السبع الطوال لها "[3]

دوسرا قول جو ابن عطیہ کا ہے اس کا جواب مناع قطان اس طرح دیتے ہیں ۔

" الذی یری ان بعض السور ترتیبها توقیفی و بعضها ترتیبه اجتهادی فان ادلته

ترتکن علی ذکر النصوص الدالة علی ماهو توقیفی . اما القسم الاجتهادی فانه لا یستند

الی دلیل یدل علی ان ترتیبه اجتهادی"[4]

امام بیہقی جن کی طرف علامہ سیوطیؒ کا بھی میلان ہے علامہ آلوسیؒ ان کا جواب یہ دیتے ہیں :

" ذهب البیهقی الی ان جمیع السور ترتیبها توقیفی الا براءة والانفال وله انشرح

صدر الامام السیوطی لما ضاق ذرعا عن الجواب . والذی ینشرح له صدر هذا الفقیر هو ما

انشرحت له صدور الجمع الغفیر من ان ما بین اللوحین الآن موافق لما فی اللوح من

باقی نمبر ۳ پر

---

[1] مباحث فی علوم القرآن مناع قطان ص ۱۴۴ [2] مناہل العرفان فی علوم القرآن

[3] حاشیہ ترمذی ص ۱۳۴ [4] مباحث فی علوم القرآن مناع القطان .

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت کا تحقیقی جائزہ

(شہاب الدین انصاری ایم۔ اے)

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ (یونس: ۵)

دراصل یہ موضوع ایسا ہے جو بہت پیچیدہ ہے۔ محققین اور مورخین نے عام طور پر قمری اور خاص طور پر عیسوی تقویموں کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی مختلف تاریخوں کا تعین کیا ہے، جس سے یہ پتہ لگانا کہ کون سی تاریخ صحیح ہے اور کون سی نہیں، مشکل کام ہے۔ پہلے امر ہے کہ اتنی تاریخوں میں سے سبھی تاریخیں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ پھر وہ کون سی ایسی تاریخ ہو گی جو صحیح ہو گی؟ اسی کی تلاش پر یہ تحقیق مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے محدود علم کے مطابق اختصار کے ساتھ پہلے قمری تاریخوں کا اور بعد میں عیسوی تاریخوں کا جائزہ پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں تاکہ ہر تاریخ کی اپنی انفرادی حیثیت معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں تک درست ہے۔

سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ ۳۰۰ھ کے بعد جو بھی سیرت کی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں آپ کی تاریخ ولادت ۱۲ ربیع الاول کے علاوہ کچھ دوسری تاریخیں بھی ساتھ میں نقل کی گئی ہیں اس طرح سے زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ اختلاف کی خندق بھی گہری ہوتی گئی ہے۔ محققین اپنی تحقیق کی بنا پر اپنی خود کی متعین کی ہوئی تاریخوں کا اضافہ کرتے رہے ہیں (خاص طور پر عیسوی تاریخوں میں) جس سے یہ مسئلہ بہت زیادہ ہی پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ بعد کے مورخین و اہل سیر حضورؐ کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ آپؐ کی ولادت عام الفیل کے واقعہ سے ۱۵ سال قبل ہوئی۔ جبکہ دوسرے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپؐ کی ولادت اس واقعہ سے ۳۰ سال یا [illegible] سال کے بعد ہوئی[1] یہاں تک کہ بعض مورخین کا یہ دعویٰ ہے کہ آپؐ کی ولادت اس واقعہ سے ۵۰ دن یا ۵۵ دن بعد ہوئی[2]

لیکن بقول ابن قتیبہ سب لوگوں کا سرکار دوعالم کے عام الفیل کے سال متولد ہونے پر اجماع و اتفاق ہے [۳]

جہاں تک ماہ ولادت کا سوال ہے، مورخین اس میں بھی متفق علیہ نہیں ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ آپ کی ولادت محرم کے مہینہ میں ہوئی، بعض کا کہنا ہے کہ صفر کے مہینہ میں، جبکہ اور دوسرے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کی ولادت رجب یا رمضان کے مہینہ میں ہوئی پھر بھی اکثر مورخین و اہل سیر کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آپؐ کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں ہوئی [۴]

جہاں مورخین آپؐ کی ولادت کے سال اور مہینہ میں اختلاف رکھتے ہیں وہیں وہ تاریخ اور دن میں بھی اختلاف کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ مورخین کا دعویٰ ہے کہ آپؐ کی ولادت ۳ ربیع الاول کو ہوئی جبکہ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول کی آٹھویں کو افق بطن آمنہ سے طلوع ہوئے [۶] جبکہ کچھ دوسرے محققین و مورخین کا دعویٰ ہے کہ آپؐ کی ولادت ۹ یا دس ربیع الاول کو ہوئی [۷] اس کے علاوہ شیعہ مورخین کی یہ رائے ہے کہ آپ کی ولادت ۱۷ ربیع الاول کو ہوئی [۸]

ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی؟ اس بات میں اختلاف ہے، لیکن ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ ۱۲ ربیع الاول کو پیدا ہوئے تھے، اس کی تصریح محمد بن اسحاق نے کی ہے۔ اور جمہور اہل علم میں یہی تاریخ مشہور ہے۔ [۹]

جس طرح آپ کی پیدائش کے سال، مہینہ اور تاریخ میں اختلاف ہے۔ اسی طرح سے آپ کے یوم پیدائش کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ شیعہ محدثین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ آنحضرتؐ بروز جمعہ پیدا ہوئے [۱۰] جبکہ اہل سنت کے مطابق آپؐ کی ولادت بروز دوشنبہ ہوئی ہے [۱۱] جو مستند روایات سے ثابت ہے۔

ان سارے اختلافات کے باوجود محدثین اور مورخین کا اس بات پر قریب قریب اجماع اور اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی پیدائش ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ ولادت دوشنبہ کے دن ہوئی تھی، یہ بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کے سوال پر بیان فرمائی ہے (صحیح مسلم بروایت قتادہ) ۲ے

ان سارے اختلافات کے باوجود اکثر مورخین و محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آپؐ کی ولادت عام الفیل کے سال میں ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ کو ہوئی۔ لیکن عام الفیل کا واقعہ کس سال میں ہوا، اس کے متعلق قرون اولیٰ کے اہل سیر خاموش ہیں، جبکہ بعد کے اہل سیر و مورخین نے اس کا تعین کیا ہے۔

عام الفیل کے واقعہ کا صحیح سال نہ معلوم ہونا ہی سارے اختلافات کا سبب ہے۔ کیونکہ ساری احادیث نبوی ۱۰۰ھ کے بعد میں ہی جمع کی گئیں اور بعد میں ان ہی احادیث سے سیرت کی اولین کتب مرتب کی گئی ہیں۔

قرون اولیٰ کے اہل سیر جنھوں نے حضورؐ کی سب سے پہلے سیر مرتب کی ہیں وہ ہیں موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ)، محمد ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ)، ابن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ) ابن ہشام عبدالملک (م ۲۱۳ھ) محمد ابن سعد (م ۲۳۰ھ) اور ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) امام زہری اور موسیٰ ابن عقبہ کے علاوہ باقی سبھی اہل سیر کا ریکارڈ موجود ہے ۳ے

ان کے علاوہ بعد میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے متاخر ہیں اور واقعات انہیں کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ ان سبھی اہل سیر نے حضورؐ کی پیدائش سال عام الفیل میں ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ نقل کی ہے جو مستند روایات پر مبنی ہے، اس کے علاوہ قرون اولیٰ کے بعد جو بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں حضور کی تاریخ ولادت کا اختلاف بڑھ کر گہرا ہوتا نظر آتا ہے۔ اہل سیر نے مختلف تاریخیں نقل کی ہیں، جن کی روایات اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ محدثین اور محققین نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔

رہی بات کہ تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں اتنا اختلاف کیوں پیدا ہو گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں عرب میں کوئی معقول تقویم رائج نہ تھی۔ وہاں پر دنوں اور سالوں کا شمار (LUNISOLAR CALENDAR) کے مطابق کرتے تھے اور قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لئے موٹے طور پر تین سال میں ایک زائد مہینہ کا اضافہ کرتے تھے اور

[illegible] میں نقل کیا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ محمود پاشا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت جو مشہور اور صحیح روایات پر مبنی ہے اسے ہٹ کر ۹ ربیع الاول کا تعین کیوں اور کیسے کیا اور وہ [illegible] حد تک صحیح ہے؟

[illegible] علماء کا اتفاق ہے کہ آپ نے [illegible]

[illegible] محمود پاشا نے حضورؐ کی تاریخ ولادت [illegible]

[illegible] ۶۳ سال انہوں نے قمری سال کے مطابق [illegible]

[illegible] تقویم [illegible] ہوئی۔ اس سے قبل اہل عرب [illegible]

[illegible] تھی

[illegible] ہوئی اور بعد میں اس کو صلاح و مشورہ سے [illegible]

[illegible] حضورؐ [illegible] سال کی عمر کے بارے میں جو احادیث ہیں [illegible] کے مطابق ہی ہیں، نہ کہ ہجری تقویم کے مطابق۔ لیکن محمود [illegible] کے مطابق ہی ۶۳ سال مان کر آپؐ کی ولادت کا سال [illegible] ہے، جو ان کی بنیادی غلطی ہے جس سے ان کو سوموار کا دن ۱۲ ار [illegible] اور انہیں سوموار ۹ ربیع الاول کا تعین ۵۳ ہجری قبل کرنا پڑا۔

[illegible] انہوں نے حضورؐ کی عمر رائج تقویمی نظام کو مدنظر رکھ کر ۶۳ سال مانی ہوتی اور [illegible] ایک سال پیچھے، یعنی ۵۴ ہجری قبل میں تقویم دیکھتے یا حساب لگاتے تو ان کو یقینی [illegible] پر ۱۲ ربیع الاول، یا اس کے آس پاس، دوشنبہ کا دن مل جاتا۔

چونکہ ۵۴ ہجری قبل کا سال عالمی تقویم کے مطابق یکشنبہ (اتوار) سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اس تقویم کے مطابق ۱۳ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن آتا ہے۔ جیسا کہ حضورؐ کی ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن آتا ہے۔ جیسا کہ حضورؐ کی ولادت مکۃ المکرمہ کی مقامی رویت ہلال کے مطابق ہے۔ اس لئے عالمی قمری تقویم کی تاریخ میں ایک دن کا تفاوت کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ چاند کی تاریخ ایک مقام سے دوسرے مقام کی تاریخ سے ایک آدھ دن آگے

س طرح سے ...ری اور شمسی سال کی مطابقت قائم رکھتے تھے۔ لیکن عام طور پر لوگ سالوں کی گنتی کا حساب
ی اہم واقعہ کو بنیاد بنا کر ہی کیا کرتے تھے [14]۔ جیساکہ زہری اور شعبی سے مروی ہے کہ خانہ کعبہ کی
بنا سے پہلے بنی اسماعیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ سے تاریخ
احساب کرتے تھے۔ پھر جب اسماعیل اور ابراہیم علیہما السلام نے کعبہ کو بنایا تو بنی اسماعیل تعمیر
عبہ سے تاریخ کا حساب کرنے لگے۔ البتہ جب یہ لوگ ادھر ادھر منتشر ہونے لگے تو جو قبیلہ تہامہ
سے باہر ہو جاتا تھا وہ اپنی اس علیحدگی سے تاریخ کا حساب کرتا تھا اور بنی اسماعیل میں سے جو
وگ تہامہ میں رہ جاتے تھے وہ سعد ہند اور جُہَینَہ بنی زید کے تہامہ سے خروج کے دن سے
اریخ کا حساب لگاتے۔ یہ طریقہ کعب بن لوی کی موت تک جاری رہا۔ اس کے بعد پھر بنی اسمٰعیل
نے واقعہ فیل تک کعب کی موت سے تاریخ مقرر کی۔ واقعہ فیل کے بعد اس سے تاریخ کا شمار
ونے لگا۔ یہ طریقہ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک جاری رہا، پھر انہوں نے ۱۷ھ میں واقعہ
جرت سے تاریخ مقرر کی (تاریخ طبری) [15]

ہجری تقویم کے رائج ہونے کے صدیوں بعد سیرت نگاروں مورخین و محققین نے اپنے
سائل کے مطابق اپنے تئیں حضورؐ کی پیدائش سے لیکر اس وقت تک کے وقفہ کو ہجری تقویم
ے مطابق پورا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اور حضورؐ کی پیدائش کا سال ہجری تقویم کے مطابق تعین
نے کی سعی کی۔ اس کوشش کے ذیل میں کچھ اور ضعیف اور غیر مستند روایات کو شامل کرنے
ے یہ اختلاف پیدا ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ کے ولادت کی صحیح تاریخ بھی مشکوک ہوگئی
ر یہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا کہ کون سی تاریخ صحیح ہے اور کون سی نہیں۔

چونکہ یہ ایک مختصر مضمون ہے اس لئے یہاں پر ہر ایک تاریخ کا الگ الگ تجزیہ
(ANALYSI کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہاں پر ہم نے صرف ایک تاریخ ۹ ربیع الاول
انتخاب کیا ہے، جس کا تعین محمود پاشا فلکی، جو فلکیات کے ایک مصری عالم تھے، نے کیا ہے
راس تاریخ کی بنیاد پر انہوں نے اس کے مطابق عیسوی تاریخ کا بھی تعین کیا ہے[16]۔ ان کی
تحقیق کی بنیاد پر بعد کے بیشتر اہل سیر اور مورخین نے اس تاریخ کو اکثر اپنی سیرت و تاریخ

---

۲۰ اپریل ۵۷۱ء قدیم عیسوی کے مطابق اور ۲۲ اپریل ۵۷۱ء جدید عیسوی تقویم کے مطابق۔

کو الگ الگ میں نقل کیا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ محمود پاشا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت، جو مشہور اور صحیح روایات پر مبنی ہے، اسے ہٹ کر ۹ ربیع الاول کا تعین کیوں اور کیسے کیا اور وہ کہاں تک صحیح ہے؟

جیسا کہ مستند اور صحیح روایات سے ثابت ہے اور محدثین و اہل علم کا اتفاق ہے کہ آپ نے ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی ۱۱ھ اس میں شک نہیں کہ محمود پاشا نے حضورؐ کی تاریخ ولادت کا تعین ۶۳ سال کے مطابق ہی کیا ہے۔ لیکن یہ ۶۳ سال انہوں نے قمری سال کے مطابق لئے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہجری تقویم ۱۷ھ سے رائج ہوئی۔ اس سے قبل اہل عرب قمری سال کو شمسی سال کے مطابق رکھنے کی مطابقت قائم رہتی تھی۔

چونکہ ہجری تقویم سرکاری طور پر ۱۷ھ میں رائج ہوئی اور بعد میں اس کو صلاح و مشورہ سے ہجرت کے سال سے شروع کیا گیا۔ اس لئے حضورؐ کی ۶۳ سال کی عمر کے بارے میں جو احادیث ہیں وہ یقیناً اس وقت رائج تقویمی نظام کے مطابق ہی ہیں، نہ کہ ہجری تقویم کے مطابق۔ لیکن محمود پاشا فلکی نے حضورؐ کی عمر ہجری سال کے مطابق ہی ۶۳ سال مان کر آپؐ کی ولادت کا سال ۵۳ ہجری قبل میں تعین کیا ہے، جو ان کی بنیادی غلطی ہے جس سے ان کو سوموار کا دن ۱۲ ربیع الاول کو نہ مل سکا اور انہیں سوموار ۹ ربیع الاول کا تعین ۵۳ ہجری قبل کرنا پڑا۔

اگر انہوں نے حضورؐ کی عمر رائج تقویمی نظام کو مدنظر رکھ کر ۶۳ سال مانی ہوتی اور وہ۔۔۔ ایک سال پیچھے، یعنی ۵۴ ہجری قبل میں تقویم دیکھتے یا حساب لگاتے تو ان کو یقینی طور پر ۱۲ ربیع الاول یا اس کے آس پاس، دوشنبہ کا دن مل جاتا۔

چونکہ ۵۴ ہجری قبل کا سال عالمی تقویم کے مطابق یکشنبہ (اتوار) سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اس تقویم کے مطابق ۱۳ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن آتا ہے۔ جیسا کہ حضورؐ کی ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن آتا ہے۔ جیسا کہ حضورؐ کی ولادت مکۃ المکرمہ کی مقامی رویت ہلال کے مطابق ہے۔ اس لئے عالمی قمری تقویم کی تاریخ میں ایک دن کا تفاوت کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ چاند کی تاریخ ایک مقام سے دوسرے مقام کی تاریخ سے ایک آدھ دن آگے

پیچھے ہو سکتی ہے۔ لیکن عالمی اسلامی تقویم کی تاریخ عیسوی تاریخ کی طرح ساری دنیا میں ایک ہی رہے گی۔ تاہم عالمی ہجری تقویم جس کا ۵۴ ہجری قبل کا سال یکشنبہ سے شروع ہوتا ہے اگر محرم اور صفر کے مہینے ۳۰، ۳۰ دنوں کے مان لئے جائیں، کیونکہ تقویم میں محرم ۳۰ دن کا اور صفر ۲۹ دن کا مانا گیا ہے، تو اس صورت میں ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کو ہی آتا ہے۔

اس طرح اس تاریخ کے بارے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ یقینی طور پر مقامی رویت ہلال کے مطابق ۱۲ ربیع الاول ۵۴ ہجری قبل میں بروز دوشنبہ کو ہی پڑا ہو گا جو مطابق ۵۷۰ء کے ہوتا ہے۔ اس طرح سے اگر حضورؐ کی ولادت ۵۴ ہجری قبل (۵۷۰ء) مان لی جائے تو حضورؐ کی وفات شمسی سال کے مطابق ۶۳ ویں سال میں، اور قمری سال کے مطابق پورے ۶۴ سال میں ہوتی ہے۔

محمود پاشا فلکی نے حضورؐ کی ولادت کا سال ۵۳ھ ہجری قبل کا تعین کیا ہے۔ یہ سال عالمی قمری (ہجری) تقویم کے مطابق جمعہ کے دن سے شروع ہوتا ہے اس طرح سے دوشنبہ کا دن ۸ ربیع الاول کو آتا ہے۔ پھر بھی اگر محرم اور صفر کے مہینوں کو ۲۹، ۲۹ دن کا مان لیا جائے تو ۹ ربیع الاول دوشنبہ ۵۳ ہجری قبل میں آ سکتا ہے، جو مطابق ۵۷۱ء کے ہوتا ہے اس طرح سے اگر یہ مان لیا جائے کہ حضورؐ کی ولادت ۹ ربیع الاول بروز دوشنبہ کو ہی ہوئی ہے تو محمود پاشا نے جو ۹ ربیع الاول کا ۵۳ ہجری قبل مطابق ۵۷۱ء کا تعین کیا ہے وہ ہجری تقویم کے مطابق درست ہے۔

لیکن جہاں تک سوال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ۹ ربیع الاول کو متولد ہونے کا تو اس سلسلہ میں قرون اولی کے اہل سیر اور مورخین کی کوئی مستند روایات نہیں ملتی ہیں، جبکہ ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ کے بارے میں مستند اور صحیح روایات موجود ہیں اور اس پر محدثین و علمار کرام کا اتفاق بھی ہے۔

عیسوی تقویم کی تاریخوں کا تجزیہ

جہاں ایک طرف حضورؐ کی ولادت کے سلسلہ میں قمری مہینہ کی تاریخوں کے مطابق مختلف اختلافی روایات موجود ہیں، وہیں دوسری طرف عیسوی تقویم کی تاریخوں میں بھی

بہت اختلاف ہے کچھ مستشرقین (ORIENTALISTS) اور کچھ دوسرے اہل علم نے اپنی تحقیقات کی بناء پر مختلف تاریخوں کا تعین کیا ہے، جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس ذیل میں ان کا بھی ایک اجمالی احاطہ کیا جائے۔ اور ہر ایک تاریخ کے بارے میں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جائے، جس سے ان عیسوی تاریخوں کی صحیح حیثیت کا جائزہ لیا جا سکے۔

اس سلسلہ میں اہل علم جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت عیسوی تقویم کے مطابق متعین کی ہے، وہ ہیں ایم کوسین ڈی پرسیول (M. CAUSSIN DE PERCEVAL) انہوں نے ۲۰ اگست ۵۷۰ء [۱۷]، ڈاکٹر گستاولی بان (DR. G. LE BON) نے ۲۷ اگست ۵۷۰ء [۱۸] محمود پاشا فلکی اور (DR. ALOYS SPRENGER) نے ۲۰ اپریل ۵۷۱ء [۱۹] ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ۱۷ جون ۵۶۹ء [۲۰]، حبیب الرحمن خان نے ۹ دسمبر ۵۶۹ء [۲۱] اور شیعہ مورخین نے ۹ مئی ۵۷۰ء کا تعین کیا ہے۔

ان عیسوی تاریخوں کا تجزیہ (ANALYSIS) کرنے اور ہجری تاریخوں میں بدلنے پر معلوم ہوا کہ ۲۰ اگست ۵۷۰ء (جو جدید عیسوی تقویم کے مطابق ہے) مطابق دوشنبہ ۲۹ جمادی الثانی ۵۴ ہجری قبل ہے۔

اس طرح سے ۲۷ اگست ۵۷۰ء (جو جدید عیسوی تقویم کے مطابق ہے) مطابق دوشنبہ ۸ ربیع الاول ۵۳ ہجری قبل ہے۔ (اگر محرم اور صفر کے مہینوں کو ۲۹، ۲۹ دنوں کا مان لیا جائے تو یہ تاریخ ۹ ربیع الاول ہو سکتی ہے اور اس سے عیسوی تاریخ میں کوئی فرق نہ آئے گا ۲۷ اگست ۵۷۰ء ہی رہے گی)

۱۷ جون ۵۶۹ء (جو قدیم عیسوی تاریخ کے مطابق ہے) مطابق دوشنبہ ۱۵ ربیع الثانی ۵۵ ہجری قبل ہے۔

۹ دسمبر ۵۶۹ء (جو قدیم عیسوی تاریخ کے مطابق ہے) مطابق دوشنبہ ۳ شوال ۵۵ ہجری قبل ہے۔

اور اسی طرح ۹ مئی ۵۷۰ء (جو قدیم عیسوی تقویم کے مطابق ہے) مطابق جمعہ ۱۷ ر

ربیع الاول ۴ ۵ ہجری قبل ہوتی ہے۔

ان مندرجہ بالا عیسوی تاریخوں کا تجزیہ کرنے اور انہیں ہجری تقویم کی تاریخوں میں بادلے (CONVERT) کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی تاریخ عین ۱۲ ربیع الاول کے مطابق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ صرف دو تاریخوں کو چھوڑ کر باقی تاریخیں ربیع الاول کے مہینہ میں بھی نہیں پڑتی ہیں۔ تاریخ کے علاوہ سال ولادت میں بھی تفاوت ہے۔

کیونکہ DR. G. LE BON (M. CAUSSIN DE PERCEVAL) اور شیعہ مورخین نے سال ولادت ۵۷۰ء کا تعین کیا ہے، جو مطابق ۵۴ ہجری قبل ہے۔

محمود پاشا فلکی اور DR. ALOYS SPRENGER نے سال ولادت ۵۷۱ء کا تعین کیا ہے جو مطابق ۵۳ ہجری قبل ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور حبیب الرحمٰن خان نے سال ولادت ۵۶۹ء کا تعین کیا ہے، جو مطابق ۵۵ ہجری قبل ہوتا ہے۔

اس طرح سے اہل تحقیق تاریخ کے علاوہ سال میں بھی اتفاق نہیں کرتے ہیں اور سال ولادت کا الگ الگ تعین کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ تاریخ اور سیرت کی اولین کتابوں میں واضح طور پر یہ نہیں ملتا ہے کہ آپ کی ولادت تقویم کے اعتبار سے کس سال میں ہوئی، بلکہ یہ ہے کہ آپ کی ولادت عام الفیل کے سال میں ہوئی ہے۔ اب عام الفیل کا واقعہ کس سال میں ہوا؟ اس کا تعین مختلف محققین نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق کیا ہے جس سے سال ولادت میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ (جاری)

حوالاجات

۱؎ P. 48. MUHAMMAD HUSAYN HAYKAL "THE LIFE OF MUHAMMAD"

۲؎ بقول دمیاتی ۵۵ دن، اور بقول شہیلی ۵۰ دن۔ جسے شاہ اشرف علی تھانوی نے "نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب" میں صفحہ ۲۳ پر نقل کیا ہے۔

۶ مترجم علامہ محمد اشرف سیالوی، سیرت سید الانبیاء، دہلی ۱۹۸۳ء، ص۱۲۱ (فوٹ نوٹ)

۷ MOHAMMAD HUSAYN HAYKAL "THE LIFE OF MUHAMMAD" P. 48

۸ ایضاً ص۴۸

۹ سیرت سید الانبیاء، ص۱۱۸، بقول حضرت براء جسے امام عبدالرحمٰن ابن جوزی نے نقل کیا ہے "الوفا باحوال المصطفیٰ"

۵ MOHAMMAD HUSAYN HAYKAL, "THE LIFE OF MUHAMMAD" P. 48

۸ "پیغمبر اسلام کی ولادت"، رسالہ راہ اسلام شمارہ ۵۸ جمادی الاول ۱۴۰۳ھ، صفحہ ۷۔

۹ سید ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور عالم، جلد دوم، ص۹۴

۱۰ پیغمبر اسلام کی ولادت، رسالہ راہ اسلام، شمارہ ۵۸ جمادی الاول ۱۴۰۳ھ صفحہ ۹۔

۱۱ سیرت ابن ہشام جلد اول مترجم مولانا عبدالجلیل صدیقی (دہلی ۱۹۸۲ء) ص۱۸۲

۱۲ سرور عالم، جلد دوم، ص۹۴

۱۳ THOMAS PATRICK HUGHES, "DICTIONARY OF ISLAM", (N. DELHI-1983) P. 42

۱۴ القرآن مترجم علامہ یوسف علی (انگریزی) فوٹ نوٹ نمبر ۱۲۹، صفحہ ۴۵

۱۵ ابو جعفر محمد ابن جریر طبری، تاریخ طبری جلد اول (اردو) ص۱۴۰

۱۶ سیرت سید الانبیاء ص۸۱۸،۸۱۹

۱۷ سیرت سرور عالم جلد دوم ص۹۴ اور

THOMAS PATRICK HUGHES "DICTIONARY OF ISLAM" (N-DELHI-1982) P. 368

۱۸ G. LE BON "CIVILISATION DES ARABES" URDU TR.

"TAMADDUNE ARAB" (تمدن عرب) (HYDERABAD, 1936) P. 91,

۱۹ علامہ شبلی نعمانی "سیرت النبی" جلد اول، ص۱۰۰؛ DICTIONARY OF ISLAM P. 368

۲۰ DR. MOHAMMAD HAMIDULLAH "MUHAMMAD RASULALLAH" (SAW)

(HYDERABAD. 1974) P. 4

۲۱ حبیب الرحمٰن خان "مفتاح التقویم" (نئی دہلی) ص۵۵ (فوٹ نوٹ)

مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور انکا تدارک

سلطانہ حیات B ۲/۲ ریور بنک کالونی۔ لکھنؤ

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کا وقار بحیثیت ملت دن بدن
گھٹتا جا رہا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے بے گھر اور وطن سے بے وطن
آسان بنتا جا رہا ہے۔ ان کا قتل عام، عام ہو چکا ہے۔ اور جس طاقت کا جی چاہتا ہے
ر پیٹ لیتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں اب اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ مؤثر
یقہ پر اپنی یا ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ دیگر طاقتوں کے علاوہ ہم خود بھی آپس میں
ر اپنی طاقت کو ختم کر رہے ہیں۔ مختصر یہ مسلمانانِ عالم ایک بکھری ہوئی بے اثر اکائی بن
ہیں۔ جس کی وجہ سے دنیا میں ان کا خون ارزاں ہوتا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کو اس افسوسناک حالت کا پوری طرح احساس ہے اپنی حالت
بدلنے کے لئے مختلف ممالک میں مختلف کام بھی کئے گئے ہیں۔ جو اچھے ہیں لیکن مسلم اہل
ش محسوس کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ایسی کشتی پر سوار ہیں جس کی پتواریں ہمارے ہاتھوں
ں نہیں ہیں۔ وقت کا دھارا ہمیں تیزی کے ساتھ بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔ ڈر ہے کہ نامعلوم
ں اور کہاں یہ بے پتوار کی کشتی کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائے۔

اس ادبار کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانانِ عالم موجودہ زمانے سے صدیوں پیچھے ہونے کی وجہ سے
ری کے ساتھ زوال پذیر ہیں۔ دوسری طرف ایٹمی دور اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ آ رہا ہے
مانہ کے ساتھ تجارت، صنعت۔ بنکوں کا لین دین۔ مالیات کا پورا نظام وغیرہ تیزی
ے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ ڈر ہے کہ دنیا اتنی آگے نہ نکل جائے کہ مسلمان اس کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔
دنیا کا اصول ہے کہ جو زمانہ کے ساتھ نہیں چل سکے گا۔ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر جئے
اور اس کی اپنی کشتی کی پتواریں دوسروں کے ہاتھ میں رہیں گی۔

اس جدید دور میں صرف وہی قومیں برسر اقتدار آئیں گی اور باعزت زندگی بسر کر سکیں گی

جن میں جدید دور اور اس کے تانے بانے کو سمجھنے کی اہلیت ہوگی۔ جن میں اتنی قابلیت ہوگی کہ وہ جدید ترین علوم و فنون حاصل کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی صحتیں اچھی ہونگی۔ بغیر اچھی صحت کے اعلیٰ دماغی کام نہیں ہو سکتا ہے۔ جن کے گھر اور زندگی منظم ہوگی۔ بغیر تنظیم کے کام کرنے کا وقت نہیں مل سکتا ہے۔ جب ہی وہ اپنے بچوں کو آنے والی دنیا میں چھاؤ با عزت طریقے جینے کے قابل بنا سکیں گی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ دنیا کی باگ ڈور ہمیشہ کی طرح اپنے زمانہ کی ہوشمند قوموں کے ہاتھ میں رہے گی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی دنیا میں مادی ترقی کا نیا راستہ کھلتا ہے تو پسماندہ قوموں کو آگے بڑھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم مسلمانوں میں اتنی اہلیت ہے کہ ہم اس مادی ترقی یا تہذیبی موڑ سے جو ایٹمی طاقتوں کی دریافت کی وجہ سے آ رہا ہے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اور کیا مختلف ممالک میں رہنے اور اپنے اپنے وطنوں سے خلوص کے ساتھ محبت کرنے کے باوجود بھی ایک مضبوط اکائی بن سکتے ہیں؟۔

قرآن پاک میں خالق کائنات فرماتا ہے کہ :

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللہ" (سورۃ ال عمران : ۱۱۰)

ترجمہ :- اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

یہ کتنی قابل فخر بات ہے کہ اللہ پاک نے امت محمدی کو بہترین گروہ قرار دے دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اگر ہم عقل و ہوش سے کام لیکر اللہ پاک کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلیں گے تو وہ اپنی رحمت سے ہمیں بہترین گروہ بنا دے گا۔ زندگی بسر کرنے کا راستہ قرآن پاک سے ملتا ہے۔ وہی مسلمانوں کا اثاثہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اور انہیں ہدایتوں پر چل کر رسول اکرم نے صرف ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں زمانے اور وقت کے دھارے کو موڑ دیا تھا۔ وہی ہدایت آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے باوجود پوری امت ادبار کا شکار ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم قرآن کو ٹھیک طرح سمجھ نہیں رہے ہیں۔

ورنہ جس کی راہ نمائی قرآن کرے وہ نعمات کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہ سکتا کیونکہ قرآن بدلیل خالق کائنات ہے۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب

ہر زوال کی سینکڑوں وجوہ ہوتی ہیں اور مسلمانوں نے قرآن کو سمجھنے اور برتنے میں چند بنیادی غلطیاں کی ہیں۔ ان میں سے خاص غلطیاں یہ ہیں۔

۱۔ ہم نے قرآن پاک کو صرف ایک برکت کی چیز سمجھ لیا ہے۔ اور یہ بھول گئے کہ اللہ پاک کے فرمان کے بموجب قرآن حکیم رہتی دنیا تک کے لئے ہدایت ہے۔ ظاہر ہے کہ مادی دنیا ترقی کرے گی۔ اور اس کے ساتھ انسانوں کی سمجھ اور عقل نیز ضرورتوں کی نوعیت اور معیار بدلے گا۔ اس حقیقت سے خالق کائنات سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے؟ اس نے قرآن حکیم میں وہ عبارت اور الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن کو بدلے بغیر ہر زمانہ میں اس دور کے علوم کی مدد سے زیادہ گہرائی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن کے معنی کو اپنے دور کے لحاظ سے سمجھنا اس لئے ضروری ہے۔ کہ انسان کی ساخت ایسی بنائی گئی ہے کہ اسکو یقین کامل دلائل اور حقائق کی روشنی میں ہی حاصل ہوتا ہے ہم نے قرآن پاک کو ہر دور کے لحاظ سے سمجھا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی زندگی کے خدوخال باقی رہ گئے۔ اور اسلامی روح غائب ہو گئی۔ جو کہ اسلامی احکام کو اپنے دور کے لحاظ سے سمجھنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

گذشتہ ۹۔ ۱۰ صدیوں سے (مسلمان اپنی نسلوں کو ورثہ میں اسلامی روح کے بجائے اپنے ملک کی روایات دیتے رہے ہیں)۔ نتیجہ میں ہم روایات کے حامل ہیں اور اسلامی روح سے بیگانہ ہیں۔ اور یہی ہمارے زوال کی خاص وجہ ہے۔

۲۔ زندگی کا حسن توازن۔ اسلامی معاشرے کی جان زندگی بسر کرنے کا حسن توازن ہے ہم کچھ احکام کو بجا لانے میں حد سے تجاوز کر گئے۔ جس کی وجہ سے توازن بگڑ گیا۔ مثلاً عورتوں کیساتھ پردے کے متعلق احکام میں اتنی زیادہ سختی برتی کہ وہ علوم وفنون سے محروم ہو گئیں۔ ان کی دنیا جب چار دیواری تک محدود ہو گئی تو ان کو اپنی عقل و سمجھ کو جلا دینے کا

موقع نہیں ملا۔ دنیا اور اس کی ترقیوں سے بے خبر ہو کر وہ دنیا کے معیار سمجھ اور عقل سے پیچھے رہ گئیں۔ اور اب ہم عورتیں واقعی ناقص العقل ہیں اور ناقص العقل اولاد پیدا کر رہی ہیں کیونکہ بچہ کی صحت اور تربیت اس کی پیدائش سے پہلے ہی بننا شروع ہو جاتی ہے اور بہترین وقت ۴۔۵ سال کی عمر تک رہتا ہے اور اسی عمر میں ہی اس کو اپنی ماں اور بہنوں کی صحبت اور تربیت ملتی ہے اور تربیت جدید دور سے صدیوں پیچھے ہے۔ ہم نے ہوائی جہاز، موٹر اور دیگر مشینوں کا استعمال تو سیکھ لیا ہے۔ مگر ہمارے دماغ جدید طرز فکر سے ناآشنا ہیں۔ ہم میں ابھی وہ سوجھ بوجھ وغیرہ پیدا نہیں ہوئی ہے۔ جس کی اس دور میں ضرورت ہے۔ یا جس سے ریگستانوں کو گلزار بنایا جا سکتا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں زرزمین۔ اور ذرائع پیداوار کے مالک ہونے کے باوجود دنیا کی محفل میں بے اثر ہیں اور رسنا ہے کہ ہر مسلم ملک میں آج تک نچلے طبقہ میں غربت تکلیف دہ حد تک باقی ہے۔

۲۔ تعلیم:

مسلمانوں میں عام طور پر دو طرح کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ایک تو مذہبی تعلیم جس کی انتہا ایک مدت تک درس نظامیہ کی تکمیل تک تھی۔ دوسرے جدید تعلیم! ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جدید علوم مثلاً سائیکالوجی وغیرہ کی مدد سے قرآن کریم اور احادیث وغیرہ کا علم بھی بچوں کو دیا جاتا۔ مذہبی تعلیم دینے والے اداروں کا نصاب ایسا ہے کہ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جو طلبار نکلتے ہیں ان میں سے عموماً موجودہ کارزار حیات میں پچھلی صفوں میں بھی علمی لحاظ سے شامل ہونے کے قابل نہیں ہوتے۔ حالانکہ اسلام میں دنیا اور دین ایک ہی مانا گیا ہے۔ اور ہماری مروجہ تعلیم ایسی ہے کہ دنیا اور دینوی تعلیم میں کوئی تال میل نہیں ہے حالانکہ مسلمان کو اخلاق اور کردار صرف قرآن پاک ہی دے سکتا ہے۔

آبادی کے تناسب سے بہت سے ملکوں میں مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو کم ہی جدید مروجہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور جو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس پر بھی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ زمانہ کروٹ بدل رہا ہے ہم جس کو جدید طرز تعلیم کہتے ہیں وہ بھی

متمدن قوموں کے لحاظ سے فرسودہ نظام ہے۔ دنیا میں تمام ترقیوں کی کنجی جدید سے جدید تعلیم رہے گی۔ اور ہم مسلمانوں نے اس طرف ابھی زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔

۴۔ جدید دور سے بے نیازی؛

صدیوں پرانی تربیت پانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے۔ کہ عام اعلیٰ تعلیم یافتہ پڑھے لکھے مسلمان بھی جدید طرز فکر، اور موجودہ دور کے مسائل سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ مثلاً ایسے مسلمان شاید انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ جو سائنس کی مختلف شاخوں اعلیٰ اور بڑی صنعتوں، ملکوں کے آپس کے لین دین کے جدید نظام سے واقف ہوں۔ یا واقف ہونا چاہتے ہوں۔ چنانچہ دنیا کا بہت سا کاروبار ان کے سروں پر سے نکل جاتا ہے اور ان کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اور ستم یہ ہے کہ وہ ان مسائل پر سوچنا بھی نہیں چاہتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں طلباء پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے جو موضوع لیتے ہیں۔ وہ عموماً ماضی یا بہت ہوا تو حال سے متعلق ہوتا ہے۔ مستقبل کیا ہے۔ اس کے لئے کیا کرنا ہے۔ اس موضوع پر تو ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی کم ہی سوچتا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو ہر ہندوستان، ایران اور پاکستان وغیرہ کے اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری مسلم ملت مستقبل سے بے خبر ماضی میں جینا چاہتی ہے۔

۵۔ بے حسی؛

ایک بہت خطرناک رجحان مسلمانوں کے کھاتے پیتے اچھے مالی حالت والے طبقہ میں جو کہ اپنی حالت سے مطمئن ہیں یہ پیدا ہو رہا ہے کہ جس طرح سے وہ مطمئن ہیں۔ اس طرح پوری ملت محمدی آرام سے زندگی بسر کر رہی ہے۔ انکو معلوم ہی نہیں کہ مسلمانوں کے عروج کے معنی کیا ہوتے ہیں یہ بے حسی سوجھ بوجھ کی علامت کے ساتھ طاقت پرواز کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ اور اپنی اس حالت کو وہ توکل کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی توکل اور بے حسی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ بے حسی خواہ امیر طبقہ میں ہو یا غریب میں، کسی بھی ملت کے لئے کینسر سے زیادہ مہلک ہے

ہر ملت یا قوم کا پڑھا لکھا طبقہ اپنی پوری قوم کے لئے ہراول دستہ کا کام دیتا ہے۔ اس میں اگر بے حسی پیدا ہو گئی تو زندگی اور عمل کے کارزار میں ملت محمدی کی فوج پہنچ ہی نہیں پائے گی پھر دنیا کی دوڑ میں نتیجہ ظاہر ہے۔

مسلمان اب کیا کریں :

اس مختصر سی تمہید کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس صورت حال کو کیسے بدلا جائے۔ اس اہم مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا سارا عروج اسلام لانے۔ قرآن حکیم پر عمل کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اور مسلمانوں میں جب تک اللہ تعالیٰ کا وجود زندگی کا مرکز رہا۔ ان کی اخلاقی حالت کی بنیاد ٹھوس اور سچائی پر قائم رہی۔ اور مسلمان اپنی سچائی۔ اپنی لگن اور اپنی قابل بھروسہ شخصیت اور پرخلوص برتاؤ سے دل اور تلوار سے ملک ذہانت اور ذہنی یکسوئی سے علمی میدان سر کرتے رہے چنانچہ ۷ سو سال سے زیادہ عرصہ تک علمی میدان میں دنیا کی قیادت کرتے رہے۔ اس وقت ان کا ایمان تھا کہ ان کو اپنے ہر فعل اور اپنی نیت کا حساب اللہ پاک کو دینا ہو گا رفتہ رفتہ اللہ پاک کا وہ تصور جو قرآن میں لکھا ہے اور رسول اکرم نے بتایا تھا مدھم پڑتا گیا۔ ذات باری تعالیٰ کا وجود ہمارے دل و دماغ اور ہمارے کردار سے نکل گیا اور اب صرف خد و خال باقی رہ گئے۔ اس کا گلہ "شکوہ" میں علامہ اقبال نے کیا ہے ؎

گھر وہ اجڑا کہ تو رونق محفل نہ رہا

اور یہ سب اس وجہ سے ہوا۔ کہ ہم نے قرآن کریم کو صرف ایک برکت کی چیز سمجھ لیا۔ اور یہ بالکل بھلا دیا کہ یہ ہمارے لئے ایک ہدایت نامہ رہتی دنیا تک کے لئے ہے۔ ایسے لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمان ہیں جو ان گنت بار مکمل قرآن شریف پڑھ چکے ہیں۔ حافظ بھی ہیں۔ لیکن انہیں نہیں معلوم اس میں لکھا کیا ہے۔ اور جن مسلمانوں کو عربی آتی ہے یا جن کی مادری زبان عربی ہے۔ انھوں نے قرآن شریف کو جدید دور کی عینک سے نہیں پڑھا۔ وہ قرآن کریم کو کتنا سمجھتے ہیں اس کا کوئی ثبوت انھوں نے موجودہ دور میں نہیں دیا ہے۔ اگر وہ قرآن کریم کو واقعی سمجھ رہے ہوتے تو انہیں زمانے کا پیشوا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قرآن کریم کے احکام عین فطرت کے مطابق ہیں اور ہر

آنے والے دور میں ہمیشہ اپنی افادیت کو برقرار رکھیں گے۔ کیونکہ قرآن کی خوبی یہ ہے کہ وہ بنیادی حکم دیتا ہے اور دنیا کی سماجی، سائنس کلچر، مقام، حالات وغیرہ کی تبدیلی سے اس پہ اثر نہیں پڑتا۔ ہم نے ان احکام کو سمجھنا بند کر دیا ہے تو یہ ہمارا قصور ہے ہمارے ہدایت نامہ کا نہیں ہے قرآن شریف کو سمجھنے کے معنی کیا ہیں اور اس کا اثر کردار پر کیسے پڑتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے واضح کرنا مناسب ہوگا مثلاً قرآن پاک میں حکم ہے کہ:

"وافوالکیل اذا کلتم وزنو بالقسطاس المستقیم ذالک خیر و احسن تاویلا"

(سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۳۶)

ترجمہ: "پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو۔ اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے"۔

یعنی ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ مطلب یہ کہ معاہدے کے مطابق جس قدر رقم وصول کی جائے اس کے بقدر تول کر دیا جائے۔ دوکاندار کی بے ایمانی چاہے خریدار نہ پکڑے مگر اللہ پاک اس کی گرفت ضرور کرے گا۔ یہ حکم صرف ترکاری اور اناج فروخت کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر وقت اور ہر کام کے لئے ہے جس کی اجرت وصول کی جائے یا وعدہ کیا جائے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر کسی ایک شخص یا خاندان والوں یا طبقہ یا ایک قوم کے متعلق سب کو یقین ہو جائے کہ یہ لوگ جس کام کے لئے ملازم رکھے جائیں گے۔ ان کی نگرانی کی جائے یا نہ کی جائے اس کو پورا کریں گے۔ تو ایسے لوگوں کو ملازمت نہ صرف آسانی سے ملے گی۔ بلکہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملازم رکھا جائے۔

۵۔ اس لئے قرآن شریف کو پڑھنا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کو پورے طور پر زمانہ اور زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ کیونکہ قرآنی احکام ملکر کردار بناتے ہیں اب اگر ذات باری کے خوف اور اس کے رحم کی خصوصیات ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہوں گی تو ہم نہ ناپ تول میں کمی کر سکتے ہیں۔ اور نہ ذمہ داری نبھانے میں خلوص کی کمی ہوگی۔ اور جب خدمت خلوص ہوگی تو اس کا پھل بھی ملے گا۔ اسی طرح قرآن کریم کی سب ہدایتیں ایسی ہیں کہ جن پر عمل کرنے مسلمان تاریخ ساز بن گئے تھے اور آج بھی ان پر عمل کرنے سے پھر تاریخ ساز بن سکتے ہیں۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ اللہ پاک نے یہ دنیا سبب

ہے۔ جیسا کہ ہمارے ویسا کا ... یہ نہیں ہو سکتا کہ پڑھیں تو وہ اور بن جائیں۔ جبکہ دوسرا

! مذہبی تعلیم ضروری ہے۔ مگر اس کا نصاب از سرِ نو ترتیب دیا جائے۔ مثلاً ہمارے ائمہ نے

جانفشانی کے بعد اصول بنائے تھے کہ اگر کسی پانی میں کھجوریں ڈال دی جائیں تو وہ پانی کتنی دیر

قابل وضو رہتا ہے۔ اور اس اصول پر سیکڑوں صفحات میں بحث کی گئی ہے۔

ہندوستان وغیرہ میں پانی میں کھجوریں ڈالنے کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اور اب موجودہ دور میں تو ممکن ہی نہیں ہے۔ تو پھر اس ساری بحث کو یہاں کے طلباء کو یاد کرانے اور رٹانے سے کیا فائدہ؟

ہمیں زندگی کے ہر رخ پر سوچ سمجھ کر متوازن راستہ نکالنا ہے۔ ہمارا طرزِ معاشرت کسی دور میں بہت خوب تھا مگر آج وہ فرسودہ ہو گیا ہے اور اس میں وہ افادیت باقی نہیں رہی ہے جو کہ پہلے تھی۔ کیونکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ مثلاً کھانا جسم اور صحت بنانے کے بجائے لذت حاصل کرنے کے لئے کھایا جاتا ہے۔ ہم کھانا تو وہ کھاتے ہیں جو کہ ہمارے بزرگ کم از کم ۵ میل گھوڑے کی سواری کرنے کے بعد کھاتے تھے۔ وہی مرغن کھانا ہم کرسی پہ بیٹھے پلنگوں پر پڑے رہنے کے بعد کھاتے ہیں۔ نتیجہ میں صحتیں خراب ہوتی جا رہی ہیں، کمزور مائیں کمزور بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ تنظیم کی کمی کی وجہ سے نہ ہمارے گھر منظم ہیں نہ ہماری زندگی منظم ہے۔ وقت ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے اور ہم جو کام کرنا چاہتے ہیں عموماً نہیں کر پاتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے امتِ محمدیہ کا۔ اس خاکہ میں بہت سے جملے ایسے ہیں جو کہ پوری تفصیل کے طالب ہیں۔ اور تشریح چاہتے ہیں۔ اس وقت جاپان کی ایک خوبی یاد آ رہی ہے وہ یہ کہ وہ ساری دنیا سے مختلف ماہرین فنون کو بلاتے ہیں اور ان کو ان کے فن سے متعلق اپنی کارکردگی دکھا کر عاجزی سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو بتلایا جائے کہ وہ کیا کیا غلطیاں کر رہے ہیں! اور پھر اپنی خامیوں کو دور کرتے ہیں۔ یہی طریقہ ہے ترقی کا۔

میں بھی انتہائی عاجزی سے چاہتی ہوں کہ اس مضمون کے آئینہ میں ہر مسلمان مرد اور عورت پوری ملت کا جائزہ لے اور غلطیوں کی نشاندہی کرے تاکہ نئی راہ کا تعین کرنے سے پہلے ان سب باتوں کو بھی دھیان میں رکھا جائے۔

آنے والے دور میں ہمیشہ اپنی افادیت کو برقرار رکھیں گے۔ کیونکہ قرآن کی خوبی یہ ہے کہ وہ بنیادی حکم دیتا ہے اور دنیا کی سماجی، سائنس کلچر، مقام، حالات وغیرہ کی تبدیلی سے اس پر اثر نہیں پڑتا۔ ہم نے ان احکام کو سمجھنا بند کر دیا ہے تو یہ ہمارا قصور ہے ہمارے ہدایت نامہ کا نہیں ہے قرآن شریف کو سمجھنے کے معنی کیا ہیں اور اس کا اثر کردار پر کیسے پڑتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے واضح کرنا مناسب ہوگا مثلاً قرآن پاک میں حکم ہے کہ:

"واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم ذالک خیر واحسن تاویلا"

(سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۳۶)

ترجمہ: "پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو۔ اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔"

یعنی ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ مطلب یہ کہ معاہدے کے مطابق جس قدر رقم وصول کی جائے اس کے بقدر تول کر دیا جائے۔ دوکاندار کی بے ایمانی چاہے خریدار نہ پکڑے مگر اللہ پاک اس کی گرفت ضرور کرے گا۔ یہ حکم صرف ترکاری اور اناج فروخت کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر وقت اور ہر کام کے لئے ہے جس کی اجرت وصول کی جائے یا وعدہ کیا جائے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر کسی ایک شخص یا خاندان والوں یا طبقہ یا ایک قوم کے متعلق سب کو یقین ہو جائے کہ یہ لوگ جس کام کے لئے ملازم رکھے جائیں گے۔ ان کی نگرانی کی جائے یا نہ کی جائے اس کو پورا کریں گے۔ تو ایسے لوگوں کو ملازمت نہ صرف آسانی سے ملے گی۔ بلکہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملازم رکھا جائیگا۔

اس لئے قرآن شریف کو پڑھنا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کو پورے طور پر زمانہ اور زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ کیونکہ قرآنی احکام ملکر کردار بناتے ہیں اب اگر ذات باری کے خوف اور اس کے رحم کی خصوصیات ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہوں گی تو ہم نہ ناپ تول میں کمی کر سکتے ہیں، اور نہ ذمہ داری نبھانے میں خلوص کی کمی ہوگی۔ اور جب خدمت خلوص سے ہوگی تو اس کا پھل بھی ملے گا۔ اسی طرح قرآن کریم کی سب ہدایتیں ایسی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مسلمان تاریخ ساز بن گئے تھے اور آج بھی ان پر عمل کرنے سے پھر تاریخ ساز بن سکتے ہیں۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ اللہ پاک نے یہ دنیا مسبب الاسباب

بھائی ہے۔ جیسا بوئیں گے ویسا کاٹیں گے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پڑھیں تو فقہ اور بن جائیں انجینئر اور ڈاکٹر! مذہبی تعلیم ضروری ہے۔ مگر اس کا نصاب از سرِ نو ترتیب دیا جائے۔ مثلاً ہمارے ائمہ نے بڑی جانفشانی کے بعد اصول بنائے تھے کہ اگر کسی پانی میں کھجوریں ڈال دی جائیں تو وہ پانی کتنی دیر تک قابلِ وضو رہتا ہے۔ اور اس اصول پر سیکڑوں صفحات میں بحث کی گئی ہے۔

ہندوستان وغیرہ میں پانی میں کھجوریں ڈالنے کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اور اب موجودہ دور میں تو ممکن ہی نہیں ہے۔ تو پھر اس ساری بحث کو یہاں کے طلبا کو یاد کرانے اور رٹانے سے کیا فائدہ؟

ہمیں زندگی کے ہر رخ پر سوچ سمجھ کر متوازن راستہ نکالنا ہے۔ ہمارا طرزِ معاشرت کسی دور میں بہت خوب تھا مگر آج وہ فرسودہ ہوگیا ہے اور اس میں وہ افادیت باقی نہیں رہی ہے جو کہ پہلے تھی۔ کیونکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ مثلاً کھانا جسم اور صحت بنانے کے بجائے لذت حاصل کرنے کے لئے کھایا جاتا ہے۔ ہم کھانا تو وہ کھاتے ہیں جو کہ ہمارے بزرگ کم از کم ۵ میل گھوڑے کی سواری کرنے کے بعد کھاتے تھے۔ وہی مرغن کھانا ہم کرسی پہ بیٹھے پلنگوں پر پڑے رہنے کے بعد کھاتے ہیں۔ نتیجہ میں صحتیں خراب ہوتی جارہی ہیں، کمزور مائیں کمزور بچوں کو جنم دے رہی ہیں۔ تنظیم کی کمی کی وجہ سے نہ ہمارے گھر منظم ہیں نہ ہماری زندگی منظم ہے۔ وقت ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے اور ہم جو کام کرنا چاہتے ہیں عموماً نہیں کر پاتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے امتِ محمدیہ کا۔ اس خاکہ میں بہت سے جملے ایسے ہیں جو کہ پوری تفصیل کے طالب ہیں۔ اور تشریح چاہتے ہیں۔ اس وقت جاپان کی ایک خوبی یاد آرہی ہے، وہ یہ کہ وہ ساری دنیا سے مختلف ماہرینِ فنون کو بلاتے ہیں اور ان کو ان کے فن سے متعلق اپنی کارکردگی دکھا کر عاجزی سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کو بتلایا جائے کہ وہ کیا کیا غلطیاں کررہے ہیں! اور پھر اپنی خامیوں کو دور کرتے ہیں۔ یہی طریقہ ہے ترقی کا۔

میں بھی انتہائی عاجزی سے چاہتی ہوں کہ اس مضمون کے آئینہ میں ہر مسلمان مرد اور عورت اپنا نیز پوری ملت کا جائزہ لے اور غلطیوں کی نشاندہی کرے تاکہ نئی راہ کا تعین کرنے سے پہلے ان سب باتوں کو بھی دھیان میں رکھا جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر ہم دنیا میں با عزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں از سرِ نو جدید معلومات سے فائدہ اٹھا کر قرآن حکیم کی روشنی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نقشہ بنانا ہوگا۔ کیونکہ اللہ پاک قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ۔

"وکذٰلک جعلناکم امۃً وسطاً لتکونوا شہداء علی النّاس ویکون الرسول علیکم شہیداً" (سورۃ بقرۃ آیت ۱۴۳)

ترجمہ: (ہم نے تم مسلمانوں کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو)

یہ بہت بڑی ذمہ داری اور سرداری اللہ پاک نے مسلمانوں پر عائد کی ہے۔ اور بروز قیامت ہمیں اللہ پاک کو جواب دینا ہوگا کہ ہم نے اس ذمہ داری کو کہاں تک نبھایا اگر ہم اللہ پاک کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے تو دنیا اور دین دونوں راہیں آسان، پر لطف اور پرسکون بن جائیں گی۔ انشاء اللہ۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

بقیہ: ترتیبِ مصحف ایک جائزہ

القرآن وحاشا ان یھمل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امر القرآن وھو نور نبوتہ وبرھان شریعتہ فلا بد اما من التصریح بمواضع الآی والسور واما من الرمز الیھم بذلک واجماع الصحابۃ فی الاٰل علی ھذا الترتیب ۔ ۔ ۔ وعثمانؓ وان لم یقف علی ما یفید لا القطع فی براءۃ والانفال دفعل ما فعل بناء علی ظنہ الا ان غیرہ وقف وقیل ما فعلہ فلم یتوقف وکم لعمر موافقات لربہ ادی الیھا ظنہ فلیکن لعثمان ھذا الموافقۃ التی ظفر غیرہ"[1]

بہر کیف ترتیب مصحف توقیفی ہو یا اجتہادی دونوں کا احترام لازم ہے اور سلف نے دونوں کے احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔ (ختم شد)

---

[1] مقدمہ روح المعانی السیّد محمود شکری الآلوسی البغدادی۔

وفیات

ماہ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں ایسی ہم عالم ہستیاں اس دار فانی سے کوچ کرگئیں جن کا غم و افسوس
ہوتا رہے گا۔ حکیم عبدالقوی دریابادی اور مولانا حامد اللہ الانصاری غازی مختصر سی علالت
انتقال فرماگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ؕ

حکیم عبدالقوی دریابادی مولانا عبدالماجد دریابادی کے بھتیجے اور داماد تھے۔ ان میں علم
بت اس قدر تھی کہ ان کی سادگی و قناعت پسندی نے اس کو چھپا رکھا تھا۔ مشرقی و مغربی
ں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ انگریزی زبان میں بے تکلف لکھا کرتے تھے اردو فارسی اور
ں تو ملکہ حاصل تھا ہی۔ کتنے ہی اردو اخبارات کے اداریئے بغیر نام کے لکھا کرتے تھے
طلب تھے ایم اے کی ڈگری اعلیٰ نمبروں سے انہوں نے حاصل کی اس کے باوجود کبھی بھی
نے اپنی قابلیت کا رعب یا سکہ جمانے کی کوشش نہیں کی۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ
کو قلبی لگاؤ تھا۔ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے جب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی یاد
لمر ملت شائع کیا گیا تو اس میں حکیم عبدالقوی دریابادی نے خصوصی طور پر اپنا مضمون اشاعت
ارسال فرمایا۔ "صدق جدید" لکھنؤ کو انھوں نے مرحوم دریابادی کے بعد جس طرح جاری رکھا
لانا عبدالماجد دریابادیؒ کی یادگار رہیگا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

مولانا حامد الانصاری غازی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ایک بلند عالم جید
اور غازی صرف نام ہی کے نہیں کام کے بھی تھے۔ سراپا عمل وجہد کی زندگی بسر کی۔ دارالعلوم
ند میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اور پھر اس کے لئے ایک مجاہد بھی ثابت ہوئے کچھ عرصہ
ل میں بھی دارالعلوم کے ساتھیوں کے ساتھ علم و عمل اور دین کی خدمت انجام دینے میں جٹے

حضرت قاری طیب صاحب کے لائق داماد تھے۔ اور قاری طیبؒ کو ان پر ناز تھا ندوۃ المصنفین
مرحوم حامد الانصاری غازی کا تعلق خاص رہا ہے۔ ادارہ کیطرف سے ان کی ایک کتاب "اسلام کا نظام حکومت"

شائع ہو کر مقبولیت کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی شخصیت سے انھیں انتہائی درجہ کی عقیدت و انسیت تھی، دہلی جب بھی آتے تو حضرت مفتی صاحبؒ سے شرف ملاقات حاصل کرنا ان کا اوّل کام ہوتا۔ بمبئی میں ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی کتابوں کا تعارف علمی حلقوں میں کراتے رہتے تھے۔

ان کے انتقال سے علمی دنیا میں ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ ان کی اولاد میں لڑکے جلیل القدر عہدوں پر فائز ہیں ایک سعودی عرب میں کسی اعلیٰ منصب پر اور ایک امریکہ میں کسی اچھے عہدہ پر فائز ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حامد الانصاری غازی کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی جوار رحمت میں اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ عنایت فرمائے آمین ثم آمین۔

حکیم الیاس کٹھوری مقیم میرٹھ پچھلے دنوں اچانک انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑے حاذق و لائق طبیب تھے۔ مزاحیہ انداز میں اپنے چاہنے والوں کو ہمیشہ خوش رکھا کرتے تھے۔ قاری محمد طیبؒ اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے خاص شیدائی و معتقد تھے۔ عالموں سے انھیں زیادہ ہی انسیت تھی خلوص کے ساتھ ہمہ وقت ان کی خدمت میں جٹے رہتے۔ نیکی و شرافت کی تصویر تھے۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے خصوصی نمبر "مفکر ملت" میں بھی حکیم الیاس صاحبؒ نے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے سلسلے میں بڑا ہی پر از معلوماتی مضمون برائے اشاعت ارسال فرمایا تھا

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی حامد الانصاری غازی، حکیم عبدالقوی دریابادی اور حکیم الیاس کٹھوری کے انتقال پر ملال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ تمام متعلقین کو ان کی وفات کے صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔

شائع ہوکر مقبولیت کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی شخصیت سے انھیں انتہائی درجہ کی عقیدت و انسیت تھی، دہلی جب بھی آتے تو حضرت مفتی صاحبؒ سے شرف ملاقات حاصل کرنا ان کا اوّل کام ہوتا۔ بمبئی میں ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی کتابوں کا تعارف علمی حلقوں میں کراتے رہتے تھے۔

ان کے انتقال سے علمی دنیا میں ایک خلار سا محسوس ہو رہا ہے۔ ان کی اولاد میں لڑکے جلیل القدر عہدوں پر فائز ہیں ایک سعودی عرب میں کسی اعلیٰ منصب پر اور ایک امریکہ میں کسی اچھے عہدہ پر فائز ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حامد الانصاری غازی کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی جوار رحمت میں اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ عنایت فرمائے آمین ثم آمین۔

حکیم الیاس کٹھوری مقیم میرٹھ پچھلے دنوں اچانک انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑے حاذق و لائق لبیب تھے، مزاحیہ انداز میں اپنے چاہنے والوں کو ہمیشہ خوش رکھا کرتے تھے۔ قاری محمد طیبؒ اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے خاص شیدائی و معتقد تھے۔ عالموں سے انھیں زیادہ ہی انسیت تھی خلوص کے ساتھ ہمہ وقت ان کی خدمت میں جٹے رہتے۔ نیکی و شرافت کی تصویر تھے۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے خصوصی نمبر "مفکر ملتؒ" میں بھی حکیم الیاس صاحبؒ نے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے سلسلے میں بڑا ہی پر از معلوماتی مضمون برائے اشاعت ارسال فرمایا تھا۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی حامد الانصاری غازی، حکیم عبدالقوی دریا بادی اور حکیم الیاس کٹھوری کے انتقال پر ملال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہے کہ تمام متعلقین کو ان کی وفات کے صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

ادارہ ندوۃ المصنفین دھلی — حکیم عبدالحمید چانسلر جامعہ ہمدرد دہلی

جلد ۱۱۳ | جنوری ۱۹۹۴ء مطابق شعبان ۱۴۱۴ھ | شمارہ ۱

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

آزادی کے بعد سال سنہ ۱۹۹۲ء میں جس قدر دہشتناک وبہیمانہ فرقہ وارانہ فسادات بابری مسجد کی مسماری کے بعد رونما ہوئے اس کے نتیجے میں ہندوستان اقتصادی لحاظ سے اسقدر پیچھے ہو گیا ہے کہ عالمی بنک کی اٹیلس کے ۲۶ دیں ایڈیشن میں ہندوستان سے متعلق یہ بات درج ہے کہ:

"ہندوستان کی فی کس آمدنی سنہ ۱۹۹۲ء میں اس سے پہلے سال کے مقابلے میں کم ہو کر صرف ۳۵۰ ڈالر سالانہ فی کس سے بھی کم ہو کر رہ گئی۔ اور اس طرح ہندوستان ان ۵۷ ملکوں کے زمرے میں آ گیا جن کی آمدنی مذکورہ حد سے کم ہے۔ اور ہندوستان کی فی کس مجموعی قومی پیداوار سنہ ۱۹۹۲ء میں ۳۱۰ ڈالر تھی۔ جبکہ سنہ ۱۹۹۱ء میں یہ آمدنی ۲۳۰ ڈالر تھی"۔

اندرون ملک مہنگائی کی بہتات ہے جس کی چھوٹی سی مثال ہر انسان کی پہلی ضرورت چھوٹی سی چیز پیاز کی بے پناہ بڑھتی قیمت ہے۔ جنوری سنہ ۹۳ء میں جس پیاز کی قیمت ۳ روپے کیلو تھی وہ ہی اکتوبر، نومبر، دسمبر سنہ ۹۳ء میں ۱۲-۱۴ روپے کیلو تک پہنچ گئی یعنی ۴۰۰ فیصدی تک اضافہ اشیائے خورد ونوش سے لیکر دوا تک ہر چیز کی قیمت آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گئی — اس کمر توڑ مہنگائی کی مار سے غریب انسان غربت وافلاس کی دہلیز پر پڑا ہوا سسک رہا ہے۔ کیونکہ اسے عیش وآرام تو دور صرف اور صرف پیٹ بھرنے کے لئے دو وقت کی روٹی ہی میسر ہو جائے تو یہ لاکھ درجہ غنیمت بات ہوگی — کبھی ہماری سیاسی جماعتوں نے اسطرف توجہ نہیں دی کہ غریب کو روٹی کپڑا مکان کس طرح مہیا کرایا جا سکتا ہے اکثر سیاسی جماعتوں کے رہنما تو بس، کسی طرح داؤں وپیچ لگا کر اقتدار کی کرسی پر براجمان ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی بلا سے غریب انسان اپنی زندگی کس طرح گذار رہا ہے وہ اس طرف دھیان دیکر کیوں اپنے لئے جو کھم بھرا کام کا بوجھ اپنے سر پر ڈھوئے۔ جب سیاسی

جماعتوں کے رہنماؤں کا یہ نظریہ ہوگا تو ہم یہ کیسے باور کریں کہ عام انسان کا معیار زندگی بلند ہوگا اور وہ اس بیسویں صدی کے ترقی یافتہ دور میں خوشحال انسانوں کی طرح برابری کے ساتھ رہ سکیں گے؟

ایک طرف تو یہ حال ہے کہ عام انسان غریب سے غریب تر ہو رہا ہے اور دوسری طرف ملک میں کروڑوں اربوں روپے کے تمسکات کے لین دین میں جو گھپلا ہوا ہے وہ بھی ہمارے غریب ملک کی آزادی کے بعد محیر العقول مثال ہے۔ ہمارے ملک کی غریب آبادی کی غربت وافلاس کی طرح طرح کی کہانیاں و داستانیں غیر ممالک کے اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی ہیں جس سے ہمارے ملک کے عوام کی تصویر غیر ممالک کے لوگوں کے دل و دماغ میں کیسی حقیر منعکس ہوگی جس کا خیال ہی باعث شرم ہے اور جب ان کے سامنے ان تمسکات کے لین دین میں کروڑوں اربوں روپے کے گھپلوں کی خبریں پہنچی ہوں گی تو انہوں نے ہمارے بارے میں کیا کیا خیال دل و دماغ میں پیدا کیا ہوگا اس کا ہلکا سا اندازہ کر کے ہر غیرت مند ہندوستانی کا سر شرم سے نیچا ہونا قدرتی بات ہے۔

پورے عالم میں ۱۹۹۲ء کا سال ہندوستان کے لئے نیک نامی کا قطعاً نہیں رہا اس لئے کہ فرقہ پرست عناصر نے لاکھوں سادہ لوح عوام کو بہکا کر اور گمراہ کر کے ایودھیا میں اکٹھا کیا اور دنیا بھر کے ٹی۔ وی۔ کیمرہ۔ فیکس، ریڈیو، نیوز ایجنسیوں و اخبارات کے نمائندوں کی موجودگی میں ایک عبادت گاہ بابری مسجد کو جس طرح چشم زدن میں زمین دوز کیا اس پر تمام دنیا کے لوگ آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے اور ایک اقلیتی فرقہ کی عبادت گاہ کو اس طرح زمین دوز کرنے کے اقدام کو انتہائی نفرت و حقارت سے دیکھنے پر مجبور ہوئے ـــــ مقام شکر ہے سال ۱۹۹۳ء میں ہندوستانی عوام نے فرقہ پرست عناصر کے خلاف اسمبلی چناؤں میں اپنے حق رائے دہندگی (ووٹ) کا استعمال کر کے دنیا کے سامنے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ ہندوستان کے عوام کی اکثریت ان قابل نفرت اقدامات اور کسی مذہب کی عبادت گاہ کی مسماری کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی ہے، اور وہ ان غلط حرکات کے خلاف اپنا فیصلہ دینا اپنے ملک اور مذہب کی روایات کے عین مطابق سمجھتی ہے۔ اس لحاظ سے سال ۱۹۹۳ء ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لئے بہتر ہی رہا گو ۱۹۹۲ء کے آخری دنوں کے بابری مسجد کی مسماری کے عوض میں نامساعد حالات سے ۱۹۹۳ء میں بھی سابقہ پڑا۔ بقول وزیر اعلیٰ بہار جناب لالو پرشاد "یہ ۔۔۔۔ والے بھی کس قدر دشمنِ ملک نکلے کہ نہ بابری مسجد توڑتے اور نہ ہی ہمیں مہاراشٹر کے لاتور و عثمان آباد میں زلزلے کی

صورت میں قدرتی عذاب کا منہ دیکھنا پڑتا ہے" اس بھیانک زلزلے میں سرکاری اعداد و شمار ہی کے بموجب نو ہزار سے زائد افراد کے ہلاک ہونے کی بات ہے اور مالی نقصانات کا تو بس اندازہ ہی اندازہ ہے انسانی بس میں صحیح اندازہ کا احاطہ کہاں ہو پایا ہے؟۔

سال ۱۹۹۳ء مظلوم فلسطینیوں کے لئے اگر اچھا نہیں ہے تو برا بھی نہیں رہا ہے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء کو امریکی صدر مسٹر بل کلنٹن کی موجودگی میں امریکی ایوان صدر (دہائٹ ہاؤس) واشنگٹن میں اسرائیلی وزیراعظم مسٹر اسحاق رابن اور پی۔ایل او کے سربراہ مرد آہن جناب یاسر عرفات نے امن معاہدے پر دستخط کیے جس کے نتیجے میں ٹوٹا پھوٹا ہی سہی ایک فلسطینی ملک، دنیا کے نقشہ پر دیر سویر میں دیکھنے کی امید تو دکھائی دی ــــ پچاس سال کی فلسطینیوں کی خونی جدوجہد بالآخر کسی نہ کسی صورت میں ہلکی یا بھاری، کامیابی سے ہمکنار تو ہو کر رہی۔

ماہ جولائی میں پاکستان کے وزیراعظم جناب نواز شریف نے استعفیٰ دیدیا۔ اور پارلیمنٹ کو توڑ دیا اس کے بعد اکتوبر میں پاکستان کی پارلیمنٹ کے انتخابات میں مذہبی جماعتوں کے امیدواروں کو سخت سے سخت بلکہ عبرتناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور خاتون رہنما بے نظیر بھٹو ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دوبارہ وزیراعظم منتخب ہو گئیں۔ یہ پاکستان سے متعلق دنیا نے چونکا دینے والا منظر دیکھا مگر پاکستان کے لاابالی قسم کے مذہبی رہنماؤں نے کیا سبق لیا اس کے بارے میں ہنوز ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے ــــ ۱۹۹۳ء میں ایک اور سب سے بڑی بات ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ برسہا برس سے چلی آ رہی سیاہ فام لوگوں کی جنوبی افریقہ میں گوری سرکار جو اقلیت میں ہے کے خلاف جدوجہد کے نتیجہ میں ۲۲ دسمبر ۱۹۹۳ء کو جنوبی افریقہ کی سفید فام پارلیمنٹ نے ایک آئین منظور کر کے سیاہ فام کو مساوی درجہ دیدیا ہے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۹۳ء کو جنوبی افریقہ کے لیڈروں نے ملک میں نسلی امتیاز ختم کرنے کے لئے نئے آئین کی جو توثیق کی تھی اس کے نتیجہ میں اب جنوبی افریقہ کی گوری آبادی جو اقلیت میں ہے نے بیسویں صدی کی ضرورت اور صورتحال کے پیش نظر بغیر خون خرابے کے، جو تبدیلیاں کی ہیں اسے ہم جنوبی افریقہ کی گوری آبادی کے لیڈروں کی دوراندیشی و تدبر ہی پر محمول کئے بغیر نہ رہیں گے یعنی ۳۴۱ سال تک گورے شاہی کو وہاں جو فوقیت تھی وہ اب ۲۷ اپریل ۱۹۹۴ء کو عام انتخابات کے بعد بالکل ختم ہو جائے گی اور نسلی امتیاز کی جگہ گورے و سیاہ فام

کے درمیان میں مساوات کا دور شروع ہو جائے گا۔ صحیح قیادت وہ ہی ہے جو حال اور مستقبل کے حالات سے پوری طرح خبردار ہو۔ کاش! ایسی ہی دور اندیشی اور تدبر و فکر ہندوستان بلکہ صحیح معنوں میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ عالم اسلام کی قیادت کو نصیب ہو جائے۔

۱۹۹۳ء کا سال عالم اسلام کے تعلق سے اچھا نہیں کہا جا سکتا ہے۔ افغانستان میں سوویت روس روس کے خلاف وہاں کے مجاہدین نے جو جدوجہد کی اور جس کی وجہ سے دنیا کی دوسری بڑی طاقت بلکہ بعض لحاظ سے پہلی طاقت سوویت روس پاش پاش ہو کر رہ گئی افسوس یہ ہے کہ اتنی زبردست کامیابی کے بعد افغانستان کے مجاہدین جسطرح آپس میں ہی اقتدار کے حصول کے لئے برسرپیکار رہیں اسے دیکھ کر دل و دماغ کو سخت تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ ۲ فروری ۱۹۹۳ء کو مجاہدین کے باغی گروپ نے افغانستان کی راجدھانی کابل کا محاصرہ کر کے اس پر بموں کی بارش کی جس کی وجہ سے ۲۰ بے گناہ افراد ہلاک ہو گئے۔ افغانستان میں مجاہدین کے آنیکے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ۱۴ سال سے جو افغانستان میں تباہی و بربادی کا دور چلا تھا اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کی تباہی و بربادی ہو رہی تھی اس کے سدباب کی کوششیں کی جاتیں، لوگوں کی اجیرن زندگی میں خوشیوں و مسرتوں کی بہار پیدا کی جاتی اور افغانستان کی تباہی و بربادی کو تعمیر و ترقی میں تبدیل کرنے کے منصوبے بروئے کار لائے جاتے برعکس اس کے صرف اور صرف اقتدار کی رسہ کشی ہی جاری ہو گئی۔

صومالیہ میں مسلمان روٹی روٹی سے محتاج ہیں۔ بوسنیائی سربوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ پہ پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ ادھر اسرائیل باوجود پی ایل او سے امن معاہدے کے فلسطینیوں پر ظلم و جبر کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے عراق پر سے ابھی تک امریکہ کی منشا و ایما پر اقوام متحدہ کی طرف سے لگائی گئی اقتصادی پابندیوں کا خاتمہ نہیں ہوا ہے جبکہ عراق کو ہر طرح سے پریشان و ذلیل و خوار اور ایٹمی ہتھیاروں کی کھوج بین کی آڑ میں اس کی خودداری اور اس کی سالمیت تک کو مجروح کیا جا رہا ہے اس کے باوجود اس کے لئے انسانیت و رحم کے تمام دوش بالائے طاق رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور ابھرتا ہوا مسلم ملک لیبیا کو اقتصادی ناکے بندیوں کے جال میں جکڑنے کی پلاننگ کی جا رہی ہے۔ اسی ضمن میں یہ خبر بھی پڑھ لی جائے تو بہتر ہوگی اور شاید اس میں مسلم رہنماؤں کو مستقبل میں اپنی تدبیر کے لئے کچھ سامان و مسالہ دستیاب ہو جائے۔

عیسائیوں اور یہودیوں کی دو ہزار سالہ رقابت ۱۹۹۳ء میں ختم ہوگئی ہے اور دسمبر ۱۹۹۳ء میں عیسائیوں کے سب سے بڑے مذہبی رہنما پوپ پال دوم نے اسرائیل کے ساتھ ویٹیکن کے سفارتی تعلقات و دوستی میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا باب شروع کیا ہے۔ کیا اس کے بعد عیسائیت اور یہودیت دونوں مل کر اسلام کے خلاف متحد عمل ہوں گے؟ اس کا اندازہ و احساس عالم اسلام کے رہنماؤں کو اگر ہوگیا ہے تو سبحان اللہ! اور اگر خدانخواستہ وہ عیسائیت اور یہودیت کے میل جول سے آنے والے وقت میں جو اسلام کے خلاف منصوبے رو بہ عمل میں لائے جائیں گے اس سے بے باخبر نہیں تو ہم صرف یہاں اس موقع پر انا للہ و انا الیہ راجعون، پڑھنے کے اور کیا کر سکتے ہیں!

کیا عالم اسلام کی قیادت اب بھی سوئے رہے گی؟ اور کیا عالم اسلام میں کوئی ایسا رہنما یا قائد پیدا ہوگا جو اس سب صورتحال کی موجودگی میں کوئی مثبت لائحہ عمل مرتب کرے تاکہ عالم اسلام کو راحت نصیب ہو اور اس کے آنسو پونچھ سکیں۔

دعا ہے خداوند تعالیٰ سے کہ سال ۱۹۹۴ء بنی نوع انسانی کے لئے بہتری کا باعث ہو!

دیارِ اعظم گڈھ کے چند غیر معروف مشائخ

از:- قاضی اطہر مبارکپوری

آٹھویں صدی میں جونپور کی تاسیس سنہ ۷۷۲ھ کے بعد خصوصاً شرقی سلطنت کے قیام کے بعد دیار پورب کا قریہ قریہ علماء و مشائخ اور ارباب علم و فضل کا مسکن بن گیا جس میں موجودہ ضلع اعظم گڈھ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس سرزمین سے بہت سے ایسے علماء و مشائخ اٹھے اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے جنکے نام و نشان کا پتہ نہیں ہے، اور تذکرہ و تراجم کی نادر و نایاب کتابوں میں کہیں کہیں ان کا ذکر ملتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ تلاش بسیار کے بعد ان غیر معروف مشائخ میں چند حضرات کے نام اور مختصر حالات مل سکے ہیں جنکو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔
ان بے ترتیب اور منتشر تذکروں سے کچھ نہ کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت شیخ یوسف حسن چڑیاکوٹی سنہ ۸۲۲ھ

آپ علاقہ چڑیاکوٹ کے فاتح، اس کے بانی اور وہاں کے عباسی خانوادہ کے مورث اور جدِ اعلیٰ ہیں، ان کا تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی نے بحر زخار میں اور خزینۃ الاصفیاء کے مصنف نے کیا ہے۔ نیز ایک قلمی کتاب جو چڑیاکوٹ کے کسی عالم کی تصنیف ہے اور فارسی زبان میں ہے، اس کے اوراق مجھے مل گئے تھے اور میں نے ان کو نقل کر لیا تھا، اس میں شیخ یوسف حسن چڑیاکوٹ میں۔ جنگ اور اس کی تاسیس کا ذکر ہے، ان ہی مراجع سے ان کا تذکرہ مرتب کیا جا رہا ہے، تینوں کتابوں میں ان کا مختصر تذکرہ ہے مگر نواحی چڑیاکوٹ کی جنگ و فتح وغیرہ کی تفصیل دوسری جگہ نہیں ملتی ہے اس لئے انکے ذکر خیر سے اس موضوع کی ابتدار کی جاتی ہے۔ شیخ یوسف حسن کی دینی و روحانی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ حضرت شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلیؒ کے بھانجے حضرت شیخ نظام الدین

اولیاؒ کے عزیز ترین مرید اور دو واسطہ سے حضرت شیخ عبداللہ شطاریؒ کے فیض یافتہ ہیں۔ بحر زخار میں انکا تذکرہ ان القاب سے شروع ہوتا ہے "آں شجر بربار نظامی، وآں آب یافتہ انہار جامی وآں واقف اسرار القاسی، یوسف حسن عباسی چریاکوٹی، فرزند اعز الدین، و خواہر زادہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلوی است"۔ حضرت شیخ نظام الدین کے محبوب ترین مریدوں میں سے تھے، شیخ نظام الدین ان پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے، ان کے علم وفہم کیوجہ سے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، ان کی رائے صوفیہ کے بارے میں اس قدر صائب تھی کہ کوئی بات ان کی روش اور قاعدہ کے خلاف نہیں کہتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کرنا چاہیئے کہ ایک مرتبہ شیخ نظام الدین اولیاء نزہتہ الارواح کا درس دے رہے تھے، اور ہر شخص کی عقل واستعداد کے مطابق مطلب بیان کرتے تھے، شیخ یوسف حسن نے ایک مقام کی ایسی تشریح کی کہ شیخ نظام الدین نے خوش ہوکر اپنا یہ دوہا سنایا۔

سات پانچ رل نرہا بانچین بول کہیس قیاسی
ان سبھن میں سانچا پانچے یوسف حسن عباسی

ان کی وفات ۱۵ رجب ۸۲۲ھ میں ہوئی۔ (بحر زخار قلمی)

شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں کہ شیخ یوسف چریاکوٹی مشرب شطاریہ کے درویش تھے۔ ان کا حلقۂ ذکر عجیب ہوتا تھا، حلقہ کے درمیان عاشقانہ اشعار پڑھتے تھے، اور وجد میں آتے تھے، تصوف و روحانیت میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، دو واسطہ سے شیخ عبداللہ شطار سے نسبت رکھتے تھے۔ میرے والد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے انکو ذکر کی تلقین کی اس وقت ان کی اولاد دوآبہ کے بعض قصبات میں موجود ہے۔ (اخبار الاخیار ص۲۳۶)

خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ شیخ یوسف حسن عباسی چریاکوٹی شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے اور عمر میں ان سے بڑے تھے، یہ دو بھائی تھے، دوسرے کا نام شیخ کمال الدین حامد تھا۔ شیخ نصیر الدین کبھی کبھی اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیا سے اجازت لیکر اپنی ہمشیرہ محترمہ کی ملاقات کے لئے آیا کرتے تھے۔ (خزینۃ الاصفیاء)

چریاکوٹی عالم نے بیان کیا ہے کہ شیخ کمال الدین حامد کا مزار اور خانقاہ حاجی سوکا پور

میں ہے۔ اور شیخ یوسف حسن شیخ اسماعیل کے نام سے مشہور ہیں جن کا مزار موضع رسول پور پرگنہ چریاکوٹ میں ہے۔

سلطان محمد بن تغلق کے دور سلطنت میں شیخ یوسف حسن کو جاگیر عطا ہوئی، اس کے بعد انھوں نے ایک زبردست لشکر لے کر علاقہ چریاکوٹ پر حملہ کیا، یہاں چریا (چیرو) قوم کی بہت بڑی آبادی تھی، او ۔ کا ایک مستحکم قلعہ تھا، یہ قوم سرکش اور ظالم تھی لوٹ مار اس کا پیشہ تھا اس کو زیر کرنے کے لئے یہ کارروائی ہوئی، اس قوم سے سلطانی لشکر کا سخت مقابلہ ہوا، باوجودیکہ چریا قوم بندوقوں سے جنگ کر رہی تھی سلطانی لشکر قلعہ کے دروازے تک پہونچ گیا مگر مقامی جنگ بازوں نے دروازہ بند کرا دیا، اس کے بعد سواروں کا ایک دستہ آیا جس نے قلعہ کو فتح کیا اور مقامی لوگوں نے اطاعت قبول کی۔ اس کے بعد شیخ یوسف حسن نے اس علاقہ میں امن وامان قائم کیا اور چریا قوم کے سرداران کے مطیع و معتقد ہو گئے، البتہ انھوں نے گذارش کی کہ ان کا نام باقی رکھا جائے۔ شیخ یوسف حسن نے ان کی خواہش پر اس بستی کا نام یوسف آباد عرف چریاکوٹ (چریا قوم کا قلعہ) رکھا، اس کے بعد اس پورے علاقہ میں اسلام اور مسلمانوں کو شان و شوکت حاصل ہوئی۔

مولوی نجم الدین چریاکوٹی نے یوسف آباد چریاکوٹ کے بارے میں کہا ہے۔

چریاکوٹ تو انند شش عوامش ولیکن یوسف آباد ست نامش

فلک تا طرح این آباد بنہاد زخاک پاک جنت کرد بنیاد

چراغ آسماں روشن زدودش زجنت می رسد ہر دم درودش

(تذکرہ علمائے ہند ص۲۳۶) اعظم گڈھ گزیٹیر میں بھی چریاکوٹ کا اصل نام یوسف آباد بتایا گیا ہے۔

حضرت شیخ مبارک چشتی قدس سرہٗ

مولوی سید امام الدین نقوی گلشن آباد برکات الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ آپ مشاہیر اولیاء کاملین متصرفین سے ہیں، عدن کے رہنے والے تھے، چشتیہ کی نعمت و خلافت رکھتے ہیں سنہ ۹۰۰ھ میں ہندوستان آئے، اور سکندر پور ضلع اعظم گڈھ میں سکونت اختیار کی جب